# عہد سرسید میں اردو سوانح نگاری

مقالہ برائے

پی۔ایچ۔ڈی (اردو)


شبیر احمد ڈار

ریسرچ اسکالر


نگران


پروفیسر۔ایس۔مسعود سراج

سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس وصدر شعبۂ اردو

شعبئہ اردو یونیورسٹی آف میسور

میسورو


۲۰۱۸

# فہرست ابواب



❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

پیش لفظ

عہد سر سید مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔اسی عہد میں مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہوا اور ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی ایک نئ صورت حال سے دوچار ہوئے۔خاص طور سے مسلمانوں کے لیے یہ پرُ آشوب دور تھا۔حکومت چھن چکی تھی۔قدیم نظام پارہ پارہ ہو چکا تھا اور نئے دور کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔اس دور میں سر سید نے مسلمانوں کی فکری رہنمائی کا منصب قبول کیا۔انھوں نے مسلمانوں کو نئے عہد کے تقاضوں سے باخبر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔سر سید کی ان ہی کوششوں کو ہم علی گڑھ تحریک یا سر سید تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔یہ کثیر المقاصد تحریک تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔بنیادی طور پر یہ ایک اصلاحی تحریک تھی۔لیکن اس تحریک نے اردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔اس عہد میں موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا۔سر سید نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہمیں نئے نئے موضوعات اور مضامین پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ اس دور میں ادبی موضوعات پر مستقل تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ان میں سے ایک سوانح نگاری بھی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں سوانح نگاری کی اہمیت مسلم ہے۔اب تک بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں۔جو ہر اعتبار سے قدر و قیمت کی حامل ہیں۔سوانح، تاریخ سے بھی کہیں زیادہ وقیع چیز ہے۔سوانح کا موضوع کوئی ایسی شخصیت ہوتی ہے جس نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں اپنے کارناموں سے ایک منفرد مقام بنالیا ہو۔وہ شخصیت ادبی اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے، سیاسی و سماجی اعتبار سے بھی، وہ شخصیت ہم عصر بھی ہو سکتی ہے اور زمانہ ماقبل کی بھی۔

سوانح عمری کو تاریخ کی ایک ایسی شکل کہا گیا ہے جس کا تعلق افراد کی حیات سے ہوتا ہے۔ یہ کسی فرد کی مہد سے لے کر لحد تک کے اہم واقعات کی ایک جامع اور معتبر دستاویز ہوتی ہے۔ یہ بطور ایک ادبی صنف افراد کے زندگی کی تاریخ ہے۔ یہ غیر افسانوی ادب کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع کسی فرد کی زندگی ہے۔ اسے تاریخ کی ایک شاخ کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ فرد کی زندگی کے حقیقی واقعات کا احاطہ کرے۔ واقعات کی ترتیب تاریخی اعتبار سے ہو۔ اس میں ادبی چاشنی ہو۔ سوانح کا ایک سرا تاریخ اور واقعہ نگاری سے ملتا ہے، تو دوسرا افسانوی ادب سے۔ سوانح نگاری ایک ایسا مرقع ہے جہاں ہمیں کسی فرد کی زندگی کے نشیب وفراز، اس کا ماحول، مختلف واقعات اور شخصیت کا تدریجی ارتقاء نظر آتا ہے۔

ایڈمنڈ گوس کے نزدیک ''سوانح عمری انسان کے مہمات حیات کا ہو بہو خاکہ ہے۔''

ڈرائڈن کا کہنا ہے کہ ''سوانح نگاری دراصل مخصوص افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے'' جبکہ جانسن کا خیال ہے کہ ''سوانح عمری مختلف قسم کی ایسی بیانیہ تحریر ہے جسے بڑی رضامندی کے ساتھ پڑھا جائے اور بڑی آسانی سے زندگی کے مقاصد تک جس کی رسائی ہو۔''

ایمرسن کا خیال ہے کہ ''جب کوئی عظیم تر انسان کی زندگی کی تشریح کرتا ہے تو سوانح عمری وجود میں آتی ہے۔''

بہر کیف اپنے اسلاف کے کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین ذریعہ سوانح نگاری ہے کیونکہ سوانح میں صاحب سوانح کی پوری زندگی کے پیچ وخم کو بغیر کسی مبالغے کے غیر جانبداری اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جن سوانحی تصانیف میں ان چیزوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہی قابل اعتبار اور دانش وروں کی نظر میں قابل اعتناء ٹھہریں۔ سوانح میں عام طور پر کسی مشہور ومعروف ہستی کے حالات زندگی اور اس کے کارناموں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ سوانح نگار کا موضوع کوئی خیالی پیکر نہیں بلکہ حقیقی شخصیت ہوتی ہے جس کی زندگی کے خدوخال حقیقی حالات سے مرتب ہوتے ہیں۔

سوانح نگاری میں موضوع کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ سوانح نگار کو موضوع کے انتخاب کے وقت بہت ہی باریک بینی، دیانت داری اور غیر جانب داری کے ساتھ اپنے ہیرو کی خوبیوں اور خامیوں کو قلم بند کرتا ہے۔

اسے ایسے ہی واقعات کو پیش کرنا چاہیے جن سے ہیرو کی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آ سکے۔

اردو میں سوانح نگاری کا با قاعدہ آغاز عہد سر سید سے ہوتا ہے۔مولانا حالی سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ عہد سرسید میں لکھی گئی سوانح عمریاں فنی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔اس عہد میں سوانح کا ایک وقیع سرمایا اکٹھا ہو گیا تھا۔جس کا تحقیقی ،تنقیدی اور تقابلی حوالے سے جائزہ لینا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔یوں تو اردو میں سوانح نگاری کے فن اور اہم سوانح نگاروں پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ڈاکٹر سید شاہ علی،سلام سندیلوی۔الطاف فاطمہ،ممتاز فاخرہ،ڈاکٹر نیر جہاں، ملک راشد فیصل اور ڈاکٹر عمر رضا وغیرہ نے سوانح نگاری پر جو کام کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے،تاہم ان تصانیف کے مطالعے کے دوران اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ عہد سرسید میں لکھی گئی سوانحی تصانیف کا جس پیمانے پر تعارف ہونا چاہیے تھا تا حال نہیں ہوا،اس عہد کی سوانح عمریوں کے بہت سے گوشے اُجاگر ہونے سے رہ گئے ہیں،اسی احساس نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے پر مجبور کیا اور میرے مقالے کا عنوان **''عہد سرسید میں اردو سوانح نگاری''** ہے۔یہ مقالہ درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب **''سوانح نگاری کے فن''** سے متعلق ہے۔جس میں سوانح نگاری کی تعریف،معانی،مفہوم اور خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے۔اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سوانح نگاری کسے کہتے ہیں۔ اچھی سوانح نگاری کی کیا شرائط ہیں۔سوانح عمری کا ہیرو کیسا ہو۔مواد کے حصول کے لیے کن کن ذرائع کا استعمال کیا جائے۔سوانح کا مصنف کس طرح اپنی ذمہ داریوں کو بہ خوبی انجام دے اور اس کو انجام دیتے وقت کس طرح کے اصولوں کو اختیار کرے۔وہ ہیرو کی زندگی کے حالات و واقعات کو قاری کے سامنے کس طرح پیش کرے،اور اسے پیش کرنے سے قبل اس کی چھان بین کیسے کرے وغیرہ۔اس کے علاوہ اس باب میں سوانح اور تذکرہ،سوانح اور خود نوشت،سوانح اور خاکہ اور سوانح اور تاریخ کی مختصر تعریف کے ساتھ ان کے فرق و امتیازات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں **''اردو میں سوانح نگاری کی روایت''** کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز اردو سوانح نگاری کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اردو میں سوانح نگاری کا آغاز کب اور کس طرح ہوا،اور کس طرح اس فن کی کونپلوں نے پھلنا اور پھولنا شروع کیا اور پھر اس فن نے کن قلم کاروں کے ذریعہ ایک تناور اور سایہ دار درخت

کی شکل اختیار کر لی۔اس باب میں دنیا کے دوسری زبانوں میں سوانح نگاری کے جو ابتدائی نقوش ملتے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہودیوں، یونانیوں اور دنیا کی قدیم کتابوں میں اس فن کا جو سراغ ملتا ہے ان کو بھی پیش کیا ہے، اس کے بعد یہ صنف کس طرح عربی اور فارسی ادب سے ہوتے ہوئے اردو ادب میں داخل ہوئی۔ سوانح نگاری کے ابتدائی نقوش جو دوسری اصناف میں ملتے ہیں جیسے مرثیہ، مثنوی اور تذکرہ وغیرہ اس پر بھی بحث کی گئی ہے جس میں سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے موجود ہیں مگر اسے با قاعدہ ایک صنف کی حیثیت سے سب سے پہلے مولانا حالی نے استعمال کیا اور اس کے بعد شبلی نے اس صنف پر طبع آزمائی کی مولانا حالی اور شبلی کے بعد دیگر سوانح نگاروں نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا جن میں مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار عالم، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، سید سلیمان ندوی، اسلم جیراج پوری، فوق بلگرامی، عبدالسلام ندوی، مولوی اکرام اللہ ندوی، رئیس احمد جعفری، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، قاضی عبدالغفار اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ قابل ذکر ہیں مندرجہ بالا حضرات نے بھی سوانح نگاری میں اہم کردار ادا کیا، جن کا تذکرہ سوانح نگاری کی روایت میں آنا ضروری ہے اسی باعث سوانح نگاری کی روایت کے تحت ان سوانح نگاروں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ''**حالی کی سوانح نگاری**'' کا محاکمہ کیا گیا ہے۔اس باب کے تحت حالی کی تینوں سوانح عمریوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ حالی اردو میں سوانح نگاری کے بانی ہیں اور انھوں نے نہ صرف اس فن کی بنیاد رکھی بلکہ اردو سوانح نگاروں میں ان کا قد سب سے اونچا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے سوانح نگاری کو نہ صرف ایک خاص صنف کے طور پر اپنایا بلکہ جدید نقوش بھی تیار کئے اور جتنے بہتر انداز میں حالی نے اس صنف کو برتا اس سے بہتر انداز میں ابھی تک کسی نے بھی نہیں برتا۔ حالی نے جب اس پر خار وادی میں قدم رکھا تو اس وقت ان کے سامنے فن سوانح نگاری کے اصول وقوانین واضح نہیں تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیت اور کوششوں سے اردو میں سوانح نگاری کی با قاعدہ بنیاد ڈالی اور اس صنف ادب کی تنگ دامنی کو پوری طرح محسوس کیا اور سب سے پہلے ''حیات سعدی'' تصنیف کی۔ حیات سعدی میں حالی نے فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی کے حالات قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب میں ان کے مرتبہ کو بھی اجاگر کیا۔ انہوں نے حیات سعدی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یادگار غالب اور حیات جاوید لکھ کر اس صنف کو پورا

کرنے کی کوشش کی ۔ یادگار غالب میں حالی نے اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے حالات پیش کیے ہیں۔ انہوں نے ان کی شاعری کی افہام وتفہیم کا بھی حق ادا کیا ہےاور تیسری سوانحی تصنیف ''حیات جاوید'' ہے جس میں حالی نے اپنے زمانے کی عہد ساز شخصیت سر سید احمد خان کے حالات پیش کئے ہیں ۔ یہ ایک اہم سوانحی تصنیف ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں ''**شبلی کی سوانح نگاری**'' کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی کے پیش نظر شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات متعین کی گئی ہیں۔ اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ شبلی کی ان سوانحی تصانیف سے ''ہیروز آف اسلام'' کی حیات وخدمات پر لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔اس باب کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ شبلی نے جب ناموران اسلام سے متعلق لکھنا شروع کیا تو دو مقاصد ان کے پیش نظر تھے۔ایک یہ کہ غدر کے بعد مسلمان جو سیاسی اور اقتصادی طور پر پوری طرح برباد ہو چکے ہیں انھیں ان کے اسلاف کے کارناموں کو پیش کر کے احساس کمتری سے باہر نکالا جائے۔دوسرا مقصد اردو زبان وادب کے سرمایے میں اضافہ کیا جائے۔اس باب میں شبلی کے اسلوب پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پانچواں باب ''**سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری**'' ہے۔اس باب میں سید سلیمان ندوی کی تمام سوانحی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس میں ان کی جملہ تصانیف زیر بحث آئی ہیں، نیز سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری پر شبلی نعمانی کی سوانح نگاری کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔کیوں کہ علماء کا قول ہے کہ سید صاحب کی سوانح نگاری میں شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات موجود ہیں۔

چھٹا باب ''عہد سر سید کے دیگر سوانح نگار اور ان کی سوانح عمریاں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں عہد سر سید کے دیگر سوانح نگار مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار عالم، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، عبدالسلام ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح عمریوں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔اس دور کی تصانیف مثلا حیاتِ طیبہ، حیاتِ فردوسی، سیرتِ محمدیہ (مرزا حیرت دہلوی) البرامکہ (عبدالرزاق کانپوری) حیات النذیر (افتخار عالم) رحمتہ للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصور پوری) سیرت عمر بن عبدالعزیز، اقبال کامل (عبدالسلام ندوی) النبی الخاتم، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی،

سوانح قاسمی، سوانح ابوذر غفاری اور سوانح حضرت اویس قرنی (مولانا مناظر احسن گیلانی) وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اسکے بعد ''ماحصل'' کے عنوان سے مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور حالی اور شبلی اور ان کے معاصرین کے بعد کی سوانح عمریوں کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

آخر میں کتابیات کے تحت بنیادی اور ثانوی ماخذ کے طور پر استعمال شدہ تمام کتب کو شامل کیا گیا ہے۔

مقالہ لکھنا ایک آرزو ایک تمنا جو دل کے نہاں خانوں میں اس وقت سے پنپ رہی تھی، جب میں ایم۔اے کا طالب علم تھا۔اس خواہش کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے میں ذات باری کا نہایت شکر گزار ہوں۔

تحقیقی مقالے کی تکمیل ایک ریسرچ اسکالر کی زندگی کا اہم ترین لمحہ ہوتا ہے، اس خوشی کے موقع پر اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ مقالے کی تکمیل میں تعاون اور نیک خواہشات ظاہر کرنے والوں کے حق میں شکریہ کا خوشگوار فریضہ انجام دے۔

میں سب سے پہلے اس منعمِ حقیقی کا شکریہ بجالاتا ہے، اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں کہ جس نے قلم کے ذریعہ انسان کو علم سکھلایا۔جس کی رحمت کی بدولت مجھے یہ توفیق ہوئی کہ میں قلم اٹھا سکوں ۔اس پروردگار کی نظر کرم کے بغیر ایک پتہ جنبش نہیں کرسکتا۔وہ خالق حقیقی مجھ پر مہربان ہوا تو میں اپنی اس آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل ہوا۔ یہ ایک مشکل سفر تھا اور مقالے کو تحریر کرنے میں جو پریشانیاں اور کٹھنائیاں تھیں وہ سب باری تعالیٰ نے دور کردیں۔

میں ممنوں ہوں اپنے مہربان اور شفیق استاد جناب پروفیسر ایس۔مسعود سراج صاحب کا جن کی تسلی وتشفی کے بغیر میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتا تھا، انہوں نے ہر مرحلے پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ میں ہر بار نئے مسائل لے کر ان کے پاس جاتا اور وہ ہمیشہ کی طرح دھیمے انداز میں مسکرا کر میری مشکلات کو سنتے اور مجھے ہمت دیتے۔ان کے مشاہدے، تجربے اور گہرے شعور نے ہر مرحلے پر میری مشکلات کا حل نکالا۔ یہ ان کی محبت وشفقت ہے کہ میرا مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا میں تہہ دل سے ان کا مشکور ہوں۔خدا انہیں ہمیشہ ایسا ہی

مسکراتا رکھے۔

اس مقالے کی تکمیل کے دوران پروفیسر رفعت النساء بیگم صاحبہ، پروفیسر سید اعظم صاحب، ڈاکٹر محمد ضیاء اللہ صاحب، ڈاکٹر شیخ بلال احمد صاحب اور ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب نے وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کی۔ میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس موقع پر مجھے سب سے زیادہ اپنے بیمار والدہ اور والد یاد آتے ہیں۔ جنہوں نے میرے اندر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذوق کے ساتھ ساتھ اتنا وقت اور آزادی دی کہ آج میں تعلیمی سفر کے اس خوبصورت موڑ پر پہنچ سکا۔ جن کی قربانیوں کی وجہ سے آج تعلیم کا یہ مرحلہ اپنی انتہا کو پہنچا۔ بارگاہِ خداوندی سے دعا ہے کہ انہیں عافیت کے ساتھ دین و دنیا کی سعادتیں مرحمت فرمائیں۔ ساتھ ہی اس بات کا خواہاں ہوں کہ ان کا سایہ عاطفت تا دیر میرے اور میرے اہل خانہ کے سروں پر قائم رہے۔

میرے بڑے بھائی محمد عباس ڈار صاحب اور میری پیاری بہنیں اور عزیز بھابی کی بے پناہ قربانیوں اور احسانوں کا بدل شکریہ کے چند الفاظ قطعی نہیں ہو سکتے لیکن ان کا ذکر کرنا میرے لیے باعث فخر ہے کیونکہ ان کی محبتوں اور شفقتوں نے میرے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا کیا۔ میں ان سب کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں۔

اپنے تمام خیر خواہوں عزیز بزرگوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو فراموش کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ جن کی انتھک محنت و محبت اور بے مثال معاونت نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور ناکامی و مایوسی کا سایہ کبھی میرے سر پر پڑنے نہیں دیا۔

میں شعبۂ اردو کے تمام ریسرچ اسکالر کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنھوں نے میرے اس کام کی تکمیل میں ہر لمحہ میری مدد کی۔ میں اپنے تمام احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی مہربانی سے زندگی میں ہر مشکل ختم ہوئی، اس کی رحمت مجھ پر تاحیات رہے (آمین)

**شبیر احمد ڈار**

**ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف میسور، میسور**

# باب اول

## ......سوانح نگاری کا فن......

سوانح نگاری ادب کی ایک اہم صنف ہے۔انگریزی میں سوانح کے لئے بیوگرافی(biography) کا لفظ استعمال ہوتا ہے biography کے معنی ہیں سوانح عمری ۔سوانح عمری میں کسی فرد کی زندگی کے سفر کی داستان پیش کی جاتی ہے۔سوانح نگارکا موضوع کوئی خیالی پیکرنہیں بلکہ حقیقی شخصیت ہوتی ہے ایک ایسی شخصیت جس نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہوں۔وہ شخصیت خواہ ادبی میدان میں اہمیت کا حامل ہو یا سیاسی وسماجی میدان میں امتیاز رکھتی ہو۔شخصیت کسی بھی دور کی ہوسکتی ہے یعنی ہم عصر بھی ہوسکتی ہے یا زمانۂ ماقبل کی ۔سوانح عمری کوتاریخ کی ایک ایسی شاخ قرار دیا گیا ہے جس کا تعلق افراد کی حیات سے متعلق ہوتا ہے اس میں کسی فرد کی زندگی کے اہم واقعات ترتیب وار پیش کئے جاتے ہیں۔اس میں اس کے افکاروخیالات ،نظریات ،اعمال وافعال کا جامع خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔آکسفورڑ ڈکشنری میں سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

the history of the lives of individual men as
a branch of literature .

’’یعنی سوانح عمری ادبی صنف کے اعتبار سے افراد کی زندگی کی تاریخ ہے۔‘‘ [1]

’’ڈرائیڈن نے ۱۶۸۳ء میں اس فن کوسوانح عمری کا نام دیا۔اس کے نزدیک سوانح عمری مخصوص انسانوں کی زندگی کی تاریخ ہے۔‘‘ [2]

"In 1683 he (Dryden )prefaced an edition

of plustarch with an introduction ,in which
the actual word "biography " first occurs
in English ,and is defined as "the history
of particular mens lives "

انسائیکلوپیڈیا امریکا(Encylopaedia Americana) میں سوانح عمری کی حسب ذیل تعریف ملتی ہے:

"Biography may be defined as the
account of an actual life."

''یعنی سوانح عمری کی تعریف ان لفظوں میں کی جا سکتی ہیں'' کہ یہ حقیقی زندگی کی سرگذشت ہے۔،، [۳]

The new Encyclopaedia Britannica میں سوانح عمری کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''Biography ,form of non fictional literature
,the subject of which is the life of an
branch of history ,since i ordering and
interpretation of materials,written and oral
established through research and
personal recollection .It can also be seen
as a branch of imaginative literature in
that itseeks convey asense of the
individual''

''سوانح عمری غیر افسانوی ادب کی شاخ ہے، جس کا موضوع کسی فرد کی زندگی ہے، اسے تاریخ کی ایک شاخ کی حیثیت سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، یہ زبانی یا تحریری تحقیقی اور ذاتی یادداشتوں کے ذریعہ اکٹھا کئے گئے

مواد کی ترتیب وتہذیب اور تعبیر وتشریح کرتی ہے، اسے تخیلی ادب کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ انفرادیت کے تصور کو پیش کرتی ہے۔'' ۴

سوانح عمری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر جہاں نے لکھا ہے:

''سوانح نگاری اتنی قدیم شے ہے جتنی خود انسانی تہذیب۔ جب سے انسان نے شعور کی آنکھیں کھولیں اور دوسرے انسانوں میں شعوری طور پر دلچسپی لینی شروع کی اسی وقت سوانحی خاکہ وجود میں آ گیا۔ اب یہ خاکہ کتنا ہی بھونڈا اور مضحکہ خیز ہو، لیکن یہ تھا حیات انسانی کا خاکہ۔ اس لیے باقاعدہ فن اور صنف کی شکل اختیار کرنے سے قبل یہ بے پناہ انسانی دلچسپی کا مرکز بنتی رہی۔'' ۵

اس طرح انسان کی انسان میں دلچسپی ہی سوانح عمری کی بنیاد ہے۔ کیونکہ جب سوانح نگار کسی کی سوانح حیات مرتب کرتا ہے تو اس کی اپنے موضوع سے گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ سوانح حیات دراصل کسی انسان کی پیدائش سے لیکر موت تک کی دستاویز ہے۔ امیر اللہ شاہین سوانح حیات پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سوانح نگاری افراد کی تفسیر حیات یا تاریخ زیست ہے لیکن نہ محض تاریخ ہے اور نہ صرف تفسیر وہ مہد سے لحد تک کا ریکارڈ ہے جس میں کارنامہ ہائے حیات سے زیادہ ذہن کے مختلف گوشوں کا وہ تدریجی ارتقاء جس سے مکمل شخصیت وجود میں آئی، پیش کیا جاتا ہے۔'' ۶

سوانح نگاری ایک ایسی صنف ہے جس میں ہیرو کے بچپن سے لیکر موت کے واقعات اس طرح قلم بند کئے جاتے ہیں کہ اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں روشن ہو جائیں۔ اس میں اس کی پیدائش، بچپن، جوانی، شادی، تعلیم وتربیت، ماحول اور کارنامے سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ سوانح نگاری کے فن پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر الطاف فاطمہ نے لکھا ہے:

''سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام
ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔'' ۷

سوانح عمری کسی فرد کی زندگی کا مطالعہ ہے اس میں تاریخیت اور ادبیت کا ہونا لازمی ہے فرد واحد سے مطلب یہ ہے کہ صرف صاحب سوانح کی زندگی اور کارناموں کا بیان ہونا چاہیے۔ تاریخیت سے مراد صاحب سوانح کی زندگی کے متعلق تمام چیزوں کی تاریخی ترتیب، اس کی زندگی کے واقعات اور کارناموں کا بیان ترتیب سے کرنا چاہیے اور ان واقعات کے بیان میں ربطہ و تسلسل ہو اور تاریخی سچائی بھی شامل ہو۔
شمس الرّحمٰن فاروقی سوانح نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''عمدہ سوانح عمری کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ صاحب سوانح کی شخصیت
کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کرتی
ہے اور صاحب سوانح کی شخصیت کو سمجھنے میں ہماری معاون ہوتی ہے۔''
۸

بہر کیف سوانح نگاری کسی فرد واحد کی شخصیت کو منظر عام پر اس طرح لانے کا نام ہے کہ اس کی فطرت اور سیرت کا کوئی پہلو پوشیدہ نہ رہے۔ سوانح نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ موضوع سے متعلق معلومات اور واقعات کو دیانت داری کے ساتھ پیش کرے۔ بہت ممکن ہے کہ راست بازی اور دیانت داری کی کڑی پابندی سے سوانح نگاری واقعات اور حالات کا ایک خشک اور بے کیف تسلسل بن کر رہ جائے۔ سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ اپنے ممدوح کے حالات اور کارناموں کا احاطہ خوش اسلوبی سے کرے۔ کسی نامور شخصیت کی سوانح لکھنا یا کسی انسان کے اوصاف بیان کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے، بلکہ اس کے لیے بڑی فراست اور بڑی تلاش و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک کامیاب سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ چند خصوصیت کا حامل ہو۔ سب سے پہلے سوانح نگار جس شخصیت کی سوانح عمری لکھے اس سے پوری طرح واقف ہو، اس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر اس کی نظر ہو اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہو، اب اگر اس کی یہ واقفیت براہ راست ہے، رفاقت یا ملاقات کے ذریعہ تو یہ سب سے بہتر شکل ہے اور اگر اسکی واقفیت کا ذریعہ مطالعہ ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ مطالعہ خالی الذہن ہو کر کیا گیا ہو اور اس میں دوسرے عناصر

ومؤثرات شامل نہ ہوں۔

سوانح نگار کو صاحب سوانح سے ایسا تعلق ہو جو اس کے اندر اسکے حالات جاننے کا شوق، اس کی خصوصیات سے واقف ہونے کا داعیہ، اوراس کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کا جذبہ پیدا کرتا ہو۔سوانح نگار واقعات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ایک اچھے اسلوب کا مالک ہواور اپنی تحریر میں دلکشی کو باقی رکھے ورنہ سوانح عمری واقعات کی کھتونی نہ ہو جائے۔اسے فن کے تقاضوں کا احساس ہو، صاحب سوانح کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو پیش کرتے ہوئے نہ بے جا مدح سرائی سے کام لے اور نہ نکتہ چینی سے جہاں تک ممکن ہواسے چاہیے کہ صاحب سوانح کے حقیقی خدوخال روشن کرے۔جو واقعات پیش کے گئے ہیں وہ ایک دوسرے کی تکذیب نہ کریں۔واقعات کی ترتیب میں تسلسل کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہے۔صاحب سوانح کے اوصاف وکمالات کو مناسب ڈھنگ اور مناسب موزوں الفاظ میں پیش کرنا چاہے۔کسی شخصیت کا تعارف کرانے یا اس کی سوانح عمری بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والے کے دل میں اس کے لیے عقیدت ومحبت کے جذبات ہوں، اور صاحب سوانح کی توصیف اس کے ضمیر کی آواز اور اسکے دل کی ایک آرزو کی تکمیل ہو۔

سوانح نگار کے لیے صبر آزما وقت وہ ہوتا ہے جب وہ کسی ایسی شخصیت کی سوانح لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے جو متنازع فیہ ہواور علم وفن کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے چکی ہو۔ایسی صورت میں وہی سوانح نگار کامیاب ہوتا ہے جو صاحب سوانح سے جزوی نہیں کلی واقفیت رکھتا ہو، اس کی تمام تصانیف کا مطالعہ کر چکا ہو اور اس کے بارے میں اس کے معاصرین کی رائے اور ان کے خیالات سے پوری طرح آگاہ ہو اور خود اس کی اپنی رائے ہو۔

سوانح نگاری کے معیار کا دارومدار اس کے مختلف اجزاء موضوع واقعات اور طرزِ بیان پر ہے۔یعنی جب تک یہ فیصلہ نہ کرلیا جائے کہ اس صنف ادب کا موضوع کیا ہے، واقعات وواردات کا انتخاب کیسے عمل میں آئے، ان کی ترتیب وتدوین کس طرح ہواور ان کے اظہار وبیان میں پیرایہ یا طریقہ کار اختیار کیا جائے جس سے ایک فطری اور زندہ جاوید شخصیت سامنے آ کھڑی ہو تب تک سوانح نگاری کا معیار قائم نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان موضوعات کے جو معیار قائم ہوں گے وہی سوانح نگاری کے معیار ہوں۔اس لئے

ذیل کی سطور میں سوانح نگاری کے ایسے معیار قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو اچھی سوانح عمریوں کی تمیز میں نشاندہی کا کام انجام دیں۔

**انتخاب موضوع:**

کسی سوانح نگار کے لئے موضوع کے انتخاب کا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ یہی وہ خشت اول ہے جس پر اس کی فنکاری اور صناعی کی پوری عمارت کھڑی نظر آتی ہے۔اس مقام پر بڑی ذہانت اور تجربہ درکار ہے۔ اس مرحلہ پر ذراسی کوتاہی بھی نقصان پہنچاسکتی ہے کیونکہ انسانوں کے ہجوم میں سے ایسی شخصیت کی تلاش جو سوانح نگار کے لئے موضوع ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقیوم کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''محض خوبیوں کی بہتات ہی سوانح نگار کے لئے دل چسپ موضوع نہیں
> بلکہ شخصیت کا تنوع رنگارنگی اور اتار چڑھاؤ بھی اس کے محبوب موضوع
> بن سکتے ہیں۔'' 9

اس تحریر سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالقیوم موضوع کے انتخاب میں سلیقے اور ہوشیاری کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ ان کے خیال میں سوانحی زندگی میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہیے۔

ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جائے جو نمایاں ہو اور ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے جن کی زندگی مسلسل نشیب وفراز سے دوچار رہی ہو۔موضوع کی اہمیت کی بنیاد محض خوبیوں کی بہتات ہی پر نہیں بلکہ شخصیت کے تنوع، رنگارنگی اور اور اتار چڑھاؤ پر بھی ہو۔اس کے باوجود یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ سوانحی زندگی کسی نہ کسی طرح انفرادی خصوصیت کی حامل ہو۔موضوع کے انتخاب کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ سوانح نگار کے نظریات کا ہیرو کے نظریات سے مطابقت کا ہونا ہے۔عموماً سوانح نگار ایسی شخصیات کا انتخاب کرتا ہے جن کے نظریات اس کے مزاج کے موافق اور ہم آہنگ ہوں ۔اگر سوانح نگار کے نظریات وتصورات اور صاحب سوانح کے نظریات وتصورات میں ہم آہنگی اور یکسانیت نہ ہوگی تو نظریاتی اختلاف کی وجہ سے صاحب سوانح کی محاسن بھی عیب بن جائیں گے ،لیکن اگر نظریات میں مطابقت ہوں تو صاحب سوانح کے تمام کارنامے اپنی اصل اہمیت کے ساتھ قاری کے سامنے آتے ہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نظریاتی مطابقت کی وجہ سے صاحب سوانح کی

معائب محاسن میں بدل جائیں گے، لیکن اس کا اندیشہ بہت کم ہے۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ اپنے موضوع کے متعلق ایک ایک بات کو سچائی کے ساتھ بیان کرے اور کوشش کرے کہ انھیں واقعات کو بیان کرے اور کوشش کرے کہ انھیں واقعات کو بیان کرے جس سے ہیرو کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس سلسلے میں امیر اللہ شاہین نے لکھا ہے:

> ''شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ ذاتی معائب
> ومحاسن کو بے کم وکاست بیان کر دینا ناگزیر ہے، اگر ایسا کرنے کی جرأت
> ہوتب جانسن کے بقول موضوع کو چھونا نہیں چاہیے۔'' [۱۰]

موضوع کی اس بحث سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے شخصیت کتنی پرکشش ہے اور لوگوں کو یہ شخصیت کس حد تک متاثر کر سکتی ہے۔ اس کی زندگی کے نشیب وفراز قاری کے دل ودماغ کو کہاں تک متاثر کر سکتے ہیں۔ اپنے موضوع کو بلند مقام عطا کرنے میں سوانح نگار کا بہت اہم رول ہوتا ہے کیونکہ سوانح نگار اپنے موضوع کو جتنے قریب سے جانتا ہوگا اس کے متعلق اس کی معلومات اتنی ہی زیادہ ہوں گی بس اس وقت سوانح نگار کا فرض اتنا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے متعلق جو کچھ بھی جانتا ہے اس کو غیر جانبداری، دیانت داری اور سچائی کے ساتھ بیان کر دے اور اس کی زندگی کے ہر واقعہ ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کر دے۔ اگر ان باتوں کے پیش نظر سوانح نگار کسی کی سوانح حیات مرتب کرتا ہے تو بے شک وہ سوانح حیات کامیاب ہوگی۔

**سوانحی مواد کا انتخاب:**

سوانحی موضوع کے انتخاب کے بعد سوانحی مواد کی منزل آتی ہے کیونکہ سوانح عمری کے لیے سوانحی موضوع کے مناسب وموزوں انتخاب کے فوراً بعد اس کی زندگی کے حالات وواقعات کی تلاش وجستجو اور ان میں ترک وانتخاب اور اس کی مناسب ترتیب کا کام ایک سوانحی نگار کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ مواد کے سلسلے میں انہیں بے حد کاوشیں اور محنتیں کرنی پڑتی ہیں کئی کئی مآخذ کا سہارا لینا پڑتا ہے مواد کے حصول کے لیے کئی ذرائع ہوتے ہیں مثلاً خود صاحب سوانح کی تحریریں اس کی گفتار وکردار اس کے اقوال واعمال نیز لطائف وظرائف سے اس کی شخصیت کا خاکہ تیار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح دوست واحباب، معاصر

اخبارورسائل بھی اس کے معاون ثابت ہو سکتے ہے ۔مختلف ذرائع سے مواد کی فراہمی کے بغیر اچھی سوانح عمریوں کا تصورمحال ہے۔سوانحی مواد کے تعلق سے سلام سندیلوی اپنی کتاب تجربہ وتجزیہ میں رقم طراز ہیں:

> ''سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ہرممکن ذریعہ سے اپنے ہیرو کی سوانح حیات کے لیے مواد حاصل کرے۔اس سلسلے میں ہیرو کے خودنوشت حالات مفید ثابت ہو سکتے ہوں گے۔ہیرو کے خطوط سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے ۔اس کا روزنامچہ بھی سوانح نگاری کو بہت سی گتھیاں سلجھانے میں مدد دے گا۔ہیرو کے لطائف وظرائف بھی اس کے مزاج کو سمجھنے میں رہنمائی کریں گے۔اس سلسلے میں معاصرین کی شہادتیں بھی کام میں لائی جاسکتی ہیں ۔اس عہد کے اخبارات ورسائل ہیرو کے متعلق بہت سے حقائق پر روشنی ڈال سکتے ہیں غرض کہ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ مختلف ذرائع سے اپنے ہیرو کے بارے میں مواد جمع کرے۔'' [11]

سوانح نگاری کے سامنے مواد کے فراہمی کے جومتعدد ذرائع ہیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں۔

خودنوشت: ان میں سب سے اہم ذریعہ خودنوشت ہے جو براہ راست اور بلا واسطہ صاحب سوانح کی تحریریں ہوتی ہیں مثلاً روزنامچے یادداشتیں،خطوط اور بیاض وغیرہ ظاہر ہے کہ ان تحریروں کو اہمیت اس وجہ سے حاصل ہے کی صاحب سوانح اس کے ذریعے خود اپنے بارے میں حقائق وکوائف کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے اس لئے اس کی صحت کے بارے میں زیادہ شکوک وشبہات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

متفرق دستاویزات: متفرق دستاویزات میں صاحب سوانح کے منتشر کاغذات،تاریخی دستاویزیں، قانونی دستاویزیں،مقدمات کی نقلیں،میونسپلٹی کا رجسٹر،ولادت ووفات،وصیت نامہ،درسگاہوں میں داخلے اورامتحان کے فارم وغیرہ ہیں ان تمام چیزوں سے صاحب سوانح کے مختلف پوشیدہ حالات پرنظر ڈالی جاسکتی ہے۔

خطوط: خطوط بھی مواد کے ماخذ کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔خطوط لکھنے کا رواج سینکڑوں برس سے دنیا کے بیشتر حصوں میں پایا جاتا ہے۔اس صنف کومشرق ومغرب میں یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔غالب کے خطوط کی شکل میں موجود ہے۔چوں کہ خطوط کونصف ملاقات کہا جاتا ہے اوراس میں خیالات کے اظہار کا عنصر

بھی پایا جاتا ہے گویا گفتگو تحریر کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتی ہے۔خطوط کا ایک اور پہلو لحاظ ہے اور اس میں وہ ملاقات سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔لہذا ان تحریروں میں سب سے اہم تحریر ''موضوع'' کے نجی خیالات خطوط کی شکل میں ہوں گے جو اس نے اپنی زندگی میں اپنے دوستوں،اعزاءواقرباء، بیوی یا محبوب کو لکھے ہوں گے۔ان سے بھی ان کی ذاتی زندگی کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔خطوط کے بعد سوانح نگار اپنے موضوع کی دوسری تصانیف کی طرف توجہ کرتا ہے۔ان میں موضوع کی ڈائری اور روزنامچے بڑی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ اس میں موضوع سے متعلق اس کی نجی زندگی کی بنیادی معلومات فراہم کی جا سکتی ہے جس سے سوانح نگار کو سوانح عمری ترتیب دینے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ڈائری نگار نے اگر روزمرہ ڈائری لکھنے کا اہتمام کیا ہے تو اس سے متعلق وہ تمام اہم نکات اس میں موجود ہوں گے جو سوانح نگار کو سوانح لکھنے میں کام آتے ہیں۔

سوانح نگار موضوع سے متعلق دیگر ذرائع سے بھی معلومات حاصل کرتا ہے۔ان معلومات کی فراہمی کے لئے موضوع کے خاندان کے دیگر افراد سے مدد ملی جاتی ہے۔ان میں سب سے اہم مواد ہے۔معاصرین کی شہادت اور موضوع کے متعلق اخبار ورسائل کے تراشے بھی سوانح نگار کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا معاصرین کی شہادتوں کے ساتھ اخبار و رسائل کی فراہمی بھی ضروری ہوتی ہے۔ان میں مثبت اور منفی دونوں تصور کارفرما ہوتے ہیں یعنی محبت وعقیدت یا نفرت یعنی سوانح نگار دونوں سے دامن بچاتے ہوئے غیر جذباتی اور تجزیاتی انداز اختیار کرتا ہے۔اس طریقہ سے یہ بھی ضروری نہیں کہ ہیرو کے سارے اعمال واقوال براہ راست سوانح نگار کے علم میں آئے ہوں۔لوگوں کے ملفوظات، لطائف وظرائف، ریکارڈوں،فوٹوگرافی وغیرہ میں موجود ہوں تا کہ سوانح نگار اپنی تحریر میں قلم بند کر سکے۔

**اسلوب یا انداز بیان:**

فن سوانح نگاری میں موضوع اور مواد کے بعد اسلوب یا انداز بیان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔جس طرح ناول،افسانہ،تاریخ وتنقید کا مخصوص اسلوب ہوتا ہے اسی طرح سوانح نگاری کا بھی مخصوص اسلوب ہے اور اسی اسلوب سے خود شخصیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔موضوع کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو موضوع میں جان انداز بیان ہی سے پیدا ہوتی ہے۔انداز بیان کا شخصیت سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔کسی کی طرز تحریر کو دیکھ کر ہم اس کی

شخصیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ انداز بیان میں اس کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے سوانح حیات دراصل کسی انسان کے اعمال وافعال کا مکمل عکس ہوتی ہے اور اس کی زندگی کی روداد بھی اب اس روداد کو عمدہ اسلوب میں بیان کرنا چاہیے تاکہ پڑھنے والا متاثر ہو۔ جیسا کہ نیر جہاں نے لکھا ہے:

''انسانی اعمال وافکار کی ارتقاء کی کہانی ہی سوانح نگاری ہے۔ مگر یہ سوانح نگاری کی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی اگر پیرایہ بیان موثر، باوقار اور دلچسپ نہ ہو۔ اگر طرز ادا میں بے ترتیبی، بدسلیقی، سپاٹ پن ہو تو موضوع اور مواد کی مضبوط ذرائع بھی سوانح عمری کو ناکام ہونے سے نہیں بچا سکتے۔ ادبی دلکشی کے بغیر کوئی سوانح حیات اعلیٰ ادبی حیثیت بھی نہیں اختیار کر سکتی۔ صرف واقعات کو جمع کر دینے کا نام سوانح نگاری نہیں ہے۔ اگر پیرایہ بیان دلچسپ نہ ہو تو بقول شبلی ''واقعات کی کھتونی'' بن کر رہ جائے گی۔'' [۱۲]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلوب کسی بھی موضوع کو پیش کرنے اسے اہم بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جس شخص کی تصویر آپ کھینچ رہے ہیں اس کو اسلوب کے ذریعے اس طرح پیش کریں جیسے خود اپنی کہانی سنا رہے ہو۔ اسلوب دراصل کسی شخصیت کی عکاسی ہے اس میں ہیرو کی پیدائش سے لیکر موت تک کے واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے جیسے لوگ اسٹیج پر ڈرامہ دیکھ رہے ہوں۔ اسلوب کی دلکشی تو سوانح کی مقبولیت میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ صاحب سوانح کے متعلق ہم نے کتنا ہی مواد کیوں نہ جمع کر لیا ہو اگر انداز بیان کے ذریعہ ہم اسے صحیح طریقہ سے پیش نہ کر سکیں تو ساری چیزیں بیکار ہیں جیسا کہ نیر جہاں نے لکھا ہے:

''موضوع کتنا ہی دلکش، منفرد اور عظیم ہو اور مواد کا کتنا ہی بیش بہا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو، مگر انداز بیان کے حسن کے بغیر یہ خزانہ بے کار اور بے قیمت نظر آئے گا۔ حیاتِ اسٹرلنگ، حیات ساوتج اور حیات جانسن انگریزی ادب میں اس لیے روشن ہیں کہ انھیں کارلائل، جانسن اور بوسول جیسے انشاپرداز مل گئے جھنوں نے اپنے قلم کے جادو سے ان عام انسانوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچادیا۔'' [۱۳]

اسلوب کے بارے میں سلام سندیلوی کا خیال ہیں:

''سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریر میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرے۔اس کی تحریر میں لطفِ زبان اورحسن بیان کی خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تحریر سے آمداور بے ساختگی کا اظہار بھی ہونا چاہیے ۔اس کوتکلف، تصنع اور آورد سے گریز کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ ثقیل اورادق الفاظ کے استعمال سے بھی اپنا دامن بچانا چاہیے۔اپنی تحریر میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے وہ ظرافت سے بھی کام لے سکتا ہے۔'' ۱۴؎

**سوانح نگاری اور دوسرے اصناف نثر میں فرق وامتیاز:**

انسان کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرتے ہیں اور اگر وہ فن کار ہے تو ان کا اظہار بھی کرجاتا ہے۔انسان کے ذہن میں موجزن سارے خیالات کے اظہار کے لئے ایک ہی اسلوب کافی نہیں ہے اور نہ ایک ہی مخصوص اسلوب کے دامن میں اتنی وسعت ہے کہ وہ انسان کے ذہن میں ابھرنے والے سارے خیالات کوسمیٹ لے۔اس لئے متعدد اصناف ادب کا وجود ہوا۔جو خیال شعری پیکر میں ڈھالنے کے قابل ہے اس کو نثر کے قالب میں منقلب کرنے سے اس خیال کا سارا حسن زائل ہو جائے گا۔اس لئے شاعری اور نثر نگاری کی ہئیتیں وجود میں آئیں اور پھر ان دونوں نوع کی ہئیتوں سے متعدد دوسری ایجادات ہوئیں۔اس کے علاوہ وہ خیالات جو نثر میں ادا کئے جانے کے قابل ہیں ،ایک ہی اسلوب میں ادا نہیں ہو سکتے۔بعض خیالات طویل اور کشادہ ہوتے ہیں ،بعض مختصر اور جامع۔اسی وجہ سے تذکرہ ،خاکہ ،تاریخ ،خودنوشت سوانح ،سوانح نگاری اور دوسری اصناف کا وجود ہوا، جو طرز تحریر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قطعی الگ ہیں اس لئے ذیل کی سطور میں ہم اس کا جائزہ لیں گے کہ سوانح عمری اور تذکرہ ،سوانح عمری اور خودنوشت،سوانح عمری اور خاکہ اور سوانح عمری اور تاریخ میں کیا فرق وامتیاز ہے۔؟

**تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری:**

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ذکر، چرچا، یادداشت،ٹکٹ یا نشانی کے ہیں۔قرآن شریف میں یہ لفظ بالعموم نصیحت اور تفہیم کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر اردو میں تذکرے سے مراد ایسی کتاب

ہے جس میں شعراء علماء صوفیا، رہنما اور دیگر پیشہ وروں کے حالات اور ان کے منتخب کلام، کرامات اور کارناموں کو پیش کیا گیا ہو۔ تذکروں میں عام طور پر شعراء کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ تذکرے کے تین اجزا ہوتے ہیں حالات زندگی، انتخاب کلام اور کلام پر تبصرہ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی کتاب شعراء اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''درحقیقت تذکرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مرکب نوع تصنیف ہے۔ وہ اجزاء جن پر ایک تذکرہ عموماً مشتمل ہوتا ہے، تین ہیں۔ قدیم زمانے میں تذکروں کو عموماً اصلاح ذوق اور تنقید کلام کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ کچھ تذکرے ایسے بھی تھے جن کا مقصد سارے یا بڑے بڑے شعراء کے حالات زندگی اور ان کا منتخبہ کلام پیش کرنا تھا۔'' ۱۵

سوانح عمری اور تذکرہ میں اگر کوئی مناسبت ہے تو یہی ہے کہ دونوں کا موضوع مشترک ہے یعنی انسان ہے۔ لیکن تذکرہ میں انسان کے ایک مخصوص طبقہ شاعری یا ادیبوں کے حالات زندگی بیان کیے جاتے ہیں اسے سوانح حیات کا قائم مقام نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ فنی اعتبار سے دونوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر عبدالواسع کا خیال ہے کہ:

> ''مگر حقیقت تو یہ ہے کہ تذکرہ انسان کے ایک مخصوص طبقہ شاعروں یا ادیبوں کے حالات زندگی پر مشتمل ہونے کے باوجود سوانح حیات کا قائم مقام نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی برابری ہی کر سکتا ہے۔ فنی اعتبار سے دونوں میں بڑی مغائرت ہے۔'' ۱۶

تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری میں جو خاص فرق ہے اس میں سب سے اول تو یہ ہے کہ دونوں کا میدان عمل جدا جدا ہے۔ یعنی تذکرہ کا میدان عمل کرداروں کی کثرت کی وجہ سے بڑا وسیع ہے کیونکہ تذکرہ نگار کے سامنے بے شمار شخصیتیں ہوتی ہیں جن کی زندگیوں کے حالات کو وہ مختصراً قلم بند کر دیتا ہے مگر اس کے برعکس سوانح نگاری کا میدان عمل محدود ہوتا ہے، کیوں کہ سوانح عمری کا موضوع منفرد زندگی ہوتا ہے حالاں کہ بعض اوقات صاحب سوانح کی فطرت وسیرت کے کسی مخصوص پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے بعض دوسرے کردار بھی پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان کرداروں کی حیثیت ضمنی کردار کی ہوتی ہے۔ تاہم سوانح عمری کا اصل موضوع منفرد

زندگی ہے جوسوانح نگار کے خیال میں دلچسپ مکمل اورسبق آموز ہوتی ہے۔

تذکرہ نگاری میں اس بات کی گنجائش ممکن ہی نہیں کہ ہر شخص کے حالات زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اوراس کی فطرت وسیرت کے گوشوں کو بے نقاب کیا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے تذکرہ میں بے شمار افراد کی زندگی، ان کے کلام کا انتخاب اور پھر ان پر تنقید ہوتی ہے۔اس کے برعکس سوانح نگاری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ صاحب سوانح کے رگ وپے میں سما کر اس کی مکمل شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔

تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری میں طرزتحریر یا انداز بیان کے اعتبار سے بھی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔تذکرہ نگاری میں یہ رواج عام طور پر موجود ہے کہ ایک تذکرہ سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا اوراسی طرح یہ سلسلہ چلا آتا ہے۔اسی لیے ایک تذکروں میں کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں جو خیال پیش ہوا ہے اسی خیال کی بازگشت بعد کے تذکروں میں بھی گونجتی ہے۔مندرجہ ذیل عبارت میں سید شاہ علی نے تذکرہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

> ''طویل ہوں یا مختصر عموماً تذکروں کا سلسلہ ایک دوسرے کی نقل ہی پر ہے۔مثلاً باوجود میر کے نکات الشعرا، (۱۱۶۵ھ-۱۰۲ شاعروں ) کے حالات پر اختصار، نظر اندازی اور بے اعتنائی کے اعتراض کے میر کی مہیا کردہ معلومات میں ان کے مقلدین اور مخالفین دونوں نے بہت کم اضافہ کیا ہے۔'' [۱۷]

لیکن یہ بات سوانح نگاری میں نہیں پائی جاتی۔ایک سوانح عمری سے دوسری سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی۔اگر ایک ہی شخص کی زندگی کو کوئی سوانح نگار اپنا موضوع بنائیں تب بھی ان میں باوجود واقعات وواردات کی مشابہت کے نمایاں فرق پایا جائے گا۔کیونکہ ہر سوانح نگار کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ موضوع کا مطالعہ کرتا ہے اور پیش کرتا ہے۔مثال کے طور پر غالب کی سوانح عمری حالی نے بھی لکھی ہے اور غلام رسول مہر نے بھی، مگر دونوں سوانح عمریوں میں باوجود موضوع کی مشابہت کے آسمان وزمین کا فرق ہے۔پھر اگر تذکرہ نگار اپنا کوئی زاویہ نگاہ بھی ہو تو وہ کھل کر سامنے نہیں آ سکتا کیوں کہ تذکرہ کا ایجاز واختصار اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔

بہر کیف ان تمام باتوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ موضوع ،مواد اور بیان کے اعتبار سے تذکرہ نگاری،سوانح نگاری سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی اس سے بالکل جدا فن ہے۔

**سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح میں فرق:**

خودنوشت انسان کی زندگی کی وہ سرگذشت ہے جسے وہ خود بیان کرتا ہے۔خودنوشت سوانح میں مصنف اپنی زندگی کے ہر دور کے اہم واقعات کو پیش کرتا ہے۔اس میں اس کا بچپن، جوانی، بڑھاپا اوراس کی زندگی کے نشیب وفراز پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔خودنوشت کو سامنے رکھ کر ہم اس کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی ذہنی زندگی اوراس کے طرز عمل کا تجزیہ کرتے ہیں۔اس کی داخلی زندگی تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔یہ اپنی تصویر ہوتی ہے جسے مصور خود بناتا ہے۔یہ اپنی زندگی کی کہانی ہے جسے وہ خود لکھتا ہے۔خودنوشت سوانح حیات اور سوانح عمری میں،دونوں کے درمیان جو بنیادی فرق ہے وہ یہ ہے کہ سوانح عمری میں ایک فرد کی داستان حیات ہوتی ہے اور لکھنے والا دوسرا ہوتا ہے جب کہ خودنوشت سوانح حیات لکھنے والا کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہوتا ہے۔مگر فرق صرف اتنا ہے کہ سوانح نگاری میں اس بات کا دخل ہوتا ہے کہ کسی شخص واحد کو لوگ کیا سمجھتے ہیں اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا جاننا چاہتے ہیں۔ سوانح نگار اپنے زاویہ نگاہ سے عوام کے سامنے اس شخص کو روبرو لا کھڑا کرتا ہے۔جب کہ خودنوشت سوانح نگاری میں فرد واحد نہ صرف اپنے متعلق خود لکھتا ہے بلکہ اپنی ذات سے متعلق افراد کے حالات وکردار کے بارے میں اپنے زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے اوراپنی شخصیت کو عوام کے سامنے مثالی کردار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔سوانح نگار اپنی محبوب ومرغوب شخصیت کو اپنا ہیرو بناتا ہے۔

سوانح نگار حقائق کو فنکارانہ انداز اور دلکش پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔اسے شاعر،مصور یا نقاش کی طرح تخیل سے کام لینے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔وہ صرف مواد کے سہارے شخصیت کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس شخصیت کے خدوخال اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز ہو جائیں اس کے برخلاف خودنوشت میں خارجی مواد کے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مواد خود مصنف (خودنوشت نگار) کی اپنی ذات کے خمیر سے برآمد ہوتا ہے۔جتنی دیانت داری اور سچائی سے خودنوشت نگار خود اپنے بارے میں لکھ سکتا ہے۔اتنا سوانح نگار اپنے موضوع کے بارے میں نہیں لکھ سکتا۔خودنوشت کا مصنف اپنی سرگذشت کے

ساتھ ساتھ اپنے معاصرین اور احباب کا ذکر بھی کرتا ہے اور ان کی سیرت وشخصیت بیان کرتا ہے لیکن سوانح عمری میں صرف سوانح کے اعمال وافعال اور اس کے متعلقات ضابطہ تحریر میں لائے جاتے ہیں۔

دوسری اصناف کی طرح سوانح عمری اور خودنوشت سوانح حیات بھی ادب کی اصناف ہیں۔ باضابطہ طور پر ان اصناف کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ خودنوشت میں خود اتنی دلکشی ہوتی ہے جتنی ایک انسان میں۔ یہاں مصنف کو اپنے جذبات کو زبان دینے میں کسی شرط یا کسی اصول کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جذبات کے اظہار کے لئے تین چیزیں سچائی، شخصیت اور فن کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر خودنوشت میں سچائی اور دیانت داری سے کام نہیں لیا جائے گا تو وہ خودنوشت فنی معیار پر پوری نہیں اترے گی۔ شخصیت کا مکمل اظہار اور فنی محاسن کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سوانح عمری کے بھی کچھ اصول ہیں جنہیں سہولیت کے پیش نظر موضوع، مواد اور انداز بیان کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ سوانح نگار کے لیے اپنے موضوع سے ذہنی مطابقت ضروری ہے۔ سوانح نگار کوئی بھی موضوع منتخب کرسکتا ہے لیکن اس کے جذبہ واحساس میں ضبط وتوازن اور تنقیدی شعور میں گہرائی ہونی چاہیے۔ خودنوشت میں موضوع کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ خودنوشت سوانح حیات کا موضوع خود مصنف کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ خودنوشت کا مرکزی کردار مصنف خود ہی ہوتا ہے لیکن سوانح عمری میں مرکزی کردار منتخب اور متعین کیا جاتا ہے۔ مواد کے سلسلے میں سوانح عمری کے لئے خودنوشت تحریریں، یادداشتیں، روزنامچے، خطوط، اقوال اور ملفوظات اکثر اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ خودنوشت میں مواد کی فراہمی کی کوئی ضرورت نہیں یہاں تو ساری معلومات مصنف کی شخصیت اور خود اس کے ذہن سے ہی برآمد ہوتی ہیں۔ خودنوشت نگار کی زندگی کی داستان ایک ایسی تحریر ہے جسے خود مصنف سے پہلے کسی نے نہیں پڑھا اس کے حالات وواقعات سے کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا اس کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے جسے مصنف سے پہلے کسی دوسرے نے نہیں دیکھا ہے۔ سوانح عمری میں اس بات کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ ایک صاحب سوانح کو دو مختلف سوانح نگار اپنا موضوع بنا سکتے ہیں لیکن خودنوشت میں اس بات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

سوانح اور خودنوشت میں واضح فرق یہ بھی ہے کہ سوانح مکمل ہوتی ہے۔ اس میں کسی شخص کی پیدائش سے لیکر انتقال اور اس کے بعد تک کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے لیکن خودنوشت میں مصنف کے انتقال کا ذکر نہیں

ہوسکتا اور جس دور میں مصنف اسے لکھتا ہے،اسی دور تک وہ محیط بھی ہوتی ہے۔اسی لئے خودنوشت کبھی مکمل نہیں ہوسکتی۔

**سوانح اور خاکہ میں فرق:**

ادب میں سوانح نگاری اور خاکہ نگاری دو الگ الگ اصناف ہیں،لیکن دونوں میں بڑی مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔جہاں تک خاکہ کی فنی خصوصیات کی بات ہے ڈاکٹر محمد عمر رضا اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''خاکہ دراصل انگریزی کے لفظ (sketech) کا مترادف ہے،جس کے معنی کچا نقشہ،ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصلاح میں اس سے مراد وہ نثری تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ،عادات واطوار اور کردار کو سیدھے سادھے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں کسی ایک فرد کے مختلف گوشوں کی اس انداز میں حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی جاتی ہے جس سے فرد کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔''۱۹

مندرجہ بالا تعریف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خاکہ اصلاح ادب میں کسی شخص کی وہ لفظی تصویر ہے جس میں اس شخص کی شکل وصورت کے ساتھ ساتھ،اس کے عادات واطوار،گفتگو،چال ڈھال،رہن سہن، مزاج،حلیہ اور پسند و ناپسند وغیرہ کو مخصوص طرز نگارش کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس شخص کی چلتی پھرتی تصویر قاری کے سامنے نمایاں ہوجائے۔

خاکہ نگاری چوں کہ ایک سوانحی صنف ہے اس لیے اس میں سوانح نگاری کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ صنف اگر چہ سوانح عمری سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔لیکن شخصیت کے خدوخال واضح کرنے کے لیے شخص کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بھرپور نظر ڈالنی پڑتی ہے۔

جہاں تک سوانح اور خاکہ میں مماثلت اور فرق کی بات ہے دونوں کا موضوع ایک انسان ہوتا ہے۔ جس کی سیرت وصورت کی نقاب کشائی فن کار کا مقصد ہوتا ہے۔ایک معمولی انسان سے لیکر عظیم تر شخصیت تک

تمام ہستیاں سوانح اور خاکہ دونوں کا موضوع ہوسکتی ہیں۔ خاکہ نگار اور سوانح نگار دونوں اپنے تصور کی نہیں بلکہ اس شخص کی مرقع کشی کرتے ہیں جو خارج میں موجود ہوتی ہیں اور اس مرقع کشی میں معائب اور محاسن کو غیر جانب داری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ دونوں میں لطائف وظرافت اور خطوط وغیرہ کے استعمال سے چاشنی پیدا کی جاسکتی ہے۔ شخصیت کا انوکھا پن اور مصنف کے اسلوب کی انفرادیت خاکے اور سوانح دونوں موضوع کو دلچسپی بخشتی ہے۔ دونوں اصناف عمدہ موضوع اور اسلوب بیان کی طالب ہوتی ہیں۔

سوانح اور خاکہ میں کچھ بنیادی فرق یہ بھی ہے، کہ سوانح میں کسی بھی انسان کی پوری زندگی یعنی پیدائش سے لیکر موت تک کے حالات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ جب کہ خاکہ اختصار کا فن ہے۔ یہاں شخصیت کے چند پہلوؤں کو اس فنکاری سے برتا جاتا ہے کہ انسان کا پورا خاکہ قاری کے ذہن پر چسپاں ہو جائے۔ اس فرق کو سید شاہ علی نے اسطرح واضح کیا ہے:

> ''شخصی مرقع (خاکہ) اور مستقل سوانح عمری کا فرق ناول اور افسانے کا سا فرق ہے۔ ایک مستقل سیرت میں انسان کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس سلسلے میں خارجی اثرات اور افتاد طبع اور ان کے ایک دوسرے عمل اور ردعمل کے بیان کے علاوہ بہت سے متنازعہ مسائل بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ لیکن شخصی مرقع اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ گویا سیرت ایک قدآدم تصویر ہے اور شخصی مرقع چہرے کی کسی ایک رخ سے ایک ہلکی اور مختصر سی جھلک، جو زیادہ تر مرقع نگار کے اپنے مشاہدہ کی ترجمانی کرتی ہے۔'' [۲۰]

سوانح نگار کسی شخصیت کی پیدائش ابتدائی تعلیم وتربیت اس کی زندگی کو اپنی تحریر کے ذریعے اس طرح مقید کرتا ہے کہ فرد کی حیات آئینہ کی طرح اجاگر ہو سکے۔ خاکہ نگار چند واقعات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ صرف فرد کی چلتی پھرتی تصویر پیش نگاہ آئے۔ سوانح میں خاکہ کی گنجائش ہوتی ہے مگر خاکہ میں سوانح کی نہیں۔

**سوانح اور تاریخ میں فرق:**

اپنی اصل کے لحاظ سے سوانح نگاری چوں کہ تاریخ کا ایک شعبہ ہے، اس لیے اس میں اور تاریخ میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اول تو اس لیے کہ سوانح میں توجہ کا مرکز فرد ہوتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ فرد

کے اعمال وافعال کے ذریعے اس کی شخصیت اجاگر کی جائے ۔اس سلسلے میں اگر چہ صاحب سوانح کے پس منظر،معاشرے اور ماحول سے بھی بحث کی جاتی ہے، نیز اس کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں حصہ لینے والے دوسرے عناصر بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں،لیکن اس کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔اس کے برخلاف تاریخ میں افراد کے بجائے اقوال وعلل کومرکز توجہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں شخصیتیں کتنی ہی اہم کیوں نہ ہوں ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔دوسرے تاریخ جزئیات کے ہجوم سے گھبراتی اورانھیں نظر انداز کرتی جاتی ہے۔اس کے برخلاف سوانح عمری جزئیات کی مدد سے شخصیت کا مرقع تیار کرتی ہے۔ یہ فرق بھی قابل لحاظ ہے کہ سوانح نگاری وقت کے ایک محدود حصے سے سروکار رکھتی ہے،اس کے برخلاف تاریخ وقت کے سیل گراں اور سیل رواں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ سوانح نگاری مختلف انسانی جذبات کے اظہار کی متحمل ہوسکتی ہےلیکن تاریخ میں جذبات کاعمل دخل گراں گزرتا ہے۔

سوانح اورتاریخ کےفرق کااندازسلام سندیلوی کےاس بیان سےبخوبی ہوسکتاہے:

> ''تاریخ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے۔اورسوانح کی بنیاد احساسات وجذبات پرہوتی ہے۔سوانح حیات کا ہیرواپنے ہم عصرافراد سے بلند ،نیک سیرت اوروسیع النظر ہوتاہے۔مگرتاریخ میں واقعات کاتسلسل قائم رکھنے کے لیے ایسے اشخاص کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جوکسی خاص شخصیت کے مالک نہیں ہوتے ہیں۔اس کےعلاوہ سوانح اورتاریخ میں تفصیلات کے اعتبار سےبھی فرق ہے۔تاریخ صرف افرادکا تذکرہ وہاں تک کرتی ہے جہاں تک اس کاتعلق کسی خاص واقعہ سے ہوتا ہے۔مگرسوانح حیات میں ہیروکی زندگی کے ہر پہلوکو واضح کیا جاتا ہے۔اس کےعلاوہ تاریخ تعصب اورطرف داری سے پاک ہوتی ہےمگرسوانح حیات میں غیر شعوری طور پرتعصب اورطرف داری کےعناصر داخل ہو جاتے ہیں۔''
>
> ۲۱؎

# حوالہ جات


۱۔ The Oxford English Dictionary، ص۲۰۸

۲۔ The Development Of English Biography، ص۷۰

۳۔ Encyclopadedia America، ص۲٦٦

۴۔ The Encyclopaedia Britannic، ص۲۲۲

۵۔ڈاکٹر نیر جہاں, مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص۲۴

٦۔ڈاکٹر امیر اللہ شاہین،فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین،ص ۱۱۹

۷۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص۱۹

۸۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص،۱۴

۹۔ڈاکٹر عبدالقیوم،سوانح نگاری کیا ہے(مضمون)ص۱۹۷

۱۰۔ڈاکٹر امیر اللہ شاہین،فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین, ص۲۳۔۱۲۲

۱۱۔سلام سندیلوی، تجربہ وتجزیہ ص۱۰٦۔۱۰۵

۱۲۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص۴۹

۱۳۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص۵۰

۱۴۔سلام سندیلوی، تجربہ وتجزیہ،ص۱۰۷

۱۵۔ڈاکٹر سید عبداللہ،شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن،ص۹۳۔۹۲

۱٦۔ڈاکٹر عبدالواسع،فن سوانح نگاری،ص۹۸

۱۷۔ڈاکٹر سید شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری،ص۱۲۲

۱۸۔ڈاکٹر محمد عمر رضا،اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت،ص۳۲۔۲۳۱

۱۹۔ڈاکٹر سید شاہ علی فن،سوانح نگاری،ص۸۷

۲۰۔سلام سندیلوی، تجربہ وتجزیہ،ص۱۰۱

# باب دوم

## ﴿......اردو میں سوانح نگاری کی روایت......﴾

کسی بھی زبان کا ادب اوراس کے اصناف کا ارتقاءاس کے سماجی تناظر میں ہوتا ہے۔اردوادب کی بیشتر اصناف نے کم عرصہ میں حیرت انگیز ترقی کی ہے تاہم سوانح نگاری کی رفتارترقی سست نظرآتی ہے۔اردو میں سوانح نگاری کی باضابطہ ابتدا حالی سے ہوتی ہے اگر چہ اس کے ابتدائی نقوش دکنی ادب میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔زمانے کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری سے متعلق انسانی تصورات بدلتے رہے ہیں۔ابتدا میں سوانح کا موضوع سلاطین وامرا کی حیات اوران کے کارنامے ہوا کرتے تھے۔اورعموماً مدح وستائش کے خیال سے ان میں صداقت اورصحت واقعات پرزیادہ توجہ نہیں کی جاتی تھی۔بعد میں اس دائرے میں کچھ وسعت پیدا ہوئی اوراولیاء وصلحاء کی سوانح عمریاں لکھی جانے لگیں،لیکن کرداراب بھی مثالی ہوا کرتے تھے۔اس کے بعد قومی یا اخلاقی افادیت کی حامل سوانح عمریوں کا رواج شروع ہوا،لیکن مثالیت پسندی ان میں بھی کسی نہ کسی صورت اوردرجے تک برقراررہی۔سوانح نگاری کے جدیدترین تصور کے مطابق تحلیل نفسی کے ذریعے صاحب سوانح کی روح کو پالینااوراس کی شخصیت کے تمام نشیب وفراز کوعیاں کردیناضروری سمجھا جاتا ہے۔

زمانۂ قدیم سےلیکر دورحاضر تک سوانح نگاری کے جزوی یا کلی عناصر مختلف شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔چنانچہ کتبات،نوحوں،مرثیوں اورقبائل کی رزمیہ داستانوں سے لے کر خطوط ملفوظات،روزناچوں، یادداشتوں،آپ بیتیوں،شخصی مرقعوں اوراجتماعی تذکروں میں سوانحی جھلکیاں نظرآتی ہیں۔اس فن کی تاریخ پر نظرڈالی جائے تواس کی قدیم ترین مثال یونانی ادب میں ملتی ہے۔یونان میں پلوٹارک نامی ایک سوانح نگار گزرا ہے۔کردارنگاری اوراخلاقی نتائج کے استنباط میں اسے کمال حاصل تھا۔اس نے یورپ کے ادبیات کو

بہت متاثر کیا ہے۔اس کے متعلق نیر جہاں لکھتی ہیں:

''سوانح عمری کی دنیا میں پلوٹارک کی حیثیت ایک رہنما کی ہے۔اس کے بعد ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے جب سوانح عمریاں نہایت کثرت سے لکھی گئیں لیکن ان پر آسمانی کتابوں اور دیومالاؤں کا گہرا اثر صاف نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں زیادہ تر مذہبی رہنماؤں اور بزرگوں کے حالات زندگی سوانح کے سانچے میں ڈھلتے رہے یا پھر ان مشاہیر اور عظیم انسانوں کے حالات جن میں دیوتاؤں کی سی تقدیس پائی جاتی ہے۔'' ۱؎

مشرق میں سوانح نگاری کی روایت زمانہ قدیم سے ملتی ہے۔مذہبی صحیفوں میں بھی سوانحی عناصر دستیاب ہیں۔چنانچہ انجیل میں بھی اس کے عناصر وافر تعداد میں ملتے ہیں۔اسی طرح قرآن میں بھی بہت سے انبیاء کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔سوانحی نقطہ نظر سے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سب سے زیادہ مفصل مکمل اور مربوط ہے۔بقول ڈاکٹر محمد عمر رضا:

''مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید میں اگر چہ سوانحی جھلکیاں مل جائیں گی، لیکن ان کا بنیادی مقصد سوانحی نہیں ہے۔'' ۲؎

اسی کتاب میں اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''یہاں تک کہ یہ جدید ترین آسمانی کتاب قرآن کریم میں بھی شخصی حالات اور کردار واضح اور روشن طور پر بیان کئے گئے ہیں۔مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے جن میں ان کے حالات زندگی کا اثر ان کے کرداروں پر ہے۔'' ۳؎

عربی ادب میں سوانح نگاری کے نمونے سیرتوں کی شکل میں ملتے ہیں۔خصوصیت کے ساتھ جہاں صحابہ کے حالات زندگی پیش کیے گئے۔جس سے اس دور کے ماحول اور حالات پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ عربوں کے یہاں کسی کی سیرت مکمل کرنے میں سب سے اہم چیز ان کا مذہبی جذبہ تھا اور اسی جذبہ نے عربی

ادب میں سیرت نگاری کو فروغ دینے کا اہم کردار ادا کیا جیسا کہ عربوں کی سیرت نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر نیر جہاں نے لکھا ہے کہ:

''سوانح نگاری کے رجحان کو حدیث سے فروغ حاصل ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کی تلاش و جستجو کو کتنے ہی اشخاص نے مقصد حیات اور حاصل زندگی بنا لیا ۔ یہ جستجو دراصل حق اور صداقت کی تھی۔ لہذا حدیث کے ایک ایک راوی کی زندگی کے مکمل حالات کو جمع کرنا اوراس میں صحت کی فکر نے سوانح نگاری کا دامن وسیع کر دیا۔ علماء حدیث نے لاکھوں راویوں کی سوانح کو جمع کیا۔'' ۴

اسی ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

''مسلمانوں میں سوانح نگاری کے رجحانات کو سب سے زیادہ حدیث کی وجہ سے ترقی ہوئی، کیونکہ حدیث کے راویوں کے حالات زندگی کا جمع کرنا اور ان کی چھان بین کرنا حدیث کی صحت کے تعین کے لیے از بس ضروری تھا۔ اس طرح علماء حدیث نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد کے سوانح جمع کیے اس سے اشخاص کی زندگی سے دلچسپی کی تحریک پیدا ہوئی۔'' ۵

قبل از اسلام عربی ادب میں ایسی شاعری کا رواج تھا جس میں شاعر اپنے آبا و اجداد کی شجاعت، دلیری، جوان مردی، خون ریزی اور دیگر جنگجو یانہ اوصاف کا اظہار کرتا تھا، ان باتوں سے انسانی شخصیت کے بعض پہلو اجاگر ہو جاتے تھے۔ دراصل ان کا مقصد ذاتی یا خاندانی افتخار و اعزاز کا اظہار تھا، نہ کہ سوانحی خاکہ پیش کرنا۔

اردو زبان و ادب نے سب سے زیادہ اثر فارسی ادب کا قبول کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارسی کی تقلید میں اعلی درجہ کی شاعری اور انشا پردازی کی کامیاب کوشش تو ملتی ہے مگر صنف سوانح نگاری کی سنجیدہ کاوش کا پتہ نہیں ملتا۔ فارسی ادب میں بزرگان دین کے ملفوظات و مکتوبات نیز شعرائے اردو و فارسی کے بے شمار تذکرے لکھے گئے ہیں۔ بقول ملک راشد فیصل:

''فارسی شعراء کے تذکروں میں ان کی سوانح عمریاں اور ان کے کلام کا

انتخاب ملتا ہے۔'' ۶

اردو سوانح نگاری کی بنیاد عربی اور فارسی میں لکھی گئی سوانح عمریاں تھیں جن کے موضوعات پر مذہبی جذبہ کا غلبہ تھا۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

''اردو زبان وادب پر مذہب کا اثر اتنا گہرا ہے کہ اب تک چلا جا رہا ہے

اور اتنی سوانح عمریاں آج بھی مذہبی پیشواؤں کے لیے لکھی جا رہی ہیں اتنی

دوسرے قسم کے لوگوں کی نہیں۔'' ۷

دکنی زبان وادب میں سب سے زیادہ مقبول ترین صنف مثنوی رہی ہے چنانچہ دکنی شعراء نے بکثرت مثنویاں لکھی ہیں جو مختلف موضوعات پر ہیں مثلاً سیرت، تاریخ، مذہب، تصوف اور عشق ومحبت وغیرہ۔

اردو میں سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے دکن کی نیم افسانوی و نیم سوانحی مثنویوں میں ملتے ہیں۔ دکن کی ایک مثنوی نصرتی کا ''علی نامہ'' اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے تعلق سے احتشام حسین لکھتے ہیں:

''دکن کی ابتدائی شاعری میں ہم کو منظوم سوانح عمریاں ملتی ہیں۔۔۔ جن

میں نصرتی کے علی نامہ کو اہم جگہ دی جا سکتی ہے۔'' ۸

''علی نامہ'' علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی دس سالہ تاریخ ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ دکن کی دوسری نیم سوانحی مثنویوں میں الطاف فاطمہ نے ''غوث نامہ'' کا نام لیا ہے۔ اس مثنوی کا مصنف رومی ہے۔

دکنی مثنویوں کے علاوہ شعراء اردو کے تذکروں میں بھی سوانح نگاری کا دھندلا سا خاکہ اور اولین نقوش پائے جاتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے زیر اثر شعرائے اردو کے تذکرے بھی لکھے گئے ہیں جن میں کردار نگاری اور سوانح نگاری کے گہرے اور عمدہ نقوش ملتے ہیں۔ تذکرہ کے سوانحی پہلو کے سلسلے میں بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ ان میں شاعروں کی ولادت، خاندان اور ان کی زندگی کے مختلف واقعات کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں، لیکن قدیم تذکرہ نگاروں سے ان تمام واقعات و کوائف کا مطالعہ درست نہیں ہے کیونکہ ان کے سامنے تذکرہ لکھنے کے وقت دو باتیں پیش نظر ہوتی تھیں۔ ایک انشاء پردازی کا اظہار، دوسرا یہ کہ شعراء اپنے پاس بیاض رکھتے تھے ان میں نمونہ کلام کے ساتھ اپنی رائے اور پسند و ناپسند کا اظہار کرتے تھے اور شاعروں کی ذات کے متعلق

ایک دو جملے یا چند سطریں اظہار خیال کرتے تھے جس سے ان کا مقصد سیرت نگاری نہیں ہوتی تھی۔ان میں کچھ تذکرے ایسے ہیں جن میں سوانح کے باب میں کچھ زیادہ احتیاط اور توجہ سے کام نہیں لیا گیا ہے،لیکن انہیں تذکروں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن میں شعراء کی زندگی کو کچھ احتیاط سے جمع کرنے ان کی ولایت اور سکونت کی نشاندہی کرنے اور پیدائش ووفات کی سنین لکھنے میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے،اس طرح کے تذکروں میں گلزار ابراہیم،آب حیات،گلشن ہند،گلستان سخن اور خزینتہ العلوم کے نام آسانی سے لیے جا سکتے ہیں۔انہیں تذکروں کی مدد سے آج ہمارے سامنے حاتم،درد،سودا،میر،مصحفی اور انشاء وغیرہ کے کلام اور ان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر موجود ہے۔اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوانح نگاری کے اولین نقوش تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔اس کے تعلق سے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد موجود ہے لیکن وہ بذات خود مکمل سوانح عمری کے قائم مقام نہیں بن سکتے یا تذکرہ سوانح نگاری کے فن کی ایک شاخ ہے،جس کو لغت یا سوانح کا مرکب قرار دیا جاسکتا ہے۔'' ۹

اس کے متعلق ممتاز فاخرہ رقم طراز ہیں:

> ''ان کمزوریوں کے باوجود ان تذکروں میں ایسی بہت سی باتیں مل جاتی ہیں جو ادب و تاریخ کے لیے اہمیت کی حامل ہیں ان میں سوانح نگاری کے اولین نقوش ملتے ہیں۔کیونکہ ان میں سنین ولادت وفات کا بھی التزام رکھا جاتا ہے۔'' ۱۰

فن سوانح نگاری کے اس ارتقائی دور میں سرسید کی خدمت بھی قابل توجہ ہیں۔سرسید کی تین تصانیف ایسی ہیں جن میں سوانحی عناصر ملتے ہیں۔

آثارالصنادید(۱۸۴۸ء)شہر دہلی سے متعلق تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔اس میں تاریخی عمارتوں کا ذکر ہے انہوں نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے ابواب میں ان تاریخی عمارتوں کا ذکر کیا ہے جو شہر دہلی سے باہر ہیں،دوسرے باب میں لال قلع اور اس کی عمارتیں شامل ہیں،تیسرے باب کا تعلق خاص شہر شاہ جہاں آباد سے ہے۔چوتھے اور آخری باب میں مشاہیر دہلی کے حالات اور سیرت کا خاکہ ملتا ہے۔

خطبات احمدیہ(۱۸۷۰ء)سیر سید نے سر ولیم میور کی لائف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں

خطبات احمد یہ بڑی محنت اور کاوش سے لکھی ۔مواد کے سلسلے میں انھیں انگلستان کا سفر بھی کرنا پڑا۔سرسید نے جہاں سر ولیم میور کی مذکورہ کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے وہیں علمائے اسلام کی بے احتیاطیوں کی نشاندہی بھی کی ۔ابتدائی آٹھ خطبات میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے بنیاد الزامات کی پرزور تردید کی ہے آخری چار خطبات میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ۔تعلیم وتربیت ،فصاحت وبلاغت اور مہر نبوت کی حقیقت کو عقلی دلائل سے ثابت کیا۔سرسید کی اس تصنیف میں سوانحی عناصر کی جھلکیاں ملتی ہے۔سرسید کے سوانح نگاری کے متعلق ڈاکٹر نیر جہاں نے لکھا ہے:

> ''سرسید نے باقاعدہ اور شعوری طور پر کوئی سوانح عمری نہیں لکھی مگر ایسے نا مکمل اور ادھورے خاکہ ضرور چھوڑے جو قدیم وجدید سوانح عمریوں کے درمیان پل کا کام دے سکیں۔'' [۱۱]

سیرت فریدیہ (۱۸۹۶ء) اس میں انھوں نے اپنے نانا فریدالدین کے احوال رقم کئے ہیں یہ سرسید کی سب سے اہم تصنیف ہے جسے ۱۸۵۷ء کے حالات اور شاہی دربار کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اپنے نانا اور اپنی والدہ کے سوانحی حالات قلم بند کئے ہیں انھوں نے بڑے دلچسپ اور دلکش انداز میں ان بزرگوں کے اخلاق وعادات اور سیرت وکردار کی تصویر کشی کی ہے اس کتاب سے سرسید کے بچپن اور تعلیم وتربیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید کے عہد سے قبل اردو میں باقاعدہ سوانح نگاری کا وجود نہ تھا البتہ مثنویوں ،مرثیوں اور شعراء کے تذکروں میں سوانحی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں حالی کی ''حیات سعدی'' منظر عام پر آئی۔''حیات سعدی'' اردو میں جدید طرز کی پہلی سوانح عمری ہے۔اس کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے دیباچے میں مصنف نے پہلی بار فن سوانح نگاری ،اس کی تاریخ ،اغراض ومقاصد اور اصول و آداب پر روشنی ڈالی ہے۔اس لحاظ سے یہ دیباچہ مصنف کے سوانحی شعور کی بہترین ترجمانی بھی کرتا ہے۔

حالی فن سوانح نگاری کی ماہیت ،اس کے عہد بہ عہد ارتقاء اور تاریخ سے واقف تھے ۔حالی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ سوانح نگاری کے اصول وآداب اور اغراض ومقاصد کے بارے میں مستقل رائے رکھتے ہیں۔اصول وآداب کے بارے میں انھوں نے مغرب کو اپنا معیار بنایا ہے۔چناچہ لکھتے ہیں:

''زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے،
بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرافی
نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بیوگرافی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی
جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے
ہیں۔ مصنف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں
صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف، کئی کئی ضخیم
جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔'' ۱۲؎

بہرکیف اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سوانح نگاری کو بطور ایک خاص صنف کے حالی نے اپنایا۔ انہوں نے اس صنف ادب کی تہی دامنی کو پوری طرح محسوس کیا اور ''حیات سعدی'' لکھ کر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ حالی ''حیات سعدی'' کے دیباچے میں سوانح عمری لکھنے کی ضرورت اور سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے، جنہوں نے اپنی
نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں، اور جو انسان
کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے
ہیں۔ خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ
جاتی ہیں، ان کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خوابِ غفلت
سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات
اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت
میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے
کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے
ہیں جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں
میں پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا تھا۔'' ۱۳؎

حالی کے پیش نظر عربی و فارسی کی سوانح عمریاں تھیں۔ انہوں نے یورپ کی سوانح عمریوں سے بالواسطہ استفادہ کیا۔ عربی و فارسی اور انگریزی سوانح عمریوں کا جائزہ لے کر سوانح عمریوں کی اہمیت اور

افادیت پر روشنی ڈالی اور قوم کو خواب غفلت سے بیدار کر کے، اچھا بننے اور اچھے کام کرنے کا راستہ دکھایا تا کہ وہ بھی دنیا میں زندہ اور توانا قوم کی طرح باعزت زندگی بسر کر سکے۔

حالی نے ''حیات سعدی'' میں ابواب قائم کیے ہیں۔ پہلے باب میں سعدی کے حالات زندگی ہیں۔ یہ باب مختصر ہے حالی کو سعدی کے حالات جمع کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ حیات سعدی کے سلسلے میں جو کچھ منتشر مواد ہاتھ آیا اسے چھان بین کر، بڑے سلیقے سے اس طرح ترتیب دیا کہ سوانح میں ربط قائم رہے۔ شیخ سعدی کے حالات لکھنے سے پہلے فارس اور شیراز کا تعارف اور آب و ہوا کی خصوصیات، فارس و شیراز کی شہرت اور وہاں کے مشاہیر کے علم و فضل کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد شیخ کا نام، ولادت، بچپن، تعلیم، سیاحت اور مراجعت وطن کا ذکر کیا ہے۔ شیخ سعدی کے مختلف مشاغل، اخلاق و عادات بیان کئے ہیں۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

> ''حالی نے شیخ سعدی کے بچپن اور جوانی کے حالات بڑے دلچسپ اور
> دل نشین انداز میں بیان کئے ہیں اور ان کی زندگی کے مختلف دوروں اور
> ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔'' ۱۴

دوسرے باب میں شیخ سعدی کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ مختلف مشاہیر کی رائیں، شیخ کی نثر و نظم کی تصانیف کا تعارف کروایا ہے۔ سعدی کے کلام کا موزانہ متعدد شعراء کے کلام سے کر کے، اس کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی نے فارسی شاعری خصوصاً غزل اور قصیدہ میں جو تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے اس کو تفصیل سے تحریر کیا ہے اور تصانیف سعدی کی اصلاحی اور اخلاقی قدروں پر روشنی ڈالی ہے۔ حالی نے سعدی کے کلام، غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی پر تبصرہ اور تنقید بھی کی ہے۔ آخر میں خاتمہ ہے جس میں شیخ کے عام حالات اور اس کی عام شاعری پر اجمالی نظر اس طرح ڈالی ہے کہ شیخ کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو اور ہر گوشے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے:

> ''اس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی
> اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اس کو گریٹ مورلسٹ کہا اور
> اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام
> میں کھینچی ہے ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر نے نہیں کھینچ سکی۔'' ۱۵

حیات سعدی تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اردو میں سعدی کی شخصیت اور کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

غرض حیات سعدی اردو سوانح نگاری میں پہلی مکمل تصنیف ہے اس کے بعد جتنی سوانح عمریاں لکھی گئیں قریب قریب وہ سب اس سے متاثر اور مستفیض ہوئیں ۔حیات سعدی کے گیارہ برس بعد ۱۸۹۷ء میں حالی نے اپنے استاد مرزا غالب کی سوانح عمری ''یادگار غالب'' لکھی۔ یادگار غالب لکھنے کا خاص مقصد حالی نے یہ تحریر فرمایا ہے:

> ''اگر چہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام انکی شاعری اور انشاء پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارلخلافے کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہوگیا، اور اردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے، اس لئے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری اور انشاء پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں۔'' ۱۶

مولانا حالی غالب کی شخصیت اور شاعری سے بہت متاثر تھے۔انھیں غالب سے عقیدت ومحبت، ان کے فضل وکمال اور ان کی سیرت وشخصیت کی وجہ سے تھی اور یہ تمام عمر رہی۔ انہوں نے مرزا غالب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں بھی ان کی سیرت وشخصیت اور ان کے فضل وکمال کو بڑے موثر پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔

یادگار غالب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ مرزا کی لائف اور دوسرا حصہ مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب ہے اور آخر میں خاتمہ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام زندگی اور ان کی طرز شاعری اور انشاء پردازی پر ہے۔

حالی نے نہ صرف حالات وکوائف لکھ کر سوانح نگاری میں اضافہ کیا ہے بلکہ وہ کلام غالب سے بھی ادبی دنیا کو روشناس کرا کر، نقد وشعر کی اہمیت اور غالب کی مقبولیت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ان کا یہ مقصد بدرجہ اتم پورا ہوا۔غالب اور ان کے کلام کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ۔یادگار غالب کا اس میں بہت بڑا

حصہ ہے۔

یادگار غالب کا پہلا حصہ خاندان ،ولادت ،تعلیم و تربیت ،مسکن عادات وخصائل ،ذریعہ معاش، اخلاق وکردار،خورد ونوش، رفتار وگفتار،مزاج وطبیعت، دوست واحباب، استادوشاگرد،تصانیف نثر ونظم ،قلعہ معلیٰ اورنواب رام پور کے متعلق واقعات ، بیماری اور وفات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ بہت مختصر ہے لیکن جتنا بھی ہے مکمل ہے۔ اگر حالی مرزا کے تمام حالات اور ملفوظات لکھتے تو یادگار غالب بلاشبہ ایک ضخیم کتاب ہو جاتی۔ حالی نے کچھ تو صحیح حالات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ وہ حالات کی بہ نسبت مرزا کی شاعری وانشاپردازی کی خصوصیات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے، حالات لکھنے میں بہت سے ایسی باتوں کو بھی چھوڑ گئے جن کا علم خود رکھتے تھے۔ ان کو اس بات کا اعتراف بھی ہے۔ بہر کیف حالی نے پوری کوشش کی کہ غیر ضروری واقعات اور کوائف شامل نہ ہو۔ بقول عابد حسین:

> ''غالب کی شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ بے اختیار پڑھنے والے کے دل میں ان کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے غالب کی شرافت اور وضع داری ،سخاوت ،سیر چشمی ،ان کی ظرافت ،خوش مزاجی ان کی طبیعت کی اُفتاد ہر چیز اس خوبی سے دکھائی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اس تاجدار سخن کے دربار میں موجود اس کی ہم صحبت سے لطف اٹھا رہے ہیں۔'' [17]

حالی نے غالب کی سوانح میں یہ اہتمام کیا ہے کہ واقعات کے ساتھ ساتھ حسب موقع غالب کے اشعار لطیفے، ان کی شوخی و بذلہ سنجی اور ظرافت سے عبارت کو انتہائی دلکش بنا دیا ہے۔ دوسرا حصہ غالب کے کلام کی خصوصیات ،اشعار کی تشریح وتوضیح اور مطالب ومعانی ،طرز بیان کی جدت وندرت اور زبان کی خوبی ولطافت پر مشتمل ہے۔ دراصل یادگار غالب کا خاص موضوع اور اہم حصہ یہی ہے۔ حالی کے قلم نے اپنا اصل کمال یادگار غالب کے حصہ دوم میں دکھایا ہے جس کے جزو اول میں مرزا کے اردو کلام پر تبصرہ اور ریویو اور انتخاب ہے اور جزو ثانی میں ان کے فارسی کلام اور فارسی نثر پر بہترین تبصرہ کیا ہے۔ جہاں تک اردو کلام کا تعلق ہے، حالی کی کوشش اندازہ سے زیادہ کامیاب رہی اور حالی کی بدولت غالب کا کلام مخصوص اور محدود حلقے سے

نکل کرعوام تک پہنچا۔

یادگار غالب سے پہلے محمد حسین آزاد نے غالب کے حالات آب حیات میں پیش کئے ہیں لیکن انہوں نے غالب کی حقیقی عظمت کو یا تو جانا ہی نہ تھا یا اس کو نظر انداز کر دیا۔مولانا آزاد نے اپنے استاد ذوق کو غالب پر فوقیت دی ہے۔اس طرح وہ غالب کی سچی اور غیر جانبدارنہ تصویر کشی کرنے سے قاصر رہے اگر چہ حالی نے سعادت مندانہ اور شاگردانہ جذبے کے تحت لکھا ہے۔انہوں نے اپنے استاد کی عظمت کو اجاگر کیا لیکن اس سے کسی دوسرے کے رتبہ اور مقام کو ٹھیس بھی نہیں لگنے دی۔ان کی دوسری تصانیف کی طرح یادگار غالب میں بھی غضب کا توازن اور اصابت رائے پائی جاتی ہے اور جب یادگار غالب کا موازنہ کسی دوسری کتاب سے کیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑے اعتدال وتوازن اور متانت واحتیاط سے کام لیا گیا ہے اور اس کتاب سے ہی دوسرے تذکرہ نگاروں نے مدد لی۔بلاشبہ یادگار غالب کی بدولت غالب کی شہرت ومقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور حالی کو یادگار غالب کی وجہ سے سوانح نگاری اور تنقید دونوں میں اہمیت وانفرادیت حاصل ہوئی۔

مولانا حالی کی تیسری اور اہم سوانح عمری ''حیات جاوید'' ہے۔ان کو انیسویں صدی کی اس نمایاں اور عظیم المرتبت شخصیت سرسید احمد خان سے بے حد لگاؤ تھا، وہ ان کے ملکی وملی، سماجی واصلاحی اور تعلیمی کارناموں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔اگر چہ حالی اس سے قبل دو سوانح عمریاں سپرد قلم کر چکے تھے مگر ان کا رنگ ''حیات جاوید'' سے قطعاً مختلف ہے۔اس کتاب میں ان کی فنی عظمت اسلوب کی خوبی، تحقیق واستدلال کی قدرت اور فکر کی جولانی پوری طرح نمایاں ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت عرق ریزی اور بڑی جانفشانی سے یہ ضخیم سوانح عمری سپرد قلم کی، واقعات، حالات، کتب ورسائل کے اقتباسات اس طرح تلاش کر کے جمع کئے جیسے شہد کی مکھی پھولوں سے رس کی تلاش کر کے لاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کتاب طبع ہوئی تو اسے اردو ادب کا ایک عظیم اور لافانی کارنامہ قرار دیا گیا۔حیات سعدی اور یادگار غالب میں حالی کا قلم ایک نقاد کا قلم ہے۔مگر حیات جاوید میں وہ مورخ ناقد اور ادیب کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔حالی نے سرسید کے مشن کو توضیح اور ان کے کارناموں کی تفسیر کا حق ادا کر دیا۔چنانچہ حیات جاوید میں سوانح عمری کا فن جدید اصول ونظریات سے قریب تر ہو گیا۔باوجود ہزار صفحات کی کتاب کے حالی

نے جدید فن سوانح نگاری سے گریز نہیں کیا۔ دراصل حالی نے مسلمانوں کی ایک صدی کی اقتصادی وتہذیبی، تمدنی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی تاریخ کو قلم بند کیا ہے۔

حیات جاوید لکھنے کے لئے حالی نے عرصہ کے لئے علی گڑھ قیام کیا۔ تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے فائل دیکھے۔ سرسید کی تصانیف، دوستوں کے خطوط، انگریزی اخبارات کے بیانات اور تمام دوسری مفید مطلب تحریروں کو جمع کیا۔ انھیں گہرے مطالعے کے بعد تسلسل کے ساتھ ترتیب دیا۔

حیات جاوید کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں سرسید کی ولادت، بچپن، خاندان، وطن، تعلیم وتربیت، ابتدائی تصانیف، ذریعہ معاش، ۱۸۵۷ء کے انقلاب وحادثات کا حال، سرسید کی خدمات، تعلیمی تحریک، اسباب بغاوت ہند کی تصنیف، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، اردو زبان کی حمایت، لندن کا سفر، تعلیم کے سلسلے میں تہذیب الاخلاق کا اجراء، محمڈن کالج کا افتتاح مختلف مقامات پر اجلاس اور تقاریر، تفسیر قرآن پاک، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پارلیمنٹ میں تقریریں، غرض سرسید کی حیات کے تمام اہم پہلوؤں اور ان کے کارناموں کا احاطہ کیا ہے۔

دوسرے حصے میں سرسید کے خیالات، خدمات، اثرات، اصلاحات، تصنیفات، ان کے پیام کی تفسیر وتوضیح کی گئی ہے۔ ان کی ایک ایک تصنیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ادب، صحافت، تاریخ، سیاست، قومیت تحقیق، اسلوب تحریر، اصلاحی سرگرمیاں، مخالفین کے جوابات اور موافقین کا ذکر وغیرہ نہایت عمدگی کے ساتھ دیا گیا ہے۔

حیات جاوید کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حالی نے سرسید جیسی ہمہ گیر شخصیت جامع الصفات ہستی کے حالات اور کارناموں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سرسید کی حیات وخدمات پر ناقدانہ نظر ڈالی، نیز محاسن ومعائب کا اظہار بھی کیا لیکن ان کے مزاج کی نرمی وسادگی، سنجیدگی ومتانت اور تہذیب وشرافت کا عکس ہر صفحہ پر جلوہ گر ہے۔ وہ محاسن کو اس خیال سے کسی حد تک جوش سے بیان کرتے ہیں کہ ان کا اثر پڑھنے والے پر بھی پڑے اور ان کے اندر یقین محکم اور عمل پیہم کا جذبہ بیدار ہو جائے لیکن خامیوں اور کمزوریوں کو بیان کرنے میں سرسید سے عقیدت آڑے آتی ہے اور کمزوریوں کا ذکر ہمدردی اور مصلحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی پہلو اچھائی کا نکال لیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے بعض نقادوں نے حیات

جاوید کو ''مدلل مداحی''، ''کتاب المناقب'' اور ''یک رخی تصویر'' کہا ہے لیکن دراصل حیات جاوید کی مخالفت کا سبب حیات جاوید کا ہیرو ہے۔ سرسید کے کارناموں کی مخالفت، ذاتی، سماجی، تعلیمی مذہبی اور تہذیبی اختلاف کی وجہ سے تھی ان میں وہ حضرات بھی تھے، جنہوں نے سرسید سے فیض اٹھایا، انگریز اور انگریزی سے نفرت کرنے والے بھی تھے۔ علما بھی تھے اور مشاہیر علم و ادب بھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ سرسید کے حالات اور ان کے کارناموں سے عوام و خواص واقف ہوں۔ حیات جاوید کو جس جامیعت اور استناد کے ساتھ لکھا گیا ہے اس بنیاد پر اسے بہترین سوانح عمریوں کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مواد اور فن کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی حیات جاوید کو حالی کی تصانیف میں منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کتاب میں ان کا اسلوب، سائنٹفک اور سادہ و رواں اور دلکش ہے۔ وہ بڑے فنکارانہ انداز سے تمام متعلقہ پہلوؤں کو پیش کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ لطائف و ظرائف تک بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے۔

حیات جاوید میں سب سے بڑی خوبی جامعیت ہے یعنی سرسید کی زندگی کے جملہ پہلوؤں اور تمام کارناموں کی تفصیل و تشریح دلائل اور مثالوں سے پیش کی گئی ہے اور کسی بھی مسئلہ پر بحث کرتے وقت اس پر جملہ شبہات و اعتراض کا مصنف نے جواب بھی فراہم کر دیا ہے۔ سرسید کی شخصیت، خیالات اور خدمات، کارنامے اثرات اور نتائج تمام مباحث پر سیر حاصل بحثیں اس میں موجود ہیں، جو مصنف کی جگر کاری اور جانفشانی کی تصویر کشی کرتی ہیں۔

حالی نے سرسید کے حالات اور کارناموں کو سلیقے سے ترتیب دیکر یہ ثابت کر دیا کہ وہ بہترین اور منفرد سوانح نگار ہیں۔ حیات جاوید ان کی سب سے ضخیم سوانح عمری اور سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ غرض حالی کی ان تینوں سوانح عمریوں نے اردو ادب اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ جدید فنی نقطۂ نظر سے سوانح عمریاں لکھنے کے لئے راستہ ہموار کیا۔

شبلی نعمانی:

حالی کے بعد اس دور کے دوسرے اہم سوانح نگار شبلی ہیں، ان کی سوانح عمریوں کے موضوع عموماً تاریخی ہیں۔ شبلی کی زیادہ تر سوانح عمریوں کا موضوع اسلامی شخصیات ہیں کیونکہ ان کو مشاہیر اسلام سے خاصی عقیدت اور محبت تھی اور یہی وجہ ہے ان کے قلم سے المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح

مولانا روم اور سیرت النبی جیسی سوانح عمریاں وجود میں آئیں۔

''المامون''(۱۸۸۹ء)اس کتاب کی تاریخ سے پہلے مولانا کا خیال اسلام کی ایک مربوط تاریخ مرتب کرنے کا تھا لیکن مصروفیات کی وجہ سے ان کی یہ خواہش عملی جامہ نہ پہن سکی المامون اسی خیال کی ایک کڑی ہے۔شبلی نے ہیروز آف اسلام کے سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر سب سے پہلے عباسی خلیفہ مامون پر قلم اٹھایا۔المامون میں مامون کے مختلف گوشوں سے بحث کی گئی ہے۔اس میں اس کی پیدائش،موت،تعلیم وتربیت، اخلاق وعادات،عقیدہ وایمان اور فضل وکمال سے متعلق بیان درج ہیں۔اس کے بعد تاریخ میں مامون کی جو اہمیت حاصل ہے اس پر بحث کی گئی ہے یہ باتیں ہیرو کے شخصیت کے خارجہ عناصر ظاہر کرتی ہیں۔

شبلی کا سوانحی طریقہ تاریخی طریقہ سے بہت متاثر کن ہے۔کتاب کا تعلق مامون کے کارناموں سے متعلق ہے جس حد تک ذاتی حالات کا ذکر ہے اس میں مامون کی شخصیت،قابلیت،ذہانت،اخلاق وعادات کا تفصیلی ذکر،لطائف وظرائف اور دلچسپ واقعات وغیرہ کی مدد سے مامون کی شخصیت واضح نقوش اور خدوخال پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔بقول سید عبداللہ:

> ''مامون کے زمانے کی معاشرت اور دارالسلام بغداد کی تہذیب عصری کا
> اس سے بہتر موقع شاید کسی اور کتاب میں موجود نہ ہوگا ۔۔۔شاید
> مشہور عربی کتاب عصر المامونی سے بھی بہتر ۔۔۔المامون میں اشخاص
> کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کی تصویریں بھی عمدہ ہیں۔انہی کی وجہ سے
> المامون ایک معقول سوانح عمری بن گئی۔'' ۱۸

المامون کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔عباسیوں کی تاریخ اور محمود کے عہد کی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ مامون کی زندگی کے ہر پہلو کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔دوسرے حصے میں ہیرو کے سوانحی حالات بیان کئے گئے۔لطائف وظرائف سے شخصیت کو دلچسپ بنایا ہے،مامون کی بے اعتدالیوں کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا ہے۔شبلی کا مطمح نظر چونکہ ہیرو کی لائف اور اس کے کارناموں کی سرگزشت لکھنا ہے تو فطری طور پر ان کی نظر محاسن پر پڑتی ہیں جن کا بیان وہ کھل کر کرتے ہیں اور اس کی کمزوریوں سے صرف نظر کرتے ہیں۔مجموعی

طور پر المامون میں شبلی کا عام انداز مورخانہ ہے وہ ہیرو کی شخصیت کو اس کے عہد اور ماحول کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔اس میں مامون کے عہد کی معاشرت اور بغداد کی تہذیب وتمدن کی بہترین تصویر نظر آتی ہے۔

سیرۃ النعمان: المامون کے بعد شبلی کی دوسری سوانح عمری سیرۃ النعمان ہے۔جو ۱۸۹۱ء میں منظر عام پر آئی۔اس میں حیات سے زیادہ ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس میں فقہ اور رجال پر بحث بھی ہے ایسی بحث الفاروق اور سیرۃ النبی میں بھی موجود ہے۔اس کتاب کو لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو حنیفہؒ کے متعلق بہت سی من گڑھت بعید از قیاس اور مضحکہ خیز روایات عام ہو چکی تھیں۔شبلی نے تحقیق وتدقیق سے ان تمام روایات کا پردہ چاک کیا ہے اور ایک ایسی شخصیت کو پیش کیا جو ہر اعتبار سے جامع ہے۔شبلی نے اس سوانح عمری میں امام ابو حنیفہؒ سے متعلق ایسا مواد فراہم کیا ہے کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کی صحیح تصویر پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہے۔

الفاروق: الفاروق ایک اہم سوانح ہے۔جو ۱۸۹۸ء میں منظر عام پر آئی۔جس پر مولانا شبلی کو بڑا ناز تھا وہ اس کو اپنی بہترین تصنیف خیال کرتے تھے اس میں حضرت عمر فاروقؓ کے احوال وآثار مفصل طور سے بیان کئے گئے ہیں۔ان کے صفات حسنہ کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا گیا۔الفاروق ادبی وتاریخی دستاویز ہے اور اردو میں سوانح نگاری اور تاریخ کی آمیزش کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

شبلی نے اس سوانح کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ اول میں اس عہد کی تاریخ اور تہذیب کو پس منظر کے طور پر پیش کیا حضرت عمرؓ کے نام ونسب، رشد، قبول اسلام اور ہجرت وغیرہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور غزوات اور فتوحات کا ذکر ہی نہیں بلکہ واقعات اور مسائل کی تفصیل بھی دی ہے۔حصہ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کی تفصیل ہے۔فاروق اعظمؓ کی فتوحات کی وجہ دیگر فاتحین مثلاً چنگیز وسکندر سے موازنہ نظام حکومت کے دوران شخصی اور جمہوری حکومت کے موازنے اور ذمیوں اور غلاموں کے حقوق سے تفصیلی بحث کی ہے۔شبلی کے فنی شعور کی پختگی الفاروق میں زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔یہی دوسرا حصہ مصنف کی سعی اور محنت کا ثمرہ ہے۔

الغزالی: الغزالی شبلی کے قیام حیدر آباد کی تصنیف ہے، جو ۱۹۰۲ء میں منظر عام پر آئی۔اپنی بعض دوسری تصانیف کی طرح شبلی نے اس کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا حصہ حیات سے متعلق ہے جو نہایت

مختصر ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے نظریات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ان کے اصول ومسائل اورنظریات کو ان کی تصانیف سے اخذ کیا ہے اس سلسلہ میں امام پر اعتراض کے جواب بھی دئے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ علما کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ایک خاص سطح پر لانا تھا۔

سوانح مولانا روم: الغزالی کے بعد شبلی نے سوانح مولانا روم لکھی جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔اس کی وجہ تصنیف شبلی خود بیان کرتے ہیں:

''سلسلہ کلامیہ کا یہ چوتھا نمبر ہے، تین حصے (علم الکلام، الکلام، الغزالی) پہلے شائع ہو چکے ہیں۔مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر وتصوف ہے، اوراس لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا اوراس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجبِ تعجب ہوگا۔ لیکن ہمارے نزدیک اصل علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق ومعارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشین ہو جائیں۔مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔اس لئے ان کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔'' [۱۹]

اس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے نام ونسب، تعلیم وتربیت، شادی، اولاد اوروفات کا وغیرہ کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ بقول شبلی:

''محمد نام، جلاالدین لقب، عرف مولانا روم، حضرت ابو بکر صدیق کی اولاد میں تھے۔۔۔مولانا کے والد کا لقب بہاء الدین اور بلخ وطن تھا۔علم وفضل میں یکتائے روزگار گنے جاتے تھے۔'' [۲۰]

دوسرے حصے میں مولانا رومی کی تصنیفات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ چناچہ ممتاز فاخرہ لکھتی ہیں کہ:

دوسرے حصے میں مولانا رومی کی تصنیفات پر اظہار خیال کیا ہے۔ان کی مثنوی کو علم الکلام کے ایک شاہکار کا درجہ دیا ہے اور یہی شبلی کا اصل مقصود ہے۔اس میں بھی الغزالی کی طرح شبلی نے شخصیت سے زیادہ کارناموں

کو اہمیت دی ہے۔اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوانح مولانا روم بھی
الغزالی سے الگ نہیں کیوں کہ ان دونوں میں شبلی کا مقصد علم الکلام کی
تشریح ہے۔'' ۲۱

سیرت النبی: اردو میں سوانح کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک انتہائی اہم اور ضخیم کتاب علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) اور سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) کی مشترکہ تصنیف ''سیرۃ النبی'' ہے۔ جو چھ ضخیم جلدوں اور ایک مختصر (ساتویں) پر مشتمل ہے۔اس کی ابتدائی دو جلدیں علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے ہیں اور باقی پانچ جلدیں ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد لکھیں۔

سیرۃ النبی کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں (شبلی کی وفات کے کم وبیش چار سال بعد) دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں، تیسری جلد ۱۹۲۴ء میں، چوتھی جلد ۱۹۳۲ء میں، پانچویں جلد ۱۹۳۵ء میں، چھٹی جلد ۱۹۳۸ء میں اور ساتویں جلد طویل وقفہ کے بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔چھٹی اور ساتویں جلد کی طباعت کے درمیان بیالیس سال کا طویل وقفہ حائل ہوا۔اور اس طرح یہ جلد مصنف یعنی سید سلیمان ندوی کی وفات کے ستائیس برس بعد طبع ہوئی۔

اردو کتب سوانح میں سیرۃ النبی ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔اس کے بارے میں منشی محمد امین زبیری کے نام ایک خط میں خود شبلی نعمانی نے یہ لکھا ہے کہ:

''اگر میں مر نہ گیا، اور میری ایک آنکھ بھی سلامت رہی، تو انشاءاللہ دنیا کو
ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک بھی نہیں کی جا
سکے گی۔'' ۲۲

بدقسمتی سے موت نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ خود اس کتاب کو مکمل کر سکتے۔لیکن ابتدائی دو جلدیں انہوں نے جس محنت، دقت نظر، حسن استدلال اور ادبی شان سے لکھیں، اس کی مثال سوانح کے اردو لٹریچر میں نظر نہیں آتی۔شبلی نے ابتدائی دونوں جلدوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی بشری خصوصیات کا مرقع اس خوبی سے پیش کیا ہے، کہ اس کتاب کو اردو ادب کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

شبلی اردو کے ممتاز سوانح نگار تسلیم کئے جاتے ہیں، وہ بنیادی طور پر محقق اور مورخ ہیں، موضوع سے متعلق واقعات بڑی تلاش وتحقیق سے یکجا کرتے ہیں اور اپنے دلکش اسلوب سے تاریخی پس منظر میں اپنے ہیرو کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔

حالی وشبلی کے بعد بھی اردو میں بہت سی اچھی اور معیاری سوانح عمریاں لکھی گئی ہے، جن میں مرزا حیرت دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار عالم، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، سید سلیمان ندوی، اسلم جیراج پوری، فوق بلگرامی، عبدالسلام ندوی، مولوی اکرام اللہ ندوی، رئیس احمد جعفری، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور صالحہ عابد حسین وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مرزا حیرت دہلوی بھی اس دور کے مایہ ناز مصنف، سوانح نگار اور مدیر ہیں۔ انھوں نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ ''حیات طیبہ''، ''حیات فردوسی'' اور ''سیرت محمدیہ'' ان کی اہم سوانحی تصنیف ہے۔

حیات طیبہ حضرت اسماعیل شہیدؒ کی سوانح عمری ہے۔ اس کتاب کے اسلوب پر شبلی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہیرو کو ایک عظیم مجاہد اور سپہ سالار کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اس کی بشری خصوصیات پر بھی نظر رکھی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں انہوں نے شاہ اسماعیل شہید کے رفیق کار سید احمد بریلوی کی مختصر سوانح حیات قلم بند کی ہے۔ حیات فردوسی مرزا حیرت دہلوی کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۶ء میں جبکہ دوسری بار ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ حیات فردوسی ۱۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے فردوسی کے احوال زندگی کو بیان کیا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی کی تیسری تصنیف سیرت محمدیہ ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے سیرت محمدیہ میں اپنے ہیرو کی ذاتی زندگی کے بجائے تاریخی حصے کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بلکہ تاریخی شواہد سے مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ اس دور کی اکثر مذہبی سوانح عمریوں کی طرح مناظراتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس دور کے ایک اور اہم سوانح نگار عبدالرزاق کانپوری ہیں، جن کی سوانحی تصنیف ''البرامکہ'' اردو سوانحی عمریوں میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ عبدالرزاق کانپوری حالی اور شبلی کے تصور سوانح نگاری سے متاثر

تھے۔اس خصوص میں انہوں نے خاندان برمکہ کا انتخاب کیا۔البرامکہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے میں یحییٰ برمکی کے حالات اورسیرت وکردار کوپیش کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں فضل برمکی کی زندگی اورخدمات کومنظرعام پرلانے کی کوشش کی گئی ہے۔البرامکہ کے تیسرے حصے میں مولانا عبدالرزاق کانپوری،جعفر برمکی کو سامنے لائے ہیں۔اس سوانح میں ترتیب وتسلسل کاحسن نظرآتا ہے۔ہیروکی عظمت کےنقوش اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ قاری کاذہن پوری طرح سوانح نگارکی گرفت میں آجاتا ہے۔

اسی دور کےایک اورسوانح نگارسیدافتخارعالم ہے۔انہوں نے''حیات النذیر''۱۹۱۲ء کےعنوان سے ڈپٹی نذیراحمد کی سوانح عمری لکھی۔ڈپٹی نذیراحمد کی اس سوانح عمری کومصنف نے سات ابواب میں منقسم کیا ہے۔پہلا حصہ نذیراحمد کی ابتدائی زندگی،تعلیم،نکاح اور دہلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے پر مشتمل ہے۔دوسرے حصے میں ان کی کاروباری زندگی کوپیش کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں ملازمتوں کے سلسلے سے دیے گئے امتحانات،تجربات انگریزی زبانوں سےواقفیت اورانکےمنصب وعہدہ کی ترقیوں کاذکروبیان ہے۔تیسرے حصے میں ان کی اس زندگی کوپیش کیا گیاہے جوانہوں نے حیدرآباد میں گزاری ہے۔چوتھےحصہ میں ان کی ذاتی زندگی پیش کی گئی ہے۔پانچواں حصہ ان کی تصنیفات اورعلمی اورادبی مشاغل کااحاطہ کرتا ہے۔چھٹے حصے میں ان کےمعتقدات ومذہبی خیالات اورساتویں حصے میں مصنف نے معتددضمیمے شامل کرلئے ہیں،اس کا شامل کرناڈپٹی نذیراحمد کےانتقال کے بعدضروری معلوم ہوا۔اس کے بارے میں ممتاز فاخرہ یوں رقم طراز ہیں:

''حیات جاوید کی طرح یہ بھی مفصل اورجامع سوانح عمری ہے۔'' ۲۳

اس عہد کے ایک اہم سوانح نگار قاضی محمد سلیمان منصورپوری ہیں۔قاضی صاحب نے ۱۹۱۲ء میں ''رحمتہ للعالمین'' کے نام سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی۔جوتین جلدوں پر مشتمل ہے۔''رحمتہ للعالمین'' کی پہلی جلد ایک مقدمہ اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔رحمتہ للعالمین کی دوسری جلد آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔رحمتہ للعالمین کی تیسری جلد تین ابواب پر مشتمل ہے۔سیدسلیمان ندوی نے کتاب کی تعریف کرتے ہوئےلکھاہے کہ:

''رحمتہ للعالمین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کےذوق کے مطابق
سوانح اورواقعات کے ساتھ غیرمذاہب کےاعتراضات کے جوابات اور

دوسرے صحائف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود و نصاریٰ
کے دعاوی کا ابطال بھی اس میں جا بجا موجود ہے۔ مصنف مرحوم کو توراۃ
اور انجیل پر مکمل عبور حاصل تھا اور عیسائیوں کے مناظرانہ پہلوؤں سے
جامع پوری واقفیت تھی۔ اسی بنا پر ان کی یہ کتاب ان تمام معلومات کا
جامع خزانہ ہے۔'' ۲۴

اس دور کے وہ سوانح نگار جو موضوع، فن اور اسلوب کے اعتبار سے فن سوانح نگاری کے تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرتے ہیں۔ ان میں سید سلیمان ندوی سرفہرست ہیں۔ انہوں نے متعدد سوانح عمریاں تصنیف کیں۔ سیرت عائشہ، حیات مالک، خیام، رحمت عالم، حیات شبلی اور سیرت النبی کے آخری پانچ جلدیں۔

سیرت عائشہ: سید صاحب کی سب سے پہلی تصنیف سیرت عائشہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ سیرت عائشہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے پہلے اوائل اسلام کی کسی خاتون کی مستقل سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ سوانح عمری نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ امت مسلمہ کی قابل صد احترام ماں کی پہلی سوانح عمری ہے، بلکہ اس میں سید سلیمان نے ایک عورت کی زندگی اور فطرت کے گوناگوں پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس میں عورت ایک بیٹی، بیوی، بہن، سوتیلی ماں، عالمہ، فاضلہ، مجاہدہ، قابل احترام اور ہر دل عزیز ہستی کے روپ میں نظر آتی ہے۔ سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ یہ اتنا جامع اور ہمہ گیر موضوع ہے کہ اس کے کسی نہ کسی پہلو سے عورت فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''ایک مسلمان عورت کے لیے سیرت عائشہ میں اس کی زندگی کے تمام
تغیرات اور انقلابات، مصائب، شادی، رخصتی، سسرال، شوہر، سوکن،
لاولدی، بیوگی، عزت، غربت، خانہ داری رشک وحسد، غرض اس کے ہر
موقع اور ہر حالات کے لیے قابل تقلید واقعات موجود ہیں۔ علمی، عملی
اخلاقی ہر قسم کے گوہر گراں مایہ سے یہ پاک زندگی مالا مال ہے اس لیے
سیرت عائشہ اس کے لیے آئینہ خانہ ہے۔'' ۲۵

اس سوانح عمری کی کامیابی کا اندازہ ممتاز فاخرہ کے ان جملوں سے بھی ہوتا ہے:

''سیرت عائشہ صدیقہ کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ سید صاحب کو فن

سوانح نگاری سے واقفیت ہی نہیں انھیں برتنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ وہ اس
فن کو نہ مناظرے ومجادلے کا ذریعہ بناتے ہیں اور نہ اس کے ذریعہ اپنے
موضوع کی غیر ضروری قصیدہ خوانی کرتے ہیں بلکہ غیر جانبداری سے کام
لیتے ہوئے شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے جاتے ہیں
اوصاف کے ساتھ ساتھ خامیوں کا ذکر بھی بلا جھجھک کیا ہے۔'' ۲۶

حیات امام مالک (۱۹۱۷ء) بھی سید سلیمان ندوی کی ایک اہم سوانحی تصنیف ہے، اس سوانح عمری کی تصنیف کی وجہ بتاتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے:

''آج کل ملک میں علوم اسلامیہ کی طرف سے جو سرد مہری اور بے اعتنائی
برتی جارہی ہے، اور جو انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی
ہے، اس کی روک تھام کے لئے مصلحین کے سامنے مختلف صورتیں پیش
ہیں۔ منجملہ ان کے ایک صورت یہ ہے کہ ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر
پیدا ہو گیا ہے۔ اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم
اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اسی ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی
جائے۔'' ۲۷

اس لیے سید صاحب نے امام صاحب کے کارناموں پر زیادہ زور دیا ہے۔ ولادت، بچپن، تعلیم وتربیت اور ماحول پر اظہار خیال کرنے کے بجائے امام صاحب کے حافظے، جودت طبع، مدینہ کے فقہا اور ان کی علمی حیثیت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی اپنی اس تصنیف میں مولانا شبلی سے بہت زیادہ متاثر اور قریب نظر آتے ہیں۔ شبلی نے جو انداز اور طریقہ کار، سیرت النعمان اور الغزالی میں اختیار کیا ہے، وہی انداز اور طریقہ کار سید سلیمان ندوی نے حیات امام مالک میں اختیار کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی سید سلیمان کی سوانحی تصنیف ''حیات امام مالک'' نے بھی اردو میں سوانح نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

اسی زمانہ کی ایک اور سوانح عمری ''رحمت عالم'' ہے۔ رحمت عالم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کی عبارت سادہ اور دلنشین ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت

اور مدینہ میں داخلے کے موقع کو سید سلیمان ندوی نے بہت ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اہل مدینہ کے پرخلوص اور پرزور استقبال کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ قارئین ایک خاص مسرت اور تسکین کے احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد عمر رضا:

''سیرت ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور ہنوز لکھا جا رہا ہے۔اس کے متعلق مواد اور معلومات کا لا انتہا ذخیرہ موجود ہے جس میں سے سید سلیمان ندوی نے بعض اہم چیزوں کو نکال کر 'رحمت عالم' کی شکل میں ہمارے سامنے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کر دیا ہے جو سیرت ہونے کے باوجود اردو سوانح نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں بے حد معاون و مددگار ثابت ہوئی ہے۔'' ۲۸

۱۹۲۳ء میں سید صاحب کی ایک اور مفصل سوانح عمری ''عمر خیام'' منظر عام پر آئی۔اس سے پہلے خیام کو صرف اس کی رباعیوں کے ذریعہ ہی سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔اس لیے مصنف کا بنیادی مقصد اسی فلسفیانہ پہلو کی نشان کرنا ہے۔

''خیام کی نسبت ہر زبان میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس موضوع میں کوئی جدت باقی نہیں رہی ہے۔تاہم میں نے اس پر قلم اٹھانے کی جرأت کی جس کی صرف دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بعض واقعات تصانیف اور سنین کے متعلق مجھے کچھ کہنا تھا اور اپنی فکر و کاوش اور جد و جہد کے نئے نتیجے، اربابِ نظر کے سامنے پیش کرنے تھے اور دوسری یہ کہ اب تک لوگوں نے اس کو صرف اس کی رباعیوں ہی کے ذریعہ سمجھنا چاہا تھا، جن کی تعین سراسر مشکوک ہے اور میں نے اس کو اس کی خاص فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ روشناس کیا ہے، جن میں وہ بالکل ایک نیا شخص معلوم ہوتا ہے۔اسی لیے کتاب کے آخر میں اس کی فلسفیانہ تصانیف کا حصہ بھی شامل کر دیا ہے تا کہ ہر شخص اس کو اس آئینہ میں دیکھ کر بہ آسانی پہچان سکے۔'' ۲۹

بقول ممتاز فاخرہ:

''مصنف نے خیام کے متعلق رواج پائی گئی بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے
کی کوشش کی ہے۔مثلاً خیام کی سالانہ امداد کا واقعہ گوشہ نشینی۔سلطان سنجر
اور خیام کے تعلقات وغیرہ پر مصنف نے ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔سوانح
عمری میں تحقیقی وتنقیدی انداز نظر کے علاوہ انداز بیان عالمانہ ہے۔جس
سے سوانح میں بڑی حد تک ایک علمی مقالے کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔'' ۳۰

سید سلیمان ندوی کی مشہور سوانحی تصنیف ''حیات شبلی'' ہے۔سید سلیمان ندوی کو شبلی کی ذات سے گہری محبت اور عقیدت تھی۔حیات شبلی لکھ کر انہوں نے اس کا حق ادا کیا ہے۔حیات شبلی سے پہلے شبلی پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔سید سلیمان ندوی اپنے استاد کی نجی اور بیرونی زندگی کے راز آشنا تھے۔انہوں نے اپنے استاد کی حیات،سیرت،شخصیت اور کردار کی تمام تفصیلات نہایت شرح وبسط کے ساتھ قلم بند کی ہیں۔انہوں نے شبلی کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔سید صاحب کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں کہ:

''نوسو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں
بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی،ادبی،سیاسی،تعلیمی،
مذہبی،اورقومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔'' ۳۱

بقول شیخ محمد اکرام:

''حیات جاوید کے بعد شاید حیات شبلی ہماری زبان کی سب سے مفصل
سوانح عمری ہے۔'' ۳۲

بہرکیف سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اپنے استاد شبلی نعمانی کی زندگی اور شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کا احاطہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔اسے ایک وقیع سوانح عمری تسلیم کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ 'حیات شبلی' اردو سوانح نگاری کی روایت میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت النبی: جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ شبلی ''سیرت النبی'' کی پہلی دو جلدیں مکمل کر چکے تھے اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔سات جلدوں پر مشتمل سیرت النبی کی آخری پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی کی تصنیف کردہ ہیں۔

''سیرت النبی'' کی تیسری جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب، نبوت، حقیقت نبوت اور فضائل ودلائل نبوت پر مشتمل ہے۔ ''سیرت النبی'' کی چوتھی جلد، اس میں اسلام کے بنیادی عقائد یعنی نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزاو جزا اور جنت ودوزخ پر بحث کی گئی ہے۔ ''سیرت النبی'' کی پانچویں جلد ''عبادات'' کے موضوع پر ہے۔ اس میں سب سے پہلے اعمال صالحہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اس کی تین اقسام عبادات، اخلاق اور معاملات میں ایک اہم ترین نیک عمل، عبادت کی تشریح کی گئی ہے۔ ''سیرت النبی'' کی چھٹی جلد کا موضوع ''اخلاق'' ہے، یعنی یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل وتشریح ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کو سکھائی گئیں۔ ''سیرت النبی'' جلد ہفتم ''معاملات'' سے متعلق ہے۔ سید صاحب نے ''معاملات'' کی تعریف، اقسام اور تاریخ بیان کرنے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ سیرت النبی کے تعلق سے ڈاکٹر محمد میاں صدیقی یوں رقم طراز ہیں:

> ''سید سلیمان ندوی نے جو حصہ تحریر کیا وہ براہ راست سیرت سے متعلق نہ تھا، اس کا تعلق ان تعلیمات سے تھا جو صاحب سوانح لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس دین کی، اور اس کے بنیادی احکام کی توضیح وتشریح کی، اور اسے نہ صرف یہ کہ سہل اور آسان اسلوب میں پیش کیا بلکہ ایسے دل کش قالب میں ڈھالا کہ پڑھنے والے کے لئے اکتاہٹ کا احساس تو کجا، وہ ایک بار پڑھنے کے بعد اسے دوبارہ پڑھنے کے لئے بے چین اور مضطرب رہتا ہے۔'' ۳۳

اسلم جیراج پوری کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں حیات جامی (۱۹۱۸ء) اور حیات حافظ (۱۹۱۷ء) مختصر ہونے کے باوجود اچھی سوانح عمریاں قرار دی جاسکتی ہیں۔ مصنف نے جامی اور حافظ کے متعلق مواد ہر ممکن ذرائع سے حاصل کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ حیات جامی میں مصنف نے ہیرو کی ولادت، نام ونسب، بچپن کے واقعات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اسلم جیراج پوری نے جامی کے لطائف وظرائف پر بھی توجہ دی ہے۔

حیات جامی کی طرح حیات حافظ میں بھی تلاش وتحقیق کا انداز ملتا ہے۔ حیات حافظ میں مصنف نے ہیرو کے ابتدائی حالات اور سیرت کے مختلف پہلوؤں مثلاً خودداری اور دردمندی پر روشنی ڈالی ہے۔ خواجہ حافظ

صاحب کے متعلق عام طور سے جو غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں، دلائل کی روشنی میں ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی دور کے ایک اور سوانح نگار فوق بلگرامی ہیں ۔اردو سوانح نگاری کی تاریخ میں فوق بلگرامی کی نگارشات اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں ۔فوق بلگرامی کا نام سید اولاد حیدر فوق بلگرامی ہے۔ ان کا شمار ضلع آرہ کی ذی علم ہستیوں میں ہوتا ہے۔شاعری کے علاوہ انہوں نے سوانح نگاری سے خصوصی دلچسپی لی ہے۔اردو سوانح نگاری میں ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ان کی یہ خدمات اتنی اہم ہے کہ اردو سوانح نگاری کی تاریخ ان کو فراموش نہیں کر سکتی بلکہ اردو کی نثری تاریخ بھی ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی ۔افسوس ہے کہ اردو سوانح نگاری کے موضوع پر کام کرنے والوں نے اکثر ان سے پہلو تہی برتی ہے ۔البتہ ڈاکٹر عبدالواسع نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء'' میں فوق بلگرامی کی سوانحی تصنیفات سے روشناس کرایا ہے۔فوق بلگرامی کی متعدد سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں، اور خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں ۔فوق بلگرامی کی سوانح عمریوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے، کہ ان کی افتاد طبع مذہبی ہے ۔انہوں نے جن حضرات کی زندگیوں کو اپنی سوانحی نگارشات کا موضوع بنایا ہے وہ سب کے سب محترم قابل قدر اور پاک زندگیاں ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں کی تصنیف کے پیچھے ضرور ہی حصول ثواب کا مقصد پوشیدہ ہے ۔فوق بلگرامی کی سوانح عمریوں کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالواسع نے لکھا ہے:

> ''سید اولاد حیدر فوق بلگرامی موضوع کی تلاش میں ارد گرد نظریں نہیں دوڑاتے ۔ان کا رجحان مذہبی ہے، اس لئے انہیں ہیرو کی تلاش وجستجو نہیں کرنی ہے ۔اکابر اسلام کی زندگیاں ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔ عقیدے کے مطابق یہ وہ شخصیتیں ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں۔ان کی حیات اس لئے بھی قابل مطالعہ ہے کہ ان میں سیکھنے اور سمجھنے کا بہت کچھ سامان بہم ہے۔چنانچہ فوق بلگرامی نے سوانحی موضوعات ان اکابر اسلام سے منتخب کئے جو ان کے عقیدے سے متعلق ہیں اور اس طرح ان کی سوانحی تصانیف کے تین واضح خانے ہیں ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، علیؓ اور امامین۔'' ۳۴؎

فوق بلگرامی کی سوانحی نگارشات میں ایک خاص طریقہ برتا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں وہ ماخذات کی ایک فہرست دیتے ہیں اور جہاں کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں، اصل عبارت ترجمہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ اس طرح اپنے سوانحی موضوعات کی زندگی کے واقعات وواردات کی پیشکش میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں لکھتے۔ اس طریقہ کار نے ان کی سوانحی نگارشات کو بظاہر بلند بنا دیا ہے، مگر ماخذات کی فہرست پر جب غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ یہ سب کے سب ایک مخصوص عقیدے سے منسلک کتابیں ہیں۔

حلقۂ شبلی کے ایک اور اہم مصنف مولانا عبدالسلام ندوی ہیں۔ عبدالسلام ندوی اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک تصنیف وتالیف کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ اس درمیان انہوں نے سیرت عمر بن عبدالعزیز اور اقبال کامل اہم کتابیں پیش کیں۔ فن سوانح نگاری کے اعتبار سے سیرت عمر بن عبدالعزیز ان کی اہم تصنیف ہے۔ اس تصنیف سے قبل اردو میں عمر بن عبدالعزیز کی کوئی مستند سوانح عمری نہیں تھی۔ عبدالسلام نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کی تلافی کی ہے۔ اس سوانح عمری میں عمر بن عبدالعزیز کی ابتدائی حالات، ازواج واولاد، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات، کارنامہ زندگی اور سیاست وحکومت وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سوانح عمری کا وہ حصہ سب سے زیادہ دلکش ہے، جس میں انھوں نے ہیرو کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ عبدالسلام نے اس سوانح عمری میں ہیرو کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی دوسری سوانحی تصنیف اقبال کامل ہے، چنانچہ اس میں اقبال کی سوانح، ان کی مذہبیت ، اخلاق وسیرت اور تصانیف پر تبصرہ ہے۔ اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف ان کے پیش نظر تھی مگر ان کے لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگزشت اور اس کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طریقے سے فارسی شاعری پر ریویو ہے۔ اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے گئے ہیں اور اس کی شہرت ومقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ادبی لسانی فروگذاشتیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ ان کے فلسفہ خودی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے اجزا وعناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات پیش کئے گئے ہیں اور نعتیہ کلام کے تبصرے پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

مولوی اکرم اللہ ندوی سلسلہ ندویہ کے تربیت یافتہ تھے۔انھوں نے حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی فرمائش پر ۱۹۲۵ء میں نواب وقارالملک کی سوانح عمری ''وقارحیات'' کے نام سے تصنیف کی۔ چنانچہ اس کتاب کا دیباچہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے لکھا ہے۔اس دیباچے میں شیروانی نے وقارالملک کی شخصیت اورسیرت کے پردہ اٹھائے ہیں۔ چنانچہ حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی سوانح نگاری کے سلسلے میں اس دیباچہ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔بہرحال ''وقارحیات'' مولوی اکرم اللہ ندوی کی محنت شاقہ اور سوانح نگاری سے ان کے غایت شوق کا مظہر ہے۔

مصنف نے سوانح عمری کو دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ اول صاحب سوانح کے ذاتی حالات سے متعلق ہے اورحصہ دوم میں کارناموں کی تفصیل ہے۔''وقارحیات'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی مشتاق حسین اپنی دیانت داری، جفاکشی ، انتظامی صلاحیت اورحسن عمل کی بدولت نواب وقارالملک ہوئے۔منشی کی حیثیت میں تیس روپے ماہوار کی تنخواہ پانے والا شخص اپنی کارکردگی سے نظام حیدرآباد کے اہم رکن بنے اور ایک ہزار ماہوار تنخواہ پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اس جہت سے یہ سوانح عمری اپنے اندر قاری کے لئے بڑی جاذبیت رکھتی ہے۔اس سوانح عمری کے مواد کی فراہمی میں مولوی اکرم اللہ ندوی کو در در کی خاک چھاننی پڑی ہوگی۔انھوں نے اپنی اس جانفشانی اورمحنت شاقہ کا ذکر کیا ہے،لیکن اس کی شہادت شیروانی صاحب بھی دیتے ہیں۔انھوں نے لکھا ہے:

> ''موسم نہایت گرم مئی جون کا تھا۔مولوی اکرم صاحب صبح سے تلاش مقصد میں نکل جاتے شام کو واپس آتے۔اسی اثنا میں کاغذات گھنٹوں پڑھتے ،لوگوں سے ملتے ضرورت ہوتی تو میلوں پیدل چلتے۔شام کو یہ حالت ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔'' ۳۵

شیروانی کی اس شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی اکرم اللہ ندوی نے بڑے خلوص اورلگن سے وقار الملک کی سوانح عمری لکھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ایک کامیاب اورمعیاری سوانح عمری تصنیف کرنے میں کامیاب ہوئے۔اس سوانح عمری سے متعلق ڈاکٹر الطاف فاطمہ کی رائے بڑی مستحسن ہے۔وہ رقم طراز ہیں:

> ''اس کتاب میں چند باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔صاحب سوانح

> کے مزاج اور طبیعت کا اندازہ محض ان رپورٹوں کے اقتباسات سے ہی ہوجاتا ہے۔وہ اپنے دوروں اور معائنوں کے سلسلے میں دیتے رہے تھے۔اور اس طرح مصنف اپنی طرف سے اپنے ہیرو کی صفات کے متعلق کوئی خاص دعویٰ نہیں کرتا بلکہ ان کاموں اور جذبات کا سرسری ذکر کرتا جاتا ہے۔اوران کی فطرت کے تمام پہلو خود بخود قاری کے سامنے آتے جاتے ہیں۔اور بغیر مصنف کے ایک لفظ کہے ہوئے یا سفارش کئے ہوئے وہ خود بخود صاحب سوانح کی شخصیت سے مانوس اور مرغوب ہوتا چلا جاتا ہے۔'' ۳۶

رئیس احمد جعفری نے کئی سوانح عمریاں لکھیں جن میں ''سیرت محمد علی''اور رند پارسا'' کامیاب سوانح عمری ہے۔''سیرت محمد علی''۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر لکھی گئی ہے۔رئیس احمد جعفری نے محمد علی کے دوست واحباب اور اعزہ وغیرہ سے معلومات فراہم کیں۔اس کے علاوہ محمد علی کے مکاتیب،نجی کاغذات،علی برادران کی ڈائریوں اور مقالات ومضامین سے اس سوانح عمری کا مواد اکھٹا کیا۔اس سوانح عمری کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ اول ہیرو کے رجحانات،خیالات، افکار اور کارناموں کا آئینہ دار ہے۔اس سوانح عمری کا دوسرا حصہ ہیرو کی پبلک لائف سے متعلق ہے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علی کی زندگی کن کن صبر آزما مرحلوں سے گزری۔مولانا محمد علی سے انہیں عقیدت تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان کی سوانح حیات غیر جانب داری سے لکھی ہے۔جعفری کی دوسری سوانح عمری ''رند پارسا'' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ اردو کے مشہور شاعر ریاض خیر آبادی کی سوانح حیات ہے۔اس سوانح میں مصنف نے ہیرو کے خاندانی حالات، ہیرو کے عہد کا پس منظر،تہذیب وتمدن، ثقافت اور معاشرت پر روشنی ڈالی ہے۔جس سے ہیرو کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ وضع داری،سادگی،معصومیت،قابلیت وعلمیت،حلم ومحبت جیسی خصوصیات قاری کے سامنے آجاتی ہے۔یہ سوانح اپنے دلکش اسلوب،واقعات کے مناسب انتخاب اور ہیرو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی کامیاب عکاسی کے باعث ایک اچھی سوانح عمری ہے۔

غلام رسول مہر اردو کے ایک اہم سوانح نگار ہیں۔انہوں نے ۱۹۳۶ء میں مرزا اسداللہ خان غالب کی

سوانح عمری ''غالب'' کے نام سے تصنیف کی۔حالی کی یادگارِ غالب کے بعد یہ غالب کی دوسری جامع سوانح عمری ہے۔غلام رسول مہر نے غالب کو''غالب'' میں ایک نئے انداز سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ جس سے اردو سوانح نگاری میں ایک نیا انداز پیدا ہوا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے غالب کے نظم ونثر اور ان کی نجی تحریروں سے ان کے حالات زندگی فراہم کئے ہیں۔غالب کی زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کو بھی ان کی تحریروں سے جانچنے ،ان کی صداقت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اور اس کو آسان بنانے میں خود صاحب سوانح کا بھی اہم حصہ ہے۔جس کی طرف مولانا عبدالمجید سالک نے اس کتاب کے دیباچہ میں اشارہ کیا ہے:

> ''اگر مرزا غالب ایسے اچھے اور جامع رقعات نہ لکھ جاتے تو مہر صاحب سوانح نگاری میں اتنے زیادہ کامیاب نہ ہوتے ۔لیکن مہر صاحب کا شرف یہ ہے کہ انھوں نے اس مواد سے وہ فائدہ اٹھایا جس کی توفیق مرزا کے عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی نہ ہوئی۔'' ۳۷

غلام رسول مہر نہایت کاوش سے اس سوانح عمری میں غالب کی سوانح سے متعلق مستند مواد اکھٹا کیا ہے، اپنی گونا گوں خوبیوں کی بدولت ''غالب'' اور سوانح عمریوں میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے متعلق ممتاز فاخرہ یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''غلام رسول مہر کی 'غالب' (۱۹۳۶ء) اردو سوانح نگاری کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔مہر صاحب نے سوانح نگاری میں ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے یعنی صاحب سوانح کے حالات وواقعات کی تحقیق وتنقید کے ساتھ اس کی تخلیقات نظم ونثر سے بھی مواد اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ۳۸

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام نے ''شبلی نامہ'' تصنیف کی۔شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ میں، شبلی کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔ان کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ان کی تصانیف پر تبصرہ کیا ہے، ان کی افتادِ طبع کی روشنی میں ان کی مختلف تصانیف کا جائزہ لیا ہے ،اور زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے ۔مجموعی طور پر 'شبلی نامہ' اردو میں نئی طرز کی سوانح عمری ہے، جس میں ہیرو کی شخصیت اور کارناموں سے قطع نظر اس کے باطن

میں جھانکنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر شاہ علی:

''شبلی نامہ کو اعتدال ،توازن اور جدید سوانحی نقطہ کی ایک ہلکی پھلکی لیکن مستقل سوانح عمری کا نمونہ بنا کر پیش کی ہے۔'' ۳۹

'شبلی نامہ' کے علاوہ محمد اکرام نے غالب کے حالات زندگی ''غالب نامہ'' کے نام سے تحریر کیے۔اس میں انہوں نے ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالی۔عام تذکرہ نگاروں نے عموماً غالب کے فارسی خطوط کو نظر انداز کر دیا تھا۔شیخ اکرام نے غالب کے فارسی خطوط سے مواد اخذ کر کے تاریخی ترتیب کے ساتھ غالب کے احوال پیش کیے ہیں۔مصنف نے غالب کے بچپن، تعلیم وتربیت ،عنفوان شباب کے حالات وکیفیات کو مفصل بیان کیا ہے۔ماحول کا اثر ان کی شخصیت پر پڑا، عادات واطوار میں نمایاں تبدیلیاں آئیں ،اس کا نفسیاتی نقطہ نظر سے تجزیہ کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے غالب کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے، جو اپنے طرز کا نیا تبصرہ ہے۔بقول سید عبداللہ:

''اکرام کا ''غالب نامہ'' مرزا غالب کی محض سوانح عمری نہیں۔اسے ہم وسیع تر سوانح عمری کہہ سکتے ہیں۔وسیع تر سے مراد یہ ہے کہ اس میں سوانح کو مرکزی حیثیت دے کر، کمالات کی تنقید اور قدر شناسی کو اس کے بعید کناروں تک پھیلا دیا گیا ہے۔'' ۴۰

قاضی عبدالغفار کی ''آثار جمال الدین افغانی'' اور ''آثار ابوالکلام آزاد'' نے اردو سوانح نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔آثار جمال الدین افغانی ۱۹۴۰ء میں منظر عام پر آئی ،جس کو قاضی عبدالغفار نے جمال الدین افغانی کے خطوط ،تقاریر، بیانات ،دوستوں ،روزنامچوں ،اخبارات اور دیگر ذرائع سے حاصل شدہ مواد سے مرتب کیا ہے۔آثار جمال الدین افغانی میں قاضی صاحب نے تین ادوار قائم کیے ہیں۔دور اول ،دوم اور سوم۔آخر میں افغانی کے عادات واخلاق کا سرسری ذکر کیا ہے۔اس میں مولانا افغانی کے سیاسی کارناموں اور سیاسی افکاروں پر زور دیا گیا ہے۔قاضی صاحب کو شخصیت کے اس پہلو سے خاص دلچسپی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس پہلو پر اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔قاضی عبدالغفار کی دوسری سوانح عمری آثار ابوالکلام آزاد ہے، جو ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آئی۔اس میں انھوں نے ایک نئے انداز سے حالات

وواقعات کو پیش کیا ہے ۔قاضی صاحب نے ابوا کلام آزاد کی تحریروں یعنی تذکرہ الہلال ،البلاغ ،غبار خاطر سے مواد حاصل کر کے شخصیت کا ایک بھرپورنفسیاتی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آثارابوالکلام آزادکو قاضی عبدالغفار نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے۔'حصہ اول'اور'حصہ دوم'،حصہ اول میں مولانا آزاد کے سیاسی وعلمی مشاغل کوان کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔درحقیقت مولانا کے سیاسی مشغلوں کے پردے میں ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔آزادیٔ ہند، ہندومسلم اتحاد ،نظریۂ پاکستان ،اتحادقومیت کے مطابق مولانا کےنظریات اورذہنی تاثرات کی تفصیل ان کی تحریروں سے اخذ کی ہے۔غرض'حصہ اول'میں ان سیاسی حالات کی تفصیل ہے ،جن سے قاضی صاحب کا ہیرو بلاواسطہ یا بالواسطہ متعلق رہا۔جب کہ'حصہ دوم'میں ہیروکی باطنی کیفیات،جذبات،مزاج اورفطرت کی عکاسی کی گئی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اس حصہ میں ابوالکلام آزاد کی مکمل شخصیت ابھرکرسامنے آتی ہےاور'آثارابوالکلام آزاد' کا یہی حصہ قاضی عبدالغفار کی محنت اوراس کے جدیدسوانحی نقطۂ نظر کی نشاندہی کرتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے سوانح کے موضوع پر بھی قلم اُٹھایا اوراس صنف میں بھی قابل قدر اضافہ کیا۔ان کوسوانح نگاری کے اصول وضوابط سے بخوبی واقفیت تھی ۔سوانح حیات کے سلسلے میں مولانا کی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

(۱)حکیم الامت نقوش وتاثرات،(۲)محمدعلی ذاتی ڈائری کے چندورق۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے۱۹۵۳ء میں اپنے پیرومرشد مولانا اشرف علی تھانوی کی سوانح حیات ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کے نام سے لکھی۔اس کتاب کی بنیاد مولانا دریابادی نے خطوط پر رکھی ہے۔ مولانا تھانوی کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔اوروہ اپنے تجدیدی کارناموں کے باعث حکیم الامت کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ان سے دریابادی کے برسوں تک نہایت گہرےاوروالہانہ تعلقات رہے۔انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات اورنجی خط وکتابت کے ذریعہ ان کی شخصیت کوزندہ وجاوید بنانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے کتاب کے دیباچے میں کتاب کا سببِ تصنیف جس انداز سے تحریر کیا ہے،اس سے نہ صرف یہ کہ کتاب کے مواد پرروشنی پڑتی ہے، بلکہ خودمولانا دریابادی کے طرزسوانح نگاری اوراس کے مقاصد پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ان کے انوکھے طرزتحریر نے لطیف اشاروں اورکنایوں کی مدد سے

ساری اہم باتوں کو مختصر الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی کس پایہ کے تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو، اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لیے اگر کسی صاحب نے اس کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت ولایت کی تفصیل درج ہے۔ یا ان صفحات میں حضرت کے مناقبِ عرفانی ومدراج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔ یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظات مرشد، یا سیرت الشیخ، اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں، سب سے پست ہے۔''

[۴۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنے مقصد کو بڑے پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے اصول سوانح حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف نے ہیرو کو بحیثیت ایک انسان متعارف کرانے کی کوشش کی ہے، اوران کی مداحی کی بنیاد اس غیر معمولی عقیدت پر ہے، جو ان کی نئ زندگی کو دیکھ کر مولانا عبدالماجد دریابادی کے دل میں پیدا ہوئی۔ اس سوانح میں مولانا نے مختلف پہلوؤں سے مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی کے حالات اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر جو واقعات اور حالات جہاں مناسب سمجھا بیان کر دیئے ہیں۔ کتاب کا بیشتر حصہ ان کی باہمی خط و کتابت پر مشتمل ہے۔ جو دونوں کے درمیان ہوتی رہی۔

اس کتاب کو دیکھنے والا پہلی نظر میں مضامین کی بے ربطی اور عدم تسلسل کو دیکھ کر اُکتاہٹ محسوس کرتا ہے، کیونکہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے عام سوانح نگاروں کی طرح کتاب کو نہ تو ابواب وفصل پر تقسیم کیا ہے، نہ مضامین کی ترتیب کا کوئی نظام ہے۔ اس کو ان کی سوانح نگاری کی ایک خامی بھی قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو مولانا کی دل کش انشاء پردازی اور انوکھے طرز تحریر کی کشش ہمیں آگے آگے بڑھنے کی دعوت دیتی ہے اور پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو مسرت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا،

وہ سب اس کے سامنے آ گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی دوسری سوانحی تصنیف ''محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق'' ہے۔ مولانا محمد علی ہندوستان کے محبوب سیاسی رہنماؤں میں گزرے ہیں اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی مسلمان ہند کے سب سے بڑے سردار تھے۔ یہ کتاب مولانا عبدالماجد نے اپنی ذاتی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس کا نام 'ذاتی ڈائری کے چند ورق' رکھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم ہندوستانی رہنما کی زندگی کا حقیقی مرقع ہے اور اسی کے اندر وہ بحیثیت ایک عظیم سیاسی رہنما اور بے مثل قائدین کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کتنی محنت اور کاوش سے یہ کام انجام دیا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں اور دوسری جلد ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو محمد علی جوہر سے محبت تھی اور ہمدردی بھی۔ ان کی نظر سے محمد علی کی زندگی کا کوئی پہلو اوران کے کردار کا کوئی زاویہ پوشیدہ نہ تھا۔ بقول ممتاز فاخرہ:

> ''سوانح عمری کے روایتی اصولوں کی روشنی میں پرکھا جائے تو اسے مکمل سوانح نگاری کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ مصنف نے خاندان، حسب ونسب، تعلیم وتربیت اور دوسرے ضروری بنیادی واقعات کو ترتیب وار پیش نہیں کیا ہے۔ لیکن آج کے سوانح نگار کا مقصد صرف ان بنیادی امور کو ترتیب وار بیان کرنا ضروری نہیں بلکہ وہ ہیرو کی زندگی کے واقعات وحادثات اور رجحانات کو نفسیاتی وذہنی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ صاحب سوانح سے دلچسپی و ہمدردی رکھتا ہے۔ لیکن اس کی کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کرتا بلکہ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو دردمندی سے بیان کرتا جاتا ہے۔ اس کی شخصیت اور مشاغل کا یہ غائر مطالعہ کرتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب سوانح نگار اور اس کے موضوع میں جذبہ ہمدردی، محبت، قربت اور رفاقت رہی ہو۔ مولانا عبدالماجد اس نقطۂ نظر

سے اچھے سوانح نگار ہیں، انھیں اپنے موضوع سے ہمدردی بھی ہے اور
محبت بھی۔'' ۴۲؎

صالحہ عابد حسین نے ۱۹۵۰ء میں مولانا حالی کی سوانح عمری ''یادگار حالی'' کے نام سے تصنیف کی۔ مولانا حالی پر یہ پہلی باضابطہ سوانح عمری ہے۔ صالحہ عابد حسین چوں کہ حالی کی نواسی ہیں، اس لیے انھوں نے حالی کے متعلق واقعات کی جتنی تحقیق اور مواد کو وہ جس قدر فراہم کر سکتی تھیں، انھوں نے کی۔ شائع شدہ مواد کے علاوہ انھوں نے دوست واحباب، عزیز واقارب سے بھی مواد حاصل کیا۔ ان سب چیزوں کے علاوہ صالحہ عابد حسین کو اپنے موضوع سے بہت الفت وعقیدت ہے۔ یہ الفت وعقیدت خود حالی کی لاثانی سیرت کی بنا پر ہے، جس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

''حالی انسان کی حیثیت سے ایک ولی صفت شخص تھے اور اس بارے میں
مجھے اپنے بزرگوں اور مولانا حالی کے دوستوں اور نیازمندوں وغیرہ سے
جو باتیں معلوم ہوئیں، ان کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ان
کی ذات میں ان اعلیٰ اقدار کا جلوہ نظر آتا ہے جن پر انسان فضیلت کا
انحصار ہے۔'' ۴۳؎

''یادگار حالی'' کو صالحہ عابد حسین نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ 'نشو ونما' ہے جس میں حالی کی زندگی کے واقعات بڑی سادگی سے بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں سیرت، کردار، عادات واطوار کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ 'برگ وبار' ہے، جو پہلے دو حصوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی ہے۔ اس میں حالی کی تصنیفات، نظم ونثر پر تبصرہ اور غزلوں کا انتخاب وغیرہ شامل ہے۔ 'نشو ونما' کے حصہ میں حالی کے خاندان، پیدائش، اور بچپن کے واقعات سے ان کی طبعی سادگی اور سعادت مندی نظر آتی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے آگے چل کر شفقت، دردمندی وسادگی کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس حصہ میں اس تہذیبی اور تمدنی ماحول کا عکس بھی نظر آتا ہے، جس نے حالی کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔

'یادگار حالی' کے دوسرے حصہ میں حالی کی تمام تر خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ان کی ذات میں وہ صفات جو کسی شخص کو بچپن ہی سے ذکی بنانے میں معاون ہوتی ہیں ابتداء ہی سے نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

''بچپن ہی سے حالی میں وہ ذہنی بیداری نظر آتی تھی جسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ یہ کچھ ہو کر رہے گا۔''[۴۴]

صالحہ عابد حسین نے حالی کے مزاج کے مطابق سیدھے سادے اسلوب اور شگفتہ پیرائے میں حالی کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ یادگار حالی اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

بہرکیف مولانا حالی کے عہد سے لے کر دور حاضر تک بیسیوں سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، جن میں سے چند ایک کا ہم نے تعارف کرایا ہے، یہ سوانح عمریاں نہ صرف اس عہد کی، بلکہ اردو کی بہترین سوانح عمریاں قرار دی جا سکتی ہیں۔ اس طرح آج اردو میں سوانح نگاری کی روایت ایک توانا اور زندہ جاوید روایت کے طور پر قائم ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص ۱۸

۲۔ڈاکٹر محمد عمر رضا،اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت،ص ۲۴۔۳۲۳

۳۔ڈاکٹر محمد عمر رضا،اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت،ص ۲۴۔۳۲۳

۴۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی،ص ۵۳

۵۔ڈاکٹر سید عبداللہ،سرسید احمد خان اوران کے نامواررفقاءص ۹۲

۶۔ملک راشد فیصل،حالی کی سوانح نگاری حیات جاوید کی روشنی میں،ص ۳۶

۷۔سید احتشام حسین،تنقیدی جائزے،ص ۱۴۰

۸۔سید احتشام حسین،تنقیدی جائزے ص ۱۴۰

۹۔ڈاکٹر سید عبداللہ،میر امن سے عبدالحق تک،ص ۱۳۶

۱۰۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کاارتقاءص ۵۰

۱۱۔،ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص ۶۶

۱۲۔الطاف حسین حالی،حیات سعدی،ص ۱۲

۱۳۔الطاف حسین حالی،حیات سعدی،ص ۱۳۔۱۲

۱۴۔صالحہ عابد حسین،فروغ اردوحالی نمبر،ص ۲۹

۱۵۔الطاف حسین حالی،حیات سعدی،ص ۲۲۱

۱۶۔الطاف حسین حالی،یادگار غالب،ص ۱۵

۱۷۔صالحہ عابد حسین،یادگار حالی،ص ۳۶۔۲۳۵

۱۸۔ڈاکٹر سید عبدللہ،سرسید احمد خان اوران کے نامواررفقاء،ص ۱۶۱

۱۹۔مولانا شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،دیباچہ ص ۳

۲۰۔مولانا شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،،ص ا
۲۱۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۸۱
۲۲۔شیخ محمد اکرام،یادگار شبلی،ص ۴۳۶
۲۳۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۹۷
۲۴۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری،رحمتہ للعالمین،ص ۹۔۸
۲۵۔سید سلیمان ندوی،سیرت عائشہ،ص ۳۰۲
۲۶۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۱۱۴
۲۷۔سید سلیمان ندوی،حیات مالک،ص ۷
۲۸۔ڈاکٹر محمد عمر رضا،اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت،ص ۴۰۰
۲۹۔سید سلیمان ندوی،خیام،ص ا
۳۰۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۱۸
۳۱۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،،ص ۱۰
۳۲۔شیخ محمد اکرام،شبلی نامہ،ص ۷
۳۳۔ڈاکٹر محمد میاں صدیقی،چند اہم کتب سوانح،ص ۳۰۵
۳۴۔ڈاکٹر عبدالواسع،بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء،ص ۸۵
۳۵۔مولانا اکرام اللہ ندوی،وقار حیات،،ص ۷
۳۶۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۵۶۔۲۵۵
۳۷۔غلام رسول مہر،غالب،ص ۷
۳۸۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۴۸
۳۹۔ڈاکٹر شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری،ص ۲۸۹
۴۰۔ڈاکٹر سید عبداللہ،اطراف غالب،ص ۳۰۷
۴۱۔مولانا عبدالماجد دریابادی،حکیم الامت نقوش وتاثرات، ص ۸۵
۴۲۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۹۵۔۱۹۴
۴۳۔صالحہ عابد حسین،یادگار حالی،ص ۱۳
۴۴۔صالحہ عابد حسین،یادگار حالی،ص ۶۷

# باب سوم

## ﴾......حالی کی سوانح نگاری......﴿

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں انسانی زندگی کا رخ موڑا وہیں اردو ادب کو بھی خاطرخواہ متاثر کیا۔اس ضمن میں علی گڑھ تحریک کا کردار نمایاں ہے،جس نے ادب میں نئے فکر وخیال کی دنیا آباد کی۔سر سید احمد خان جو اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔انھوں نے ادب کو تنقیدِ حیات کا فریضہ سرانجام دینے کا ذریعہ بنایا اور ادب میں مقصدیت کو فروغ دیا۔یہ سر سید ہی کا کارنامہ ہے کہ اردو ادبی میلانات ورجحانات کے لیے نئ راہوں کا تعین کیا۔انہوں نے اپنی سعی بلیغ سے اردو نثر کے دھارے کا رخ موڑا۔تخیلی اور داستانی دنیا سے نکال کر اس کو حقیقت سے قریب کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں ایسی صنفوں کو فروغ ہو،اجن میں زندگی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ درآئی۔سوانح نگاری بھی انہی صنفوں میں ایک ہے۔نہ صرف یہ کہ اپنے رفقاء کو انہوں نے بالواسطہ طور پر اس صنف کی طرف متوجہ کیا بلکہ خود اپنے نانا کی سوانح عمری سیرت فریدیہ کے نام سے تصنیف کی۔غرض سر سید اور ان کے رفقاء کا مقصد ادب کو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ان رفقاء میں مولانا الطاف حُسین حالی کا نام قابل ذکر ہے۔جنہوں نے ''حیات سعدیؒ'' کی شکل میں اس تحریک کی ترجمانی کی۔

مولانا الطاف حُسین حالی جدید شاعری،نیچرل شاعری اور تنقید کی طرح سوانح نگاری میں بھی اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔وہ سوانح نگاری کے فن کو سمجھنے اور منفرد وممتاز سوانح نگار بننے کی خداداد صلاحیت وبصیرت رکھتے تھے،ڈاکٹر صفدر حسین کے الفاظ میں:

''نقد وشعر کی طرح سیرت اور سوانح نگاری میں بھی حالی کا اجتہادی درجہ

مسلّم ہے۔اردو میں جدید اصولوں کے ماتحت سوانح نگاری سب سے
پہلے اُنھیں نے شروع کی ان سے قبل محض تذکرہ نگاری تھی،سوانح نگاری
نہ تھی۔حقیقت میں سوانح عمری کا مقصد کسی اہم شخصیت کی وہ سچّی تصویر
پیش کرنا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کے واقعات اور تجربات میں جھلکتی
ہے۔'' [۱]

اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو اس حد تک تسلیم کیا ہے:

''میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مزاج کے اعتبار سے سب سے زیادہ جس فن
کے لئے موزوں تھے وہ سوانح نگاری کا فن تھا۔طبعی شرافت،مہر و محبت اور
سلاست و اعتدال کی خوبی ایک ایسا وصف ہے جو ہر سوانح نگار کے لئے
ضروری ہے،اس بنا پر ان کی سوانح عمریاں ابھی تک اردو کی بہترین
سوانح عمریاں ہیں۔'' [۲]

## حیات سعدی:

مولانا حالی اردو سوانح نگاری کے بانی ہیں۔انہوں نے ۱۸۸٦ء میں حیات سعدی لکھ کر اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔حیات سعدی اردو میں پہلی سوانح عمری ہے جو سوانح نگاری کے مغربی طرز اور تصورات کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہے،اردو میں اس سے قبل مکمل سوانح کا کوئی ایسا مستند نمونہ موجود نہیں تھا۔حالی کے پیشِ نظر عربی،فارسی کی سوانح عمریاں تھیں،جن سے انھوں نے براہِ راست استفادہ کیا لیکن یہ کافی نہیں تھا اور نہ ان کے عہد کے ادبی تقاضوں اور رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا،کیونکہ قدیم اور متوسط دونوں زمانوں میں بیوگرافی لکھنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ:

''لوگوں کے حالات محض بطور روایت کے بیان کرتے تھے۔درایت کو
اس میں کچھ دخل نہ دیتے تھے اور بیان میں مبالغے کو زیادہ کام میں لاتے
تھے۔مسلمانوں کی بیوگرافی میں بھی یہی عام خاصیت پائی جاتی
ہے۔صرف رجالِ حدیث کے حالات جو محدثین نے لکھے ہیں،اُن میں
البتہ بہت احتیاط کی گئی ہے۔ہر ایک شخص کے اخلاق اور خصائل راست

راست بے کم وکاست لکھے گئے ہیں اور اُن کے عیب اور خوبیاں پوست
کندہ بیان کی گئی ہیں۔ باقی علما اور شعرا وغیرہ کے تذکرے ایسے نہیں
ہیں۔'' ۳؎

اس کا سبب یہ تھا کہ:

''تذکرہ نویسی کا مدار محض نقل اور روایت پر تھا، اس لئے ان لوگوں کے سوا
جن کے حالات تاریخ میں مفصل لکھے گئے ہیں (جیسے خلفاء، سلاطین،
وزرا، اور سپہ سالار وغیرہ) باقی تمام اہل کمال کے حالات مختصر طور پر تحریر
ہوئے ہیں۔ اور مشہور سے مشہور مصنف کی لائف بھی جداگانہ نہیں لکھی
گئی۔'' ۴؎

بقول شمیم حنفی ''اس کمی کو دور کرنے کے لئے اور اس عہد کی سوانح عمریوں سے (بالواسطہ) استفادہ کیا ہوگا، کیونکہ مغربی تعلیم وتربیت کے اثرات بڑھتے جارہے تھے''، سرسید کی تحریک شباب پر تھی۔ حالی اس تحریک کے اہم رکن تھے۔ شیفتہ کی وفات کے بعد حالی کا تعلق گورنمنٹ بک ڈپو لاہور سے ہوگیا تھا وہاں انھیں نصاب کی انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں کی عبارت درست کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ انگریزی سے مناسبت اور کسی قدر واقفیت اسی زمانے میں پیدا ہوئی۔ مولانا حالی بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں
ایک اسامی مجھ کو مل گئی۔ جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے
انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی
تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے
انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی۔'' ۵؎

اسی مناسبت نے انھیں انگریزی لٹریچر سے واقف ہونے میں مدد کی اور انہوں نے بیوگرافی کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں۔ مغربی ادب کے متعلق ذیل کی عبارت سے ان کی واقفیت کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

''زمانۂ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترھویں صدی سے

بیوگرافی کو بے انتہا ترقی دی ہے، یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرافی
نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے۔حال کی بیوگرافی میں اکثر مورخانہ
تدقیق کی جاتی ہےاور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے
ہیں ۔مصنف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں
صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں ۔اکثر ایک ایک شخص کی لائف، کئی کئی ضخیم
جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔'' ۶

مولانا حالی کی سوانح عمری کے متعلق ان اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مختلف سوانح عمریوں کا جائزہ لے کر، سوانح عمریوں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور ایک ایسی سوانح لکھنے کی طرف مائل ہوئے، جس میں مشرقی سوانح کی صداقت، بے باکی اور احتیاط کے علاوہ مغربی سوانحوں کا فلسفیانہ رنگ، مورخانہ تدقیق اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج کا استخراج پوری غیر جانب داری کے ساتھ ہو۔

حالی کو قومی تنزل کا شدید احساس تھا، انہوں نے اس صورتحال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی تصانیف کے ذریعہ قوم کے سوئے ہوئے ولولوں کو بیدار کرنے اور اس کی عملی قوتوں کو مہمیز کرنے کی کوشش کی ۔ وہ سوانح عمری لکھ کر دراصل اپنے اسلاف کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے۔اور قوم کو ان کے افکار اور کارناموں سے روشناس کر کے اس میں زندگی اور حرکت کے آثار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان کے سامنے سوانح نگاری کا محض فنی پہلو نہ تھا، وہ سوانح نگاری کا ایک واضح تصور اور مقصد رکھتے تھے اور انہوں نے اسی حیثیت سے اسے برتا اور اس کے امکانات کو بروئے کار لائے۔حیات سعدی کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں
کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں، اور جو انسان کی
آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔
خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی
ہیں، ان کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خوابِ غفلت سے
بیدار کرتا ہے۔جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان
کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی

ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے حالات صرف کتابوں میں پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں انسانیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا تھا۔۔۔ بیوگرافی سے اکثر نیکی کے کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسلاف کے ستودہ کاموں کی ریس کرنے کا شوق دامن گیر ہوتا ہے۔'' ے

یہاں پر حالی کا مقصد اور نقطۂ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جن سوانح کو بھی ضبط تحریر لا رہے ہیں اس کے پیچھے ان کا اصلاحی اور افادی نقطہ نظر کارفرما ہے۔ اس کے لیے وہ پہلے جس شخصیت کا انتخاب کرتے ہیں وہ ہیں سعدی شیرازی۔ سعدی فارسی کے شاعر، نثر نگار ہونے کے علاوہ تصوف کے عالم وفاضل اور ان سب سے بڑھ کر وہ ایک مصلح بھی تھے۔ ان کی تصنیفات، حکایات واشعار اخلاقی تربیت کا اہم ذریعہ ہیں۔ حالی کے سامنے اس سے بہتر شخصیت اور کون ہوسکتی ہے۔ جو گونا گوں صفات کی حامل ہو اور جس نے اپنے خیالات اور طرز ادا سے پوری دنیا کے بڑے ذہنوں کی پرورش و پرداخت کی ہو۔ حالی اور سعدی کے درمیان وقت کی ایک لمبی خلیج ہے لیکن دونوں میں کئی اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا نقطۂ نظر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ ان کے علمی رجحان اور ادبی مزاج میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے نظم ونثر میں ایک نئی طرح ڈالی اور تصنع وتکلف کو خیر باد کہہ کر سادہ اظہار اختیار کیا۔

حالی نے ''حیات سعدی'' لکھنے کے سلسلے میں کافی عرق ریزی کی۔ انھوں نے نہایت محنت اور کاوش کے ساتھ مواد جمع کیا۔ مگر انتہائی کوششوں کے باوجود مواد کی فراہمی کا مسئلہ قدم قدم پر رکاوٹ بنتا رہا۔ مواد کی کمی ہی اس سوانح کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اس کا احساس خود حالی کو ہے۔ انھوں نے خود ''حیات سعدی'' کے دیباچے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

''ہم نے اس خیال سے کہ شیخ سعدی شیرازی کا نام حد سے زیادہ مشہور ہے، شاید ان کے مفصل حالات بہم پہنچ جائیں، ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور اس غرض سے اکثر فارسی تذکرے جو یہاں مل سکتے ہیں،

دیکھے۔ اورانگریزی تذکرہ،سر گوراوسلی کا بھی دیکھا۔مگر ان تمام تذکروں میں زیادہ تر وہی شیخ کی مشہور نقلیں اور حکایتیں ،جو زبان زد خاص وعام ہیں،تھوڑے تھوڑے تفاوت کے ساتھ مندرج پائیں۔شیخ کی تصانیف پر بھی اجمالی تعریف کے سوا کسی نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے اس کے کلام کی عظمت اور واقعی خوبیاں معلوم ہوں۔'' ۸

حالی نے سر گوراوسلی،علی بن احمد،تاریخ کی کتابوں اور چند فارسی تذکروں کی مدد سے سعدی کی حیات وخدمات مرتب کی ہے۔حالی کا سب سے اہم ماخذ سعدی کا کلام اوران کی تصانیف ہیں۔حالی نے انھیں کی روشنی میں شیخ سعدی کے حالات بیان کیے ہیں اور بعض نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔مواد کی فراہمی میں دقتوں کے متعلق بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے بڑی اچھی بات لکھی ہے:

''صرف اُن (سعدی) کے کلام کے مطالعہ سے شہد کی مکھی کی طرح ذرہ ذرہ چن کر سعدی کی سیرت اوراخلاق اور حالات کو مرتب کیا ہے۔'' ۹

حالی نے حیات سعدی لکھنے میں جو کوشش کی ہے،اس کا اعتراف شبلی نے بھی کیا ہے۔شبلی لکھتے ہیں:

''جب تک کافی مواد تحریر نہ ہوں میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لیتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔'' ۱۰

''حیات سعدی'' دو ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔شیخ سعدی کی زندگی سے متعلق جتنی معلومات حاصل ہوسکتی تھیں، وہ سب پہلے باب میں درج ہیں۔دوسرے باب میں سعدی کی شعری اور نثری تصانیف نیز ناقدانہ اور تقابلی تبصرہ ہے۔کتاب کے خاتمہ میں سعدی کے عام حالات اور ان کی شاعری پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔اس طرح سعدی شیرازی کی شخصیت کو حالی نے عوام الناس کے سامنے از سر نو زندہ کردیا۔

اس کتاب کے پہلے باب میں فارس اور شیراز کی آب وہوا، ماحول اور حالات کا ذکر،سعدی کے بچپن کے چند واقعات ،تعلیم وتربیت ،سلطنت بغداد پر تاتاریوں کے حملے کی تباہی اور اس کے دوررس اثرات کا

تذکرہ، مستعصم باللہ کا مرثیہ، شیخ سعدی کی سیاحت اور ابوبکر سعد کے دور میں وطن واپسی اور آخری ایام کا ذکر کیا گیا ہے۔ شیخ کی زندگی کے حالات کا بیان اس کتاب کے تقریباً ایک چوتھائی حصے پر مشتمل ہے۔

چونکہ حالی کے سامنے سعدی کی شخصیت اور کردار کو پیش کر دینا مقصود نہیں تھا بلکہ وہ ہیرو کے کردار اور شخصیت سے ایک نہایت اہم کام لینا چاہتے تھے، اسی سبب وہ فارس اور شیراز کے ماحول، فضا اور حالات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب وہوا کی خوبی اور عمارات کی لطافت وخوش اسلوبی، باشندوں کے خیالات اور قوا پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علما وشعراء پاکیزہ طبع اور لطیف وظریف ہوئے ہیں۔'' [11]

اس طرح حالی سعدی کی ذات کی تشکیل کا بڑا سبب ماحول کو قرار دیتے ہیں اور سعدی کے ادبی کارناموں اور اخلاقی تعلیمات کو لطافت اور ظرافت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پھر بچپن میں والد کی زیر نگرانی غلطیوں کا استدراک اور بہتر تربیت بھی اسی ماحول کا حصہ ہیں، جس نے سعدی جیسے آزاد روشخص کو ساری ہی زندگی متوازن رکھا۔ تاتاریوں کے حملے سے شہر کی تباہی کے بعد نفسیاتی طور پر جمود کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ حالی اس کو ثابت کرنے کے لیے سعدی کا وہ مرثیہ پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مستعصم باللہ کے لیے لکھا تھا۔ دراصل یہ ایک شخص کا مرثیہ نہیں بلکہ پورے معاشرے اور سماج کی تباہی کا مرثیہ ہے۔ خود حالی کی زبان میں ''اسلام کا مرثیہ لکھا ہے'' دراصل حالی کے سامنے ہندوستان کے مسلمان تھے جو بالکل ایسے ہی دور سے گزر رہے تھے جیسے کہ مرثیے، اس شہر کی ہولناک کا ذکر ہے اور ان پر بھی نفسیاتی جمود طاری ہو چکا تھا۔ حالی کے لیے اس مرثیے سے بہتر اور کوئی واقعہ یا کلام نہیں ہوسکتا تھا۔ جس میں اس عہد کا قاری اپنی کیفیت درد کو محسوس کر سکے۔

حالی نے زیادہ تر ان واقعات کو ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن سے اخلاقی تعلیمات ملتی ہیں اور اصلاحی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ چونکہ حالی کا مدعا بھی یہی ہے کہ ان واقعات کے سہارے قاری کے ذہن اور فکر کو تبدیل کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ مثال کے طور پر حالی ایک جگہ لکھتے ہیں:

''شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے، عالم طالب علمی ہی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اس کے دل سے اتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا میں نے پوچھا کہ عالم اور درویش میں کیا فرق دیکھا جو اس طریقے کو چھوڑ کر، اس کوچے میں قدم رکھا؟ کہا: درویش صرف اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور علما یہ چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ، ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔''

[۱۲]

اس واقعے کا براہ راست شیخ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ وہ مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔لیکن چونکہ حالی کو اس واقعے کے ذریعہ عوام تک یہ پیغام پہنچانا تھا کہ تصوف کا جو ہندوستانی ذہنوں میں تصور ہے اس کا تعلق رہبانیت اور ترک دنیا سے ہے، جس میں انسان کی ذات خود اپنے آپ تک محدود ہو جاتی ہے جب کہ ضرورت اس بات کو سمجھنے کی ہے کہ زیادہ اہم شخص وہ ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کی دنیا بدل دے اور انہیں فلاح کا راستہ دکھائے اور یہ صلاحیت تحریک اور اضطراب کے ذریعہ ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

شیخ کی زندگی کے کم و بیش جتنے بھی حالات حالی کی دسترس میں آئے ہیں، ان کا تحقیقی نظر سے مطالعہ کیا اور ان تصانیف کی تحقیقی خامیوں کی نشاندہی بھی کی، جو حیات سعدی تحریر کرتے وقت ان کے سامنے تھیں۔ جیسے کہ سعدی کی اصل عمر کا تعین، سعدی شیرازی اور سعدی دکنی کے سلسلے میں مغالطہ، ہندوستان میں شیخ کی آمد کا مسئلہ۔

حالی عمر کے سلسلے میں تحقیقی بحث کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سعدی کی عمر تقریباً ۱۲۰ سال تھی۔ حالی الگ الگ مقام پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں، جس سے سعدی کے منطقی ذہن، نکتہ سنجی اور تحقیقی ذوق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''سر گور راوسلی نے اس کی ولادت ۵۸۹ ہجری ۱۳۳۳ء میں لکھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہے۔۔۔اس کی ولادت کا

سال کسی نے نہیں لکھا ۔صرف سالِ وفات سب نے لکھا ہے۔یعنی
سنہ ۶۹۱ ھ اور عمر ۱۰۲ یا ۱۱۰ یا ۱۲۰ برس کی بتائی ہے لیکن اس سے لازم آتا ہے
کہ ابولفرج ابن جوزی جو بغداد میں اس کا جلیل القدر اُستاد تھا، اس کی
وفات کے وقت، جو کہ قطعاً سنہ ۵۹۷ ھ میں ہوئی ہے، شیخ کی عمر نو برس
سے زیادہ نہ ہو اور یہ بالکل خلافِ واقع ہے، اسی لیے اس کی عمر ۱۰۲ برس
سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔'' ۱۳؎

آگے چل کر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور
اکثر نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی پچھلا قول صحیح
معلوم ہوتا ہے کیونکہ شیخ، جیسا کہ بوستان کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا
ہے، جوانی کے زمانے میں شیراز سے باہر گیا ہے اور بغداد میں اس نے
مدتوں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کیا ہے (کذا)۔امام ابن جوزی کی
وفات سنہ ۵۹۷ ھ میں ہو چکی تھی اور شیخ کی وفات اس سے ۹۴ برس بعد
واقع ہوئی پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو دس برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا
ہے کہ شیخ زیادہ سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام جوزی سے تحصیل علم کر چکا
تھا اور اگر ایک سو دو برس کی عمر قرار دی جائے تو لازم آتا ہے کہ وہ سترہ
برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا اور شیراز سے بچپن ہی کے
زمانے میں نکل گیا تھا۔پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے، اسی
طرح دوسری بات بھی خلاف واقع ہے۔'' ۱۴؎

حالی شیخ کی سیاحت پر گفتگو کرتے ہوئے سر گور اوسلی کے قول کی تردید کرتے ہیں ۔سر گور اوسلی کے نزدیک سعدی نے مختلف ملکوں کی زیارت کے ساتھ ہندوستان چار دفعہ آنے کی زحمت گوارا کی جس میں ایک بار اغلمش کے دور میں اور دوسری بار امیر خسرو سے ملنے دہلی تشریف لائے۔مگر حالی اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔وہ رقمطراز ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ مضمون بالکل بے سروپا ہے ۔اغلمش کوئی بادشاہ

ہندوستان میں نہیں ہوا۔شاید سلطان التمش کے دھوکے میں اغلمش لکھا گیا۔۔۔سعدی اورامیرخسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔'' ۱۵

اس کے علاوہ دولت شاہ سمرقندی نے سعدی کو عبدالقادر جیلانی کا مرید قرار دیا ہے جب کہ حالی کے نزدیک یہ بات درست نہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات بلکل غلط ہے کیوں کہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی وفات سنہ ۵۶۱ھ میں یعنی شیخ سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔'' ۱۶

اسی طرح وہ سرگوراوسلی کے حوالے سے پیش کردہ فرانس کے محقق ام۔گارسن ڈی ٹیسی کے قول کی بھی تردید کرتے ہیں کہ سعدی ریختہ میں اشعار کہنے والا پہلا شخص ہے۔بلکہ وہ اس مغالطہ کو بڑی خوش اسلوبی سے دور کرتے ہیں:

''۔۔۔یہ ایک مغالطہ ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے۔اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سعدی تخلص اس زمانے میں ہوا ہے۔جب کہ ریختے کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔یہ خیال کیا گیا ہے کہ اس کی وفات کو تقریباً چارسو برس گزرے ہیں۔کہتے ہیں کہ ریختے میں سب سے پہلے اسی نے شعر کہا۔'' ۱۷

اور پھر اپنی گفتگو کی دلیل کے طور پر وہ سعدی دکنی کے تین اشعار نقل کرتے ہیں تا کہ مزید مغالطے کی گنجائش نہ رہے۔دوسرے باب میں بھی وہ سٹیون کی پیش کردہ حافظ کی حکایت کو پیش کر کے اس خیال کو غلط قرار دیتے ہیں کہ حافظ اور سعدی کے درمیان ایک صدی کا فاصلہ موجود ہے اس لیے ان کا آپس میں اٹھنا بیٹھنا ممکن نظر نہیں آتا۔

ان تمام مثالوں کی روشنی میں حیات سعدی کا مطالعہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو کی پہلی ایسی سوانح عمری ہے جس کو جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جیسے کہ ڈاکٹر عبدالقیوم کے الفاظ میں:

''اردو میں یہ پہلی سوانح عمری ہے جسے طرز جدید کی سائنٹفک بیوگرافی کا
اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔'' ۱۸

حالی نے جس طرح تاریخی اور واقعاتی شواہد پر مدلّل گفتگو کرتے ہوئے اپنی بات کو ثابت کیا ہے اور بہت سی تحقیقی خامیوں سے پردہ اٹھا کر صحیح نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔اس کی مثال اردو سوانح میں نہیں ملتی۔اسی لیے شبلی جیسے سخت گیر نقاد کے سخت اصولوں کی کسوٹی پر بھی کھری اترتی ہے۔ان کے نزدیک یہ ایک:

''نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہیں۔'' ۱۹

ان تمام باتوں کے باوجود اس تصنیف کی ایک خامی جگہ جگہ نظروں کو کھٹکتی ہے۔وہ ہے واقعات اور سعدی کے اقوال کی حالی کے ذریعہ کی گئیں تاویلیں اور توجیہیں۔مثلاً سومنات کے مندر کا واقعہ جسے حالی نے پیش تو کر دیا ہے مگر خود الجھنوں میں گرفتار ہو گئے۔وہ اس حکایت میں صداقت اور اصل حقائق کی لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تاویل کر جاتے ہیں:

''شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنویں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا، صحیح ہو، مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعے کی تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی۔اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیے کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر، اصل واقعے سے دور جا پڑتا ہے۔'' ۲۰

اس دور کا مزاج امرد پرستی، شواہد بازی کی طرف مائل تھا۔سعدی خود بھی اپنی شاعری میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔حالی اس سے بخوبی آشنا ہوتے ہوئے خود کو سمجھانے کے لیے اس کی تاویل کرتے ہیں اور اس دور کے مزاج کا بھی ذکر کر دیتے ہیں:

''اگر چہ شیخ یا شعرائے ایران کے عاشقانہ اشعار سے، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، ان کی امرد پرستی اور شاہد بازی پر استدلال نہیں ہوسکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ گلستان کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور

نیز شیخ کے اکثر اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق ومحبت اس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت میں اس کو سادہ رخوں اور امردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔مگر اس بات کو میں کسی برے معنی پر محمول نہیں کرتا۔صوفیہ کے حالات جو نفحات وغیرہ میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عشق مجازی ، بہ شرطے کہ پاک اور بے عیب ہو، سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے۔'' [۲۱]

جب کہ مطائبات اور ہزلیات کے ذیل میں حالی کھل کر سعدی کی اس خصوصیات اور ذہانت کا اعتراف لغزش کے شکل میں کرتے ہیں اور اسے ''شیخ کے عارضی کمال پر ایک نہایت بدنما مسا'' قرار دیتے ہیں۔ یہاں حالی نے بشری تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ سعدی چونکہ ایک انسان تھے اور ان سے وہ غلطیاں سرزد ہوسکتی ہیں جو ایک بشر کے خمیر میں شامل ہیں۔ ماحول انسان کی تربیت کرتا ہے۔ غرض سعدی کی اس کاوش اور تربیت میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالی نے اگر جگہ جگہ تاویلوں سے کام نہ لے کر انسانی سطح پر سعدی کی ذات کا تجزیہ کیا ہوتا تو یہ بشری تقاضوں کو پورا کرنے والی عمدہ سوانح عمری ہوتی۔ اس موقع پر وہ قدرے جانب دار اور سعدی کے طرف دار ہو جاتے ہیں، جب کہ بحیثیت سوانح نگار کے انہیں غیر جانبدار اور معروضیت کا ثبوت دینا چاہئے۔مگر چونکہ سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک کا اولین مقصد معاشرے کی اصلاح اور ماحول کو سماجی برائیوں سے پاک کرنا تھا اور حیات سعدی اس تحریک کے زیر سایہ تربیت پا رہی تھی۔ اس لیے اس میں شیخ کا کردار ایک عام انسان کا نہیں ہوسکتا تھا۔جس سے موقع بہ موقع غلطیاں سرزد ہونے کے امکانات ہوں بلکہ شیخ ایک مثالی نمونے کے طور پر یہاں نظر آتے ہیں جن سے خوبیوں کی توقع بہت زیادہ اور خامیوں کی امید حد درجہ کم ہے۔

دوسرے باب میں شیخ سعدی کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔مختلف مشاہیر کی راس، شیخ کی نثر و نظم کی تصانیف کا تعارف کرایا ہے۔شیکسپیر کے کلام سے مماثلت، شیخ کے کلام کا موازنہ متعدد شعراء کے کلام سے کر کے، اس کی برتری ثابت کی ہے۔ اس حصے میں حالی کا تنقیدی شعور اپنے اصول وضوابط کے ساتھ سعدی کی تصانیف اور کلام کا تجزیہ کرتا ہے۔ حالی نے اول ''گلستان'' اور ''بوستان'' پر تبصرہ کیا اس کے علاوہ گلستان کا

باری باری عبدالرحمٰن جامی کی ''بہارستان''، مجدالدین کی ''خارستان'' اور حبیب قاآنی شیرازی کی ''پریشان'' سے تقابل کیا ہے، نیز گلستان کی جملہ صفات کی نشان دہی حکایتوں، اس کے جملوں، طرز ادا، حسن بیان، شگفتگی اور ظرافت سے کی ہے۔ ''سکندر نامہ'' اور ''خرابات'' کو بھی پیش نظر رکھ کر ''بوستان'' کی خوبیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ حیات سعدی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں حالی نے گلستان اور بوستان پر تبصرہ کیا ہے:

> ''ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب ولباب سمجھنا چاہیے ظاہراً فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھے سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور بڑھاپے تک ان کے مطالعے کا شوق رہتا ہے۔ لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے انھیں پڑھا۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے، مشائخ اور علما نے ان کی عزت کی، بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور العمل بنایا، منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت اور بلاغت کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔۔۔ اگر چہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، پند ونصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے۔ بعض وجوہ سے گلستان کو بوستان پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔۔۔۔ گلستان کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے۔ ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ گلستان کا اس قدر مقبول ہونا، سوا اس کے کہ فصاحت و بلاغت اور حسن بیان اور لطیف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور لا جواب تسلیم کیا جائے اور کسی وجہ پر محمول نہیں ہوسکتا۔'' ۲۲

حالی نے سعدی کے کلام، غزل، قصیدہ ، قطعہ پر تبصرہ وتنقید بھی کی ہے اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

اس کے بعد شیخ کے مطائبات و ہزلیات ومضحکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شیخ کی عربی شاعری سے بھی نمونے پیش کئے ہیں۔

آخر میں خاتمہ ہے، جس میں شیخ کے عام حالات اور اس کی عام شاعری پر اجمالی نظر اس طرح ڈالی ہے کہ شیخ کے عادات وخصائل، مذہب وتصوف، مزاج ومشاغل وغیرہ غرض زندگی کے قریب قریب ہر پہلو اور گوشے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ حالی کے الفاظ میں:

''اس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگی روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اس کو ''گریٹ مورلسٹ'' کہا ہے اور اسی وجہ سے اخلاقِ بشری کی تصویر جس عمدگی کے ساتھ اس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے، ویسی آج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھنچ سکی۔'' ۲۳

بہر کیف شیخ سعدی کی شخصیت اور اس کے کلام پر یہ تجزیات جو حالی نے حیات سعدی میں پیش کئے ہیں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اردو ادب میں ایسی پہلی کوشش ہے، جس میں کسی شاعر کی شخصیت اور اس کے فنی محاسن کا نئے انداز اور نئے طریقے سے تجزیہ کیا گیا۔ قدیم رویوں کو چھوڑ کر جدید طریقے اپنائے گئے ہیں۔ حالی سے پہلے اور حالی کے بعد سعدی کی شخصیت اور اس کے کلام پر ایسی مفصل ترین سوانح عمری لکھنے کا حق کسی سے ادا نہ ہوسکا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''جہاں تک کتاب کے جامع ہونے کا تعلق ہے حیات سعدی غالباً مفصل ترین سوانح عمری ہے۔ حالی کے بعد سعدی کے مضمون پر مولانا شبلی، پروفیسر براؤن اور فرانسیسی فاضل Masse تذکرہ نے بھی قلم اٹھایا ہے لیکن مقدم الذکر نے مفصل تذکرہ لکھنے کا دعویٰ ہی نہیں۔'' ۲۴

حیات سعدی کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالقیوم یوں رقم طراز ہیں:

''تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اردو میں یہ کتاب سعدی کی شخصیت اور کلام کا بہتر سے بہتر جائزہ ہے۔'' ۲۵

حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں حیات سعدی کے بارے میں یوں کہا ہیں:

''یہ سیرت، تحقیق، جامعیت، حسن ترتیب کے لحاظ سے اردو میں پہلی
تصنیف ہے۔'' ۲۶

جہاں تک حالی کے اسلوب نگارش کا تعلق ہے۔حیات سعدی میں حالی کی تحریروں کی سادگی، خلوص، دھیما پن، احتیاط، اعتدال، غیر جانبداری، کہیں کہیں بے ساختگی اور برجستگی، مرکب تشبیہات اور تمثیلات کا بہتر استعمال موجود ہے۔جس نے ان کی سلیس اور عام فہم زبان کو بھی لطیف اور پر اثر بنایا ہے۔وہ کہیں بھی اپنی ذات کو پیش نہیں کرتے ان کا یہ غیر شخصی رنگ ان کی سوانحوں کا بڑا وصف ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر میں:

''یہ کتاب اسلوب کے لحاظ سے جواں تر اور رعنا تر نظر آتی ہے۔تمثیلوں
اور طویل تشبیہوں کے سلسلے بڑی برجستگی سے ابھر رہے ہیں۔'' ۲۷

سلام سندیلوی حیات سعدی کے اسلوب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''حالی کی حیات سعدی اسلوب کے اعتبار سے بھی دلکش ہے۔انھوں نے
شیخ سعدی کی زندگی کے واقعات کو دلچسپ اور شگفتہ انداز میں پیش کیا
ہے۔'' ۲۸

## یادگار غالب:

غالب اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں۔انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی شاعری تھی۔غالب نے اس کو ذہن عطا کیا۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ فکر و احساس کے رنگا رنگ جلوے دکھائے۔ان کی شاعری مختلف و متضاد کیفیات کا مرقع ہے۔ہر مکتب فکر والوں کو اپنے اپنے مطلب کی بات کلامِ غالب میں مل جاتی ہے۔زمانہ کی رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری کو نئے نئے زاویوں سے پرکھا جا رہا ہے، اور اسی اعتبار سے اس میں نئے نئے مفاہیم سامنے آ رہے ہیں۔مختلف لوگوں نے مختلف زاویوں سے کلام غالب کی توضیح کی ہے۔یہاں تک کہ بعضوں نے خود غالب کے بتلائے ہوئے مفہوم سے بھی اختلاف کیا ہے۔غالب کے پہلے شعر کی یعنی:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سو سے زیادہ شرحیں کی گئیں ہیں مگر اتنی تشریحات کے باوجود بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔شعراء کے

تذکروں میں غالب کواس وقت سے جگہ ملنی شروع ہوگئی تھی جب ابھی وہ آگرہ چھوڑ کر دہلی نہیں آئے تھے۔مگر ان تذکروں میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔اس کے بیان میں تاریخی تسلسل برقرار نہیں رہ سکا۔آبِ حیات میں محمد حسین آزاد نے پہلی بار ان عیوب کو محسوس کیا اور اردو ادب کی نئے طرز سے تاریخ لکھی۔اس میں غالب کو بھی جگہ دی اور پہلی بار غالب کا سب سے مفصل تذکرہ آبِ حیات میں ملتا ہے، مگر غالب مداحین غالب کے متعلق آبِ حیات کے بیان سے مطمئن نہ تھے۔خود حالی کو احساس تھا کہ غالب کے ساتھ محمد حسین آزاد نے انصاف نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے ''یادگارِ غالب'' ۱۸۹۷ء میں لکھی ہے۔اس کے بعد سے غالب کے متعلق مضامین اور کتب کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اب تک جاری ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ اب تک غالب کے حالات اور ان کے کلام سے جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں کئی اعتبار سے سب سے بیشتر کتاب ''یادگارِ غالب'' ہے چنانچہ شیخ اکرام لکھتے ہیں کہ:

''حقیقتاً غالب کے متعلق مستقل کتابیں تین ہیں، یادگارِ غالب، محاسن کلامِ غالب اور ڈاکٹر لطیف کی کتاب۔ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے۔ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں بڑھا اور اگر چہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب میں اخذ حالات کے بہت سے قیمتی اصول درج ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔تنقیدی نقطہ نظر سے بھی غالب کی کوئی تبصرہ یادگار سے بہتر آج تک شائع نہیں ہوا .....شاید انگریزی تعلیم اور مغربی طرز تنقید کے پرستار بھی اس امر سے متفق ہونگے کہ تنقیدی نقطہ نظر سے بھی غالب کے متعلق بہترین کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو انگریزی سے قریب قریب نابلد تھا، یہ صحیح ہے کہ یادگارِ غالب پرانے اصولوں پر لکھی گئی ہیں۔اور جیسا کہ ڈاکٹر لطیف نے بتایا ہے اس میں کئی خامیاں ہیں، لیکن ابھی تک کوئی اور تبصرہ ایسا شائع نہیں ہوا جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔اور پھر یادگار کے مطالعہ سے وہ یک طرفہ اور غیر معتدلانہ رائے قائم ہونے کا کوئی احتمال نہیں جو اور کتابوں کے مطالعہ سے قائم کی جا سکتی ہے۔'' ۲۹

غالب ان چند خوش نصیب شعراء میں سے ہیں جن کی شخصیت اور فن کے ہر گوشے پر ایک صدی سے نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ان کی شخصیت اور فن کے بہت سے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں مزید کچھ اضافے کی گنجائش باقی نہیں ہے، یعنی غالب فہمی کا جو سلسلہ یادگارِ غالب ۱۸۹۷ء سے شروع ہوا تھا، وہ آج اپنے بامِ عروج کو پہنچ چکا ہے۔''یادگارِ غالب''ایک غالب شناسی کے سلسلے میں ایک اہم کارنامہ ہے ایک صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اسکی اہمیت میں کمی نہیں آئی، اس سے ایک فرمانبردار شاگرد کا اپنے استاد کو زبردست خراج عقیدت کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔غالب کے کلام کی تشریح وتوضیح کے سلسلے میں حالی کو اوّلیت حاصل ہے، یہ غالب فہمی کے سلسلے کا نقش اوّل ہے۔

حالی اپنے استاد کے فن کی عظمت کا نقش سب کے دلوں پر بٹھانا چاہتے تھے، وہ غالب کے فن کے اہم پہلوؤں پر زور دیتے ہیں، اس لئے ہر قدم پر غالب کی مدافعت کرتے نظر آتے ہیں۔حالی غالب کی ذاتی کمزوریوں کا کھل کر بیان نہیں کرتے، اُن کی نظر زیادہ تر غالب کے کارناموں پر رہتی ہے۔

حالانکہ بعض کا خیال ہے کہ حالی اپنے ممدوح کو آسمان پر چڑھا دیتے ہیں لیکن یہ بات حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔حالی کے ہاں ہمیں انصاف پسندی اور اعتدال بڑی حد تک نظر آتا ہے۔ جہاں وہ ممدوح کی خوبیوں کو اُجاگر کرتے ہیں وہی اس کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں وہ فطرتاً ایک ایسے نیک انسان ہیں جو بلا وجہ عیب جوئی کو پسند نہیں کرتے جہاں تک عیبوں پر پردہ ڈالنا ممکن ہو پردہ ڈالتے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جانبداری سے کام لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ''یادگارِ غالب''میں انہوں نے غالب کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کئے ہیں مثلاً جہاں''راقم اور غالب کا معاملہ''لکھا ہے، اور جس میں اپنی گستاخی دکھائی ہے۔اس میں اگرچہ حالی اپنی تنگ نظری اور تعصب کا ذکر کرتے ہیں مگر اسی کے ساتھ اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ غالب مذہب کے ظاہری احکام کے پابند نہ تھے۔آج یہ چیز قابلِ اعتراض نہ سمجھی جائے۔مگر اس وقت خصوصاً حالی جیسے پرہیزگار کی نظر میں باوجود ساری محبت اور عقیدت کے یہ بات قابل مذمت تھی۔لیکن حالی کی انصاف پسندی کا ثبوت ہے کہ وہ ظاہری مراسم مذہبی کو بہت ضروری سمجھتے وہ نورِ ایمان سے روشن دل کے فریفتہ ہیں۔جس میں انسانیت کے لئے سچا درد موجود ہو۔وہ غالب کے اس پہلو کو جگہ جگہ اجاگر کرتے ہیں

اس ''پوشیدہ ولی اور کھلے کافر'' کی ان کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔حالی غالب کی ظرافت کو بہت سراہتے ہیں۔بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق:

''یہ حالی کا طفیل ہے کہ ہم غالب کی سچی قدر کرتے ،اس کی یاد میں جلسے ترتیب دیتے ، اس کے کلام پر مضامین لکھتے اس کے دیوان کی شرحیں چھاپتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا ، یادگارِ غالب نے غالب کو زندہ کردیا۔'' ۳۰

ڈاکٹر صاحب کا مطلب صرف یہ ہے کہ حالی نے اپنے تنقیدی شعور کے ذریعے غالب کے کلام کا اس طرح جائزہ لیا جس سے ان کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔غالب اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ان کے کلام میں بڑی وسعت ، رنگا رنگی ،رنگینی و رعنائی ہے ،انہوں نے فکرو احساس کے رنگا رنگ جلوے دکھائے غالب کی حیات وشاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔مختلف زاویوں سے ان کے کلام کو پرکھا گیا۔تجزیہ کیا گیا، ان کی شاعرانہ عظمت کا نئے سرے سے جائزہ لیا گیا۔ان کی حیات کے مختلف گوشے ڈھونڈ نکالے گئے ،تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کی اہمیت کا پورے طور پر اعتراف نہیں ہوا ہے۔ان کی عظمت کو تسلیم کیا گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کے دور میں انہیں وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔اس میں اس دور کے مذاق شعری کا دخل ہے۔اور کسی حد تک غالب کا قصور بھی ہے۔غالب خود اپنے اردو کلام سے زیادہ فارسی کلام کو پسند کرتے تھے،وہ فارسی کلام کو اپنے حقیقی کمالات کا مظہر سمجھتے تھے۔اردو کلام کو بے رنگ مجموعہ سمجھتے تھے۔وہ خود کہتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　　　بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن غالب کو اردو ادب میں جو مقام و مرتبہ ملا ہے، وہ اسی بے رنگ مجموعہ کی بدولت ہے۔

غالب کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے عہد میں ان کی قدر و منزلت ان کے ادبی مرتبے کے مطابق نہیں ہو رہی ہے۔اس دور میں ذوق کا طوطی بولتا تھا،عوام وخواص میں ذوق کا رنگ سخن بے حد مقبول تھا۔لیکن غالب کے کلام کو پسند کرنے والے بے حد کم تھے، وہ اپنی مشکل پسندی کی وجہ سے مہمل گو مشہور ہو چکے تھے،لوگ ان سے آسانی کہنے کی فرمائش کرتے تو وہ ذہنی کشمکش کا شکار ہوتے تھے،وہ ایک رباعی میں کہتے ہیں:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ایک اور شعر میں کہتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

محمد حسین آزاد کا تذکرہ آبِ حیات ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا، اس میں اُنہوں نے ذوق کے محاسن کلام کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور انہیں غالب پر ترجیح دی ہے۔ ذوق کی ستائش میں بے حد طرفداری سے کام لیا ہے۔

بقول شیخ محمد اکرام:

''جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ کمزور نظر آیا دلائل کی کمی کو انشاء پردازی کے زور سے پورا کیا۔ غالب کے کمالات کا ذکر سرسری طور پر کر دیا۔'' [۳۱]

آغا جان عیش نے ایک مشاعرہ میں غالب کی مشکل پسندی کو ہدف ملامت بناتے ہوئے کہا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ تھا وہ پس منظر جس نے حالی کو ''یادگارِ غالب'' لکھنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے غالب کے کلام کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کا حقیقی مقام دلانے کی سعی کی، ان کی شاعرانہ عظمت کو اُجاگر کیا۔

بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''یادگار غالب کی اشاعت کے بعد غالب فہمی عام ہوئی اور لوگوں میں ان کے کلام کے مطالعے کا ذوق بڑھا۔ ان کی نفسیاتی ژرف بینی اور حکیمانہ مزاج نے ایک عالم کو مسخر کیا۔ جوں جوں غالب سے شغف بڑھتا گیا مرزا کی شخصیت اور شاعرانہ کمال پر مستقل تصانیف بھی لکھی جانے لگیں۔ اور جس قدر مشہور و مقبول کتابیں غالبیات کے سلسلے میں نظر آتی ہیں وہ سب سے یادگار غالب سے متاثر ہیں۔ اس سلسلے میں تین کتابوں کو شہرت حاصل ہوئی۔ مولانا غلام رسول مہر کی ''غالب'' شیخ محمد اکرام کی ''غالب

نامہ'' اور مالک رام کی ''ذکر غالب''۔پہلی اورآخر الذکر حالات زندگی
کے سلسلے میں ''یادگار غالب'' کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔'' ۳۲

حالی پہلے شخص ہیں جس نے غالب کی حقیقی عظمت پر توجہ دی اور ''یادگارِ غالب'' لکھی ،آپ چاہیں تو اُسے آبِ حیات کا جواب کہہ سکتے ہیں۔'یادگارِ غالب' غالب کی اولین سوانح عمری ہے۔سوانح عمری سے بڑھ کر ایک یادگار تنقیدی کارنامہ ہے۔بیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ غالب کے شاگرد ہونے کے باوجود حالی نے اپنے استاد کی عموماً بے جا طرفداری نہیں کی وہ طبعاً میانہ روی اختیار کرتے پس اپنی بعض خامیوں کے باوجود اسے لکھے گئے دیگر سوانح اور تنقیدی کتب پر فضیلت حاصل ہے۔

حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کی زندگی اور شخصیت کی کامیاب عکاسی کی ہے،ان کی شاعری اور نثر نگاری کا جائزہ لیا ہے۔حالی نے یادگارِ غالب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔یادگارِ غالب سوانح کے اعتبار سے کس قدر تشنہ معلوم ہوئی کتاب کا صرف ایک چوتھائی حصہ سوانح سے متعلق ہے۔انہوں نے حالاتِ زندگی تفصیل سے نہیں پیش کی۔اس میں حیاتِ غالب کے اہم سال ترتیب و تسلسل کے ساتھ نہیں ملتے ،کئی اہم واقعات پر انہوں نے کھل کر روشنی نہیں ڈالی، پہلا حصہ ان کی زندگی کے واقعات و حادثات کو پیش کرتا ہے جس میں تاریخ ولادت ،خاندان ،مسکن ،سفر کلکتہ اور اہل کلکتہ سے مجادلہ ،قیام لکھنو ،ملازمت سے انکار ،قید ہونا ،قلعہ سے تعلق ،وظیفہ ،قاطع برُہان اور اس کا تنازع اور دیگر علوم وفنون کی واقعیت سے بحث ہے۔مرزا کی شخصیت یعنی ان کے اخلاق وعادات ،رہن سہن ،خورد ونوش ،مزاج وطبیعت ،دوست احباب ،استاد وشاگرد ،تصانیف نثر و نظم اور بیماری اور وفات کے ذکر پر مشتمل ہے۔جس میں ان کے وسعت اخلاق ،شوخی بیان ،مروت وخودداری پر خاص زور دیا گیا ہے۔درمیان میں چھوٹے چھوٹے پُر مزاح واقعات کا سہارا بھی لیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اکثر و بیشتر فارسی اشعار کو بعض واقعات کے سیاق وسباق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔حالی خود لکھتے ہیں:

''پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات جہاں تک معلوم ہو سکے ،اور
ان کے اخلاق وعادات وخیالات کا بیان ہے۔انھیں حالات کے ضمن
میں ان کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں

اوران کے لطائف ونوادر، جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہراوران کی
امیجینیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے، اپنے اپنے موقع پر
ذکر کیے گئے ہیں۔'' ۳۳؎

اس کتاب کا دوسرا حصہ مرزا کے منتخب کلام اردو فارسی نظم ونثر پر ایک مکمل جامع اور بسیط تنقیدی تبصرہ ہے۔ مولانا نے بلند پایہ شاعروں سے ان کے کلام کا موازانہ اور تقابل بھی کرایا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر ایک مختصر تبصرہ مرزا کی حیات اور انشاپردازی پر موجود ہے۔ جسے حاصل کلام کا درجہ حاصل ہے۔ چونکہ ہمیں یہاں حالی کی سوانح نگاری پر بحث کرنا مقصود ہے۔ اس لیے دوسرے حصے پر گفتگو کی جائے گی ۔آ ئے دیکھتے ہیں، حالی نے کس مقصد کے تحت یادگارِ غالب لکھی ۔ یادگارِ غالب کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ دیکھیں آخر کار حالی کو یادگارِ غالب لکھنے کا خیال کیوں آیا۔ حالی لکھتے ہیں کہ:

''مرزا کی لائف میں کوئی مہتم بالشّان واقعہ ان کی شاعری اور انشاء
پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے
متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں ان کو ضمنی اور استطر ادی سمجھنا چاہیئے۔
اصل مقصد اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا
لوگوں پر ظاہر کرنا ہے، جو خدائے تعالی نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا
تھا اور جو کبھی نظم ونثر کے پیرایہ میں کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں
کبھی عشق بازی اور رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حبِ اہل
بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکران چاروں باتوں سے علاقہ
نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیئے ۳۴؎

وہ مزید کہتا ہے کہ:

''اگر چہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام انکی شاعری اور انشاء پردازی
کے سوا نظر نہیں آتا۔ مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارلخلافے
کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنادیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس
کے مطابق ملک میں مرزا پر فارسی نظم ونثر کا خاتمہ ہوگیا، اور اردو نظم ونثر پر

بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے،اسی لئے کبھی کبھی مجھ کواس بات کا خیال
آ تا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے
معلوم ہوسکیں اور انکی شاعری اور انشاء پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطہ
بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں،ان کو اپنے
سلیقے قلمبند کرو۔'' ۳۵

حالی کی اس گفتگو سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کی حیات کے واقعات اور جزئیات کی تفصیل پیش کرنا حالی کا مقصود نہیں بلکہ ان کی شاعرانہ عظمت اور ادبی قدر و قیمت کی وضاحت مقصود ہے۔اسی وجہ سے کتاب کا وہ حصہ جو حیات پر مشتمل ہے انتہائی مختصر ہے۔مگر حالی چونکہ بخوبی واقف تھے کہ ایک سوانح کو کیسا ہونا چاہئے اور غالب کی پوری شخصیت میں اس بات کے زیادہ امکانات تھے کہ ان کی ایک دلچسپ، دلکش اور تفصیلی سوانح لکھی جائے۔حالی یادگار غالب لکھنے کی ضرورت اور اہمیت،اس وجہ سے بھی سمجھتے تھے کہ:

''اگر چہ مرزا کی لائف ۔۔۔ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک
بیوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں: لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کی
جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی
اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ
کم ضروری نہیں ہے۔'' ۳۶

حالی نہ صرف حالات وکوائف، حیات غالب لکھ کر، سوانح عمری میں اضافہ کیا بلکہ وہ کلام غالب کے محاسن سے بھی ادبی دنیا کو روشناس کرا کر نقد و شعر کی اہمیت اور غالب کی مقبولیت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے، ان کا یہ مقصد بدرجہ اتم پورا ہوا، غالب اور ان کے کلام کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، یادگار غالب کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے۔یادگار غالب کے لئے حالی نے جن افراد سے معلومات اخذ کی تھیں اس کا تذکرہ دیباچے میں خود کیا ہے:

''میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور
جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، ان کو
قلمبند کیا۔اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی

معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا۔'' ۳۷

اسی بیان میں آگے لکھتے ہیں:

''میں نے دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انہوں نے مہربانی
فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم
ہو سکے لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں
تک کہ اس کی تکمیل ہو سکتی تھی مکمل کی گئی۔'' ۳۸

اسی لئے حالی نے اس تصنیف کے لیے جن بنیادی ماخذ کو وسیلہ بنایا ہے، نہایت صاف گوئی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔ حالی کو غالب کے ساتھ ایک عرصے سے شاگردی نصیب رہی۔ اس صحبت نے ہی اس تصنیف کو، خود غالب کی شخصیت کو اور ان کے کلام کی اہمیت کو اس طرح اجاگر کر دیا کہ اس سے قبل اور اس کے بعد کوئی دوسری تصنیف اس درجہ کو نہ پہنچ سکی۔

یادگارِ غالب مرزا کے ابتدائی حالات سے شروع ہوتی ہے۔ حالی نے مرزا کے خاندان پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب تورابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ اس طرح حالی نے غالب کی خاندانی عظمت کو واضح کیا ہے۔ بقول سلام سندیلوی:

''حالی کے بعد دیگر مصنفین نے بھی غالب کے خاندان سے بحث کی
ہے۔ مثلاً مالک رام نے ''ذکر غالب'' میں شیخ اکرام نے ''حیات غالب
'' میں اور پرتھوی راج نے ''فکر غالب'' میں غالب کے خاندان سے
بحث کی ہے۔ اور خواجہ قمرالدین راقم نے تو ایک مضمون میں غالب کا پورا
نسب نامہ پیش کر دیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں اولیت کا سہرا حالی ہی کے سر
ہے۔'' ۳۹

حالی نے غالب کے عبدالصّمد سے فیض شاگردی کا بیان بھی کیا ہے۔ غالب کے پہلے استاد آگرہ کے نامی معلم شیخ معظم ہیں۔ شیخ معظم کے بعد غالب نے فارسی زبان کے ایک پارسی نژاد عبدالصّمد نامی شخص سے سیکھی جس کا پہلا نام ہرمزد تھا اور بعد میں مسلمان ہونے کے عبدالصّمد رکھا گیا۔ حالی لکھتے ہیں:

''غالباً آگرے میں سیّاحانہ وارد ہوا، جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس

اوّل آگرہ میں اور پھر دہلی میں مقیم رہا، مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی، اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے'' مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں اور عبدالصّمد ایک فرضی نام ہیں۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا ہے'' مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصّمد فی الواقع ایک پارسی نزاد آدمی تھا اور مرزا نے اسے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہیں اور اس کو بالفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہیں یاد کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصّمد ان کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی، اور کس قدر قلیل مدّت اس کی صحبت میں گزری، تو عبدالصّمد اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لئے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔'' [۴۰]

اس بیان میں تضاد ہے۔ عبدالصمد کا وجود تھا یا نہیں، اس سے قطع نظر اس باب میں حالی کا اپنا بیان قابل غور ہے۔ اس جگہ حالی حتمی فیصلہ نہ کر سکے کہ عبدالصّمد کا وجود غالب کی ذہنی اختراع ہے یا اس کا کوئی حقیقی وجود بھی تھا۔ کیونکہ وہ ایک طرف غالب کی فارسی دانی پر ملاّ عبدالصّمد کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ غالب کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ غالب کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں۔ البتہ قاضی عبدالودود نے مستند دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبدالصّمد کا وجود محض غالب کا ذہنی اختراع ہے۔ درحقیقت اس کا کوئی حقیقی وجود نہ تھا، قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا اور نہ اردو کلام، یہ جو مرزا صاحب عبدالصمد کو اپنا استاد لکھتے ہیں۔ اس شخص کا وجود ذہن میں تھا خارج میں نہ تھا۔'' [۴۱]

اور سلام سندیلوی نے تو یہ تک کہاں ہے:

''غالبًا حالی نے غالب کی فارسی دانی کو اور زیادہ مستند کرنے کے لیے عبدالصمد کی استادی پر زور دیا ہے۔ ورنہ غالب نے بذات خود عبدالصمد کو ایک فرضی شخص تصور کیا ہے ۔اور یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ عبدالصمد صرف غالب کے دماغ کی پیداوار ہے۔'' [۴۲]

انسانی فطرت میں یہ بات قدرتی طور پر شامل رہتی ہے کہ وہ ایک قابل اطمینان زندگی بسر کرے۔ اور اپنے عہد سے اس سماجی انصاف کا طالب ہو جو اسے اس کا حق دلا سکے۔ غالب کی زندگی میں سماجی زندگی کے بہت سے ایسے موڑ آئے کہ جب انھیں محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ اس صورت حال نے انھیں ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور وہ اس کشمکش کا کوئی مناسب حل بھی تلاش کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں بھی حالی نے ان کی سوانح عمری لکھتے وقت ان حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کے باعث، غالب ہر اس صورت کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے جو انھیں ایک بہتر سماجی زندگی دینے کی ضامن بن سکے۔ اسی لئے انھوں نے غالب کی زندگی میں پیش آنے والے ان بہت سے واقعات کا ذکر کیا ہے جو غالب کے حالات کو بہتر نہیں ہونے دے رہے تھے۔

غالب نے اپنی زندگی میں جو سب سے طویل سفر کیا وہ دہلی سے کلکتہ کا تھا۔ کلکتہ کے قیام کے دوران حامیاں قتیل سے غالب کے مباحثے نے مجادلہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں حالی نے ان کی فارسی مثنوی باد مخالف کے بہت سے اشعار بھی نقل کر دیئے ہیں اور اہل کلکتہ سے غالب کی مخالفت اور ذہنی پریشانی کا ذکر کیا ہے۔ یہاں انھوں نے اہل کلکتہ سے مجادلہ کی تفصیل پیش کرنے کے بجائے اجمالاً ذکر کرتے ہوئے مثنوی باد مخالف کے مختلف مقامات سے کچھ اشعار نقل کر دیئے ہیں جس کو پڑھ کر پورے واقعہ کا علم قاری کو ہو جاتا ہے۔ غالب کے قیام لکھنؤ کا بھی ذکر کیا۔ ایام غدر میں غالب کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑا خصوصیت کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی موت سے ان کو جو صدمہ ہوا ان پر حالی نے روشنی ڈالی ہے۔

حالی نے غالب کی سیرت کے اہم پہلوؤں کو اُبھارا ہے اس کے ساتھ ساتھ جہاں غالب کی اچھائیوں کا ذکر کیا ہے وہیں غالب کی کمزوریوں کا بیان بھی کر دیا ہے۔ اس طرح خانگی معاملات کو بھی پیش کیا ہے۔ حالی نے

واضح طور پر لکھا ہے کہ:

''مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی، اور چوسر جب بھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔حالی نے اس موقعہ پر خود غالب کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے کہ'' کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجود یہ کہ مجسٹر یٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔'' ۴۳

جب کہ اصل واقع یہ ہے کہ کوتوال غالب کا دشمن نہ تھا۔ان کے یہاں چند رئیس زادے شطرنج کھیلنے کے لئے آتے تھے۔قمار بازی عام ہوگئی تھی اور ان کو بطور مہتمم قمار خانہ سے ہر بازی میں کچھ نہ کچھ روپیہ ملتا تھا اس طرح اچھی خاصی رقم بے محنت ومشقت وصول ہو جاتی تھی وہ خود ایک اچھے کھلاڑی تھے اس میں کچھ نہ کچھ کما لیتے تھے۔ایک عرصے تک غالب کے حکام سے اچھے تعلقات رہے۔لیکن جب آگرہ کا ایک کوتوال تبدیل ہو کر آیا اور اس نے سختی سے دیکھ بھال شروع کی اور خاص وقت پر ان کے مکان پر دھاوا بولا، کچھ لوگ عقب سے فرار ہو گئے مگر غالب دھر لئے گئے، کچھ لوگ روپیہ پیسہ دے کر بچ گئے مگر غالب کے پاس روپیہ نہ تھا، سفارش کروائیں مگر کام نہ آئیں۔

حالی نے غالب کی تصنیف قاطع برہان کا بھی ذکر کیا ہے۔قاطع برہان کا وجود محمد حسین تبریزی کی مشہور لغت برہان قاطع پر اعتراضات کی شکل میں آیا۔ جب غالب نے برہانِ قاطع پر اعتراضات کئے تو غالب کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔حالی نے غالب کے اعتراضات کو درست قرار دیا ہے، اور برہانِ قاطع کو غلط ٹھہرایا ہے۔حالی لکھتے ہیں کہ:

''جو اعتراض مرزا نے برہان پر وارد کئے ہیں ان کو بھی جا بجا فرہنگ ناصری سے تائید ہوتی ہے۔ازاں جملہ لفظ آبچیں، استخر واصطخر، جمدر، باختر، راوش، زاوش، کارکیا، ویژہ وادیژہ، اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرہنگ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی

ہے۔'' ۴۴؎

فرہنگ ناصری سے ہی مرزا غالب کا بیان درست ثابت نہیں ہو سکا بلکہ اس کے مصنف رضا قلی خان نے برہان قاطع پر راست چوٹ کرتے ہوئے اس کے بیان کو مہمل بتایا ہے۔لفظ انجلک کی تفصیل میں برہان نے لکھا ہے کہ:

''ہر چند فراش خیال جاروب سنبل برحل خرسک ریش زنداز پوست آں پاک نتوانذ'' ۴۵؎

رضا قلی خان از راہِ طنز اسی فقرے پر یہ لکھتے ہیں:

''دریں مقام ایں انشائے بدیع و بیان بلیغ زادہ طبع ایشاں بودہ۔برہان ذوق سلیم وسلیقہ مستقیم صاحب برہان خود ہمیں عبارات بس است، تاازیں سپس 'از وچہ آید'' اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کر کے اُس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ ''درولایت ہند کہ نہ ترکی دانندو نہ پارسی ضبط وتصیح لغات فارسی توانند۔'' ۴۶؎

بہر حال رضا قلی بھی کئی جگہ صاحب برہان پر طنز کرتا ہے۔اس لغت کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ بغیر سند اور شواہد کے ہیں۔لہٰذا اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے مگر حقیقت یہ ہے کہ قاطع برہان پر بعض اعتراضات صحیح نہیں ہیں غالب سے بھی چوک ہوئی ہے۔ان سے بھی فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔حالی نے اُن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہی غالب کی سلامتی طبع اور ذوق صحیح کی تعریف بھی کی ہے۔حالی لکھتے ہیں کہ:

'' اگر چہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں،خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق بڑی فاحش غلطی کی ہیں کہ اس کو لفظ عربی الاصل ما خوذ از اسف قرار دیا ہے۔اور اس غلطی کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہیں،اور ممکن ہیں کہ اس کے سوا اور بھی کہیں کہیں ان سے غلطی ہوئی ہو۔لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتی طبع اور ذوقِ صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے۔'' ۴۷؎

حالی نے ''یادگار غالب'' میں جہاں جہاں غالب کی شخصی حالات لکھے ہیں وہاں وہاں ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے جن سے ان کی شخصیت اہم بن سکے۔ حالی نے غالب کی شخصیت کو بے حد خلیق، دوست نواز اور خوش اخلاق انسان بتانے کی کوشش کی ہے۔ ایسا کر کے حالی نے واقعی غالب کی بے جا تعریف نہیں کی ہے، بلکہ ان کے ان اوصاف کو گنوایا ہے، جو ان کی شخصیت کے اندر موجود تھے۔ اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں:

> ''مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا، بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ان سے ایک دفعہ ملنے آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوشی اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے ان کے دوست ہر ملّت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں، بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔'' ۴۸

اس قول سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ غالب سراپا اخلاق تھے۔ دوستوں کے دلدادہ تھے۔ ان سے مل کر باغ باغ ہو جاتے تھے ان کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے، ان کے دوستوں کا دائرہ وسیع تھا، جو صرف دہلی ہی نہیں سارا ملک اور صرف مسلمان ہی نہیں سارے برادران وطن تھے۔

حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ غالب میں مروّت ایسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی کہ جب ان کی بینائی کم ہوئی اور ہاتھ میں رعشہ ہو گیا مگر پھر بھی احبابِ قصیدہ، غزل وغیرہ اصلاح کے لئے بھیجتے تھے۔ اس پر حالی کا یوں اظہارِ خیال ہے کہ:

> ''مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا، باوجود یہ کہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے؟ با ایں ہمہ، کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔'' ۴۹

اس سے بڑی مروت اور کیا ہو سکتی ہے کہ بینائی کمزور ہونے کے باوجود وہ دوست واحباب کے کلام کو دوسروں سے پڑھوا کر اصلاح دیتے تھے۔ غالب کی خوش مزاجی، ظرافت، خودداری، حق پسندی اور راست گفتاری اُن کے مصائب، ان کی خوراک، ناؤ نوشی، اور دوسرے مشاغل کا بیان بھی اختصار اور جامع انداز میں

کیا ہے۔حالی نے غالب کے مذہب پر بھی روشنی ڈال کر ان کے مسلک کو واضح کیا ہے:

> ''اگر چہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا،مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔'' ۵۰؎

حالی نے یادگار غالب میں یہ واضح کیا ہے کہ مرزا غالب جہاں ایک صحت مند نظریہ حیات رکھتے تھے وہی وہ اپنی صحت کی جانب سے بھی غافل رہنا انھیں پسند نہیں تھا۔انھیں فطری طور بھی اچھی غذا کھانے کا شوق تھا۔اس سلسلے میں بھی ان کا ذوق سب سے جدا تھا اور وہ بغیر مرغوب غذا کے دستر خوان تک نہیں جاتے تھے۔حالی نے ان کی اس عادت کا ذکر''یادگار غالب''میں اس طرح کیا ہے:

> ''مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوااور کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے، یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شوربہ نہیں کھایا۔اخیر میں ان کی خوراک بہت کم ہوگئی تھی۔صبح کو وہ اکثر شیرہ بادام پیتے تھے۔دن کو جو کھانا ان کے گھر سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ایک پیالے میں بوٹیاں اور دوسرے میں لعاب یا شوربہ۔ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربہ میں ڈوبا ہوا ایک پیالی میں دوتین پیسہ بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب،بس اس سے زیادہ ان کی خوراک اور کچھ نہ تھی۔'' ۵۱؎

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حالی نے غالب کی جس خوراک کا ذکر کیا ہے وہ کسی مفلس یا تنگ دست انسان کی خوراک کبھی نہیں ہوسکتی تھی۔بلکہ وہ ایک اچھے اور کھاتے پیتے گھرانے کے انسان کی خوراک سے کچھ کم نہیں ہوسکتی۔اور حالی نے کھانے کی جو مقدار بتائی ہے وہ غالب کے دورِ انحطاط میں خوراک کی مقدار ہے۔جو ایک ضعیف اور بوڑھے شخص کے لئے کسی بھی طرح کم نہیں سمجھی جاسکتی۔

حالی نے ایک سے زیادہ مقامات پر غالب کی کمزوریوں کی جانب پوری صداقت کے ساتھ اشارے کیے ہیں اور ان کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے کمزوریوں کی جانب

جہاں بھی اشارے کیے ہیں وہاں قلم میں شدت بالکل نظر نہیں آتی۔اس طرح حالی نے غالب کی شراب نوشی کا ذکر بھی کیا ہے۔اور لکھا ہے کہ:

''مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی ۔۔۔۔اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے،دوسرے اس میں دو تین گلاب ملا لیتے تھے۔جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔''

۵۲

حالی نے یادگارِ غالب کے حصّے اوّل میں جس چیز کو خاص اہمیت دی ہے،وہ ہے غالب کی خوش مزاجی اور شگفتہ طبعی۔ان کا تذکرہ بار بار کیا ہے اس کی وجہ بقول حالی یہ ہے کہ:

''ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو،ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں ہیں اس کے سوا ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت ایسے انسان شاذ و نادر پیدا ہوئے ہیں جن کی ذات سے (اگر چہ قوم کو براہ راست کوئی متعد بہ فائدہ نہ پہنچا ہو) لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ،کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو۔ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا یا ورکس میں چھان بین کرنی اور ان کے نوادر افکار سے مستفید ہونا قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔'' ۵۳

غالب کی زندگی ایسی مثالی نہ تھی کہ وہ تازیانہ عبرت کا کام کرتی،یا قوم کی رگِ حمیت کو بیدار کرتی،اس لئے حالی نے غالب کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کو نمایاں کیا ہے۔ان کے کارناموں کو زیادہ اہمیت دی اور اور اس کی توجیہ بھی کر دی۔حالی نے غالب کے بہت سے لطیفے پیش کئے ہیں۔جن سے غالب کی زندہ دلی اور شگفتگی پر روشنی پڑتی ہے:

''ایک روز میر مجروح بیٹھے تھے،اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے میر مہندی پانوں دابنے لگے مرزا نے کہا:''بھئی تو سیّد زادہ ہے،مجھے

کیوں گنہگار کرتا ہے''؟ انہوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے
تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا، مرزا نے کہا 'ہاں اس کا مضائقہ نہیں'
جب وہ پیر داب چکے، انہوں نے اُجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا ''بھیا
کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پانوں دابے۔ میں نے تمہارے پیسے
دابے، حساب برابر۔'' ۵۴

''جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے صاحب کے مکان میں
آکر رہے تھے۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے، کسی نے آکر قید سے
چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ مرزا نے کہا'' کون بھڑوا قید سے چھوٹا
ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔'' ۵۵

مرزا غالب کا ایک اور لطیفہ ملاحظہ فرمائے:

''ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہ ٹھیک
دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی
کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا
بھی وہیں پہنچے، اور مرزا کو چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ''ہم نے
حدیث میں پڑھا تھا کہ'' رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر
آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا''۔ مرزا نے کہا ''قبلہ
حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید
رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔'' ۵۶

حالی نے غالب کی تقریظ نگاری کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک خوددار انسان تھے، اس لئے
وہ تقریظہ میں خوش آمد سے کام نہ لیتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تفتہ کو صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ:

''وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں کہ بالکل بھاٹوں کی
طرح بکنا شروع کردوں۔'' ۵۷

حالی نے غالب کے خانگی تعلقات پر دھندلی سی روشنی ڈالی ہے، انہوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ
غالب کی طبیعت میں شوخی وظرافت کا عنصر زیادہ تھا، اس لئے ان کی زبان وقلم سے بیوی کی نسبت اکثر ایسی

باتیں نکل جاتی تھیں جن کو نا واقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔حقیقت اس کے برعکس ہے۔بقول سلام سندیلوی:

''دراصل حالی یا تو غالب اور امراؤ بیگم کے ناخوشگوار تعلقات کو محسوس نہیں کر سکے یا پھر عمداً پردہ پوشی کی ۔۔۔ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غالب اور امراؤ بیگم کے تعلقات میں کافی کشیدگی تھی۔'' ۵۸

اگرچہ عہد حاضر کی تحقیقات نے یادگارِ غالب کے بہت سے واقعات کی تردید کی ہے، حالی کی تحقیقی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کیا ہے، خصوصیت کے ساتھ شیخ محمد اکرام، مالک رام اور غلام رسول مہر نے غالب کی حیات پر اچھا مواد فراہم کیا ہے کہ یادگارِ غالب کے بیشتر بیانات تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ حالی نے غالب کی رفاقت سے کوئی خاص فائدہ نہیں اُٹھایا۔حقیقت میں کسی معاصر کی سوانح لکھنا آسان کام نہیں، کیونکہ سوانح نگار کو اس کے مخالفین کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، اور موافقین کا بھی۔اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ حالی حیات سے زیادہ غالب کے کارناموں کی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے تھے، تاکہ غالب کا حقیقی مقام لوگوں کے سامنے آسکے۔حالی نے عقیدت کے باوجود بڑی حد تک انصاف سے کام لیا ہے۔

حالی نے غالب کے سوانح میں یہ اہتمام کیا ہے کہ واقعات کے ساتھ ساتھ حسب موقع، غالب کے اشعار، لطیفے، ان کی شوخی و بذلہ سنجی اور ظرافت سے عبارت کو انتہائی دلکش بنادیا ہے۔بقول سلام سندیلوی:

''حالی نے غالب کی جیتی جاگتی زندگی ہمارے سامنے پیش کردی ہے۔ انھوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کر کے غالب کو ایک زندہ شخصیت کا درجہ دے دیا ہے۔غالب کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کو واضح کرنے کے لیے حالی نے غالب کے بہت سے لطیفے پیش کیے ہیں جن سے غالب کی شخصیت اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔'' ۵۹

یادگار غالب کی بدولت، غالب کی شہرت ومقبولیت میں اضافہ ہوا، یادگار غالب کی وجہ سے سوانح نگاری اور تنقید دونوں میں اہمیت وانفرادیت حاصل ہوئی۔ڈاکٹر صفدر حسین کے نزدیک:

''جس کتاب نے انھیں سوانح نگاری کی دنیا میں مقبول بنایا وہ یادگار غالب ہے حالی کا انفرادی طرزِ تحریر اور غالب کی جیتی جاگتی تصویر دونوں

اس میں جلوہ گر ہیں۔اس کے تنقیدی حصے کی اہمیت آج بھی محسوس ہوتی
ہے۔'' ۶۰؎

یادگارِغالب کا اصل اور یادگار حصّہ، حصّہ دوم ہے۔جس میں حالی نے غالب کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ان کے کلام کی اہم خصوصیات اجاگر کی ہیں اور ان کی مناسبت سے اشعار پیش کئے ہیں۔مزید ان کی تشریح بھی کی ہے۔وہ چار خصوصیتیں ۱۔جدت خیال یا نرالا پن ۲۔استعارات و کنایہ و تمثیل ۳۔شوخی وظرافت ۴۔اشعار کا پہلو دار ہونا۔غالب کے کلام میں یہ چار خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔حالی کے تنقیدی شعور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کلامِ غالب کے ان چار خصوصیتوں کی وضاحت بڑی بصیرت سے کی ہے۔مولانا حالی سے باقاعدہ طور پر کلامِ غالب پر تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔حالی نفسِ شاعری پر غور کرتے ہوئے سماجی شاعری میں رونما ہونے والی تاریخی وسماجی تبدیلیوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

حالی نے غالب کے تمام کلام کو چار حصوّں میں، نظم اردو، نثر اردو، نظمِ فارسی، اور نثر فارسی میں تقسیم کر کے اسی ترتیب سے ہر قسم کے تحت انتخاب بھی درج کیا ہے اور ہر قسم پر روشنی بھی ڈالی ہے۔حالی نے غالب کے جو اشعار شرح طلب سمجھے ان کی توضیح کر دی، اور آخر میں حالی نے غالب کے کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ سے کر کے غالب کے کمالِ فن کا اظہار کیا ہے۔اس سے حالی کا مقصد غالب کے کمالِ فن کی اہمیت کا احساس دلانا نیز فارسی نظم ونثر میں غالب کے کمال کو اجاگر کرنا ہے۔حالی کو اس بات کا احساس تھا کہ ''مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے وہ ان کی فارسی نظم ونثر میں ہے''۔اس سلسلے میں سید عبداللہ نے اپنے مضمون باعنوان ''غالب دوزبان شاعر'' میں لکھا ہے کہ:

> ''تسلیم شدہ حقیقت یہ ہے کہ غالب اردو شاعری اظہار وابلاغ کی کامیابی کے اعتبار سے ان کی فارسی شاعری سے کسی طرح کم نہیں رہی۔اردو شاعری کو دو باتوں نے :تقویت دی۔پہلی یہ کہ انہوں نے اردو میں فارسی کے اسالیب استعمال کئے مگر اس طرح کہ ان کی فارسی شاعری کی روح ہندی قارئین کے لئے زیادہ آسانی سے گرفت میں آنے کے قابل ہوگئی ۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو روزمرّ ہ کی آمیزش ملکی ذوق کے لئے زیادہ گہرائی اور کشش کا موجب بنی۔'' ۶۱؎

انہوں نے غالب کے کچھ اردو اور فارسی اشعار کا موازنہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کا یہ کہنا کہ ''ان کی فارسی ہی بہت کچھ ہے'' کاملاً غلط نہ سہی کچھ حد تک غلط ضرور ہے۔ عبداللہ کا ایک اور نقطہ قابلِ غور ہے کہ غالب فارسی میں انفرادی مضمون نکال لیتے ہیں مگر انفرادی لہجہ پیدا نہیں کر سکے یہ روزمرہ کی باریکیوں کے اندر سے ابھرتا ہے۔ بات دراصل یہ کہ غالب اہلِ زبان نہ تھے البتہ زبان دان ضرور تھے۔ انہوں نے کافی ریاضت سے فارسی میں کمال حاصل کیا البتہ اردو ان کی اپنی زبان تھی، اس کی معنویت کے نئے نئے پہلو برابر دریافت کیئے جاتے رہیں گے۔

آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون ''حالی اور نقدِ غالب'' میں یہ واضح کیا ہے کہ غالب کی فارسی نثر کتنی ہی محنت سے کیوں نہ لکھی گئی ہو وہ اچھی نثر کہلانے کی حقدار نہیں کیوں کہ وہ شاعری کے زیور سے لدی ہوئی ہے۔ اسی طرح ان کی فارسی شاعری برصغیر کی فارسی شاعری پر تو حاوی ہے، مگر کسی اہلِ زبان اور مسلم الثبوت اساتذہ کی شاعری کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ان کی فارسی نثر کتنی ہی جانکاہی سے لکھی گئی ہو اچھی نثر نہیں ہے یہ شاعری کے زیور سے لدی ہوئی ہے اسلئے بدنما ہے اور ان کی فارسی شاعری میں مغلیہ دور کے شعراء کے اثرات کا ان کے افتادِ طبع اور ان کے فکری میلان کی ایک اہم تصویر ہے اور بس۔ غالب کے دور میں شاعر وہ مانا جاتا تھا جو قصائد پر دسترس رکھتا ہو یا پھر اس کا کئی اصناف میں قابلِ قدر سرمایہ ضروری تھا ورنہ اسے حقارت سے یک فنا کہہ دیا جاتا تھا۔ غالب کی فارسی غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی ان چاروں کی برصغیر کی فارسی شاعری میں ایک ممتاز جگہ ہے اور بس۔ مگر ان کی شاعری اور اردو نثر کی مقبولیت ہر دور میں نئے سرے سے دریافت کی جائیگی وہ غلط نہیں کہتے کہ ''میں عندلیب گلشن نہ آفریدہ ہوں۔''[۶۲]

حالی نے غالب کو ایک فطری شاعر قرار دیا ہے اس سلسلے میں حالی حق بجانب ہیں، کیونکہ جو شخص کم سنی میں مثنوی لکھ سکتا ہے، یعنی نو برس کی عمر میں وہ فطری شاعر ہی ہوسکتا ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام کو فارسی آمیز کلام کہہ کر ان کے طبعی میلان کو فارسی کی طرف واضح کیا ہے۔ غالب نے ابتداء میں بیدل تتبع کیا ہے۔ حالی

لکھتے ہیں کہ:

''مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا۔ چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، اسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

''طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خان قیامت ہے۔'' ۶۳

حالی نے غالب کے ابتدائی کلام کے بطور نمونہ سات اشعار پیش کئے ہیں اور ان شعروں کو اردو بول چال کے خلاف قرار دیا ہے، اس لئے ان شعروں کی کوئی تشریح بھی نہیں کی ہے ہاں البتہ چوتھے شعر کی یہ کہہ کر تشریح کی یہ کسی قدر آسان ہے۔ یہ اشعار جن غزلوں سے نقل کئے ہیں ان کو غالب نے اپنے دیوان کو مرتب کرتے وقت نکال دیا تھا مگر حالی کو ان اشعار پر توجہ دینی چاہیے تھی کیونکہ اس سے غالب کے فکری اور فنی ارتقاء کا ثبوت ملتا ہے۔ غالب کے فکر و فن کا اندازہ لگانے کے لئے ان کے پورے کلام کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ غالب پر دقت پسند طبیعت کو مشکل تراکیب ہی راس آتی تھیں۔ اگر چہ اس عہد کے سخن فہم حضرات نے جو آسان کلام سننا اور کہنا پسند کرتے تھے غالب کے مشکل کلام کو مہمل کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اور غالب بھی اپنے عہد کے تقاضوں سے مجبور ہو کر بہت خوبصورت اور معنی خیز اشعار بھی قلمزد کر دیئے تھے ان کے مروّجہ دیوان میں ایسے اشعار بھی جا بجا مل جاتے ہیں جو غالب کے معیار کے نہیں ہیں اور نسخہ حمیدیہ میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو غالب کے معیار کے ہیں لیکن غالب نے اپنے دیوان سے انتخاب کے دوران نکال دیئے تھے۔ آل احمد سرور اپنے مضمون ''حالی اور نقدِ غالب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ان کا ابتدائی دور کا کلام یعنی نسخہ بھوپال اور نسخہ حمیدیہ کا وہ کلام جو منتخب دیواں میں شامل نہ ہوا حالی کے نزدیک بھی نظری کر دینے کے قابل تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ابتدائی کلام سے ہی غالب کے فکری اور فنی ارتقاء کا ثبوت ملتا ہے اور سرمائے میں بھی جواہر پاروں کی خاصی تعداد ہے۔'' ۶۴

غالب کے متروک اشعار اور ان پر آراء دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں شروع سے لیکر

آخرتک جو چیز مشترک ہے وہ بلند خیالی اور جدت مضامین، غالب کے ابتدائی کلام میں بھی یہ تبدیلی پائی جاتی تھی جیسا کہ حالی نے متروک اشعار کے شعر نمبر۴ کی تشریح کر کے واضح کر دیا ہے۔ حالی نے کچھ ایسے اشعار کا ذکر کیا ہے جو موجودہ دیوان میں پائے جاتے ہیں مگر ان پر اردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہوسکتا ہے جیسے:

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف برُ ونِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہریٔ قاتل　　کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط　　تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

غالب نے ابتداء میں لوگوں کے سامنے جو کلام پیش کیا اس کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ کیوں کہ غالب مشکل پسندی کو ترجیح دیتے تھے۔ مولوی فضل حق کے کہنے پر غالب سادگی کی طرف مائل ہوئے تھے اور انہی کے ایماء پر غالب نے اپنے اردو کلام سے دو ثلث کے قریب ایسے اشعار نکال دئے جو غایت درجہ فارسی آمیز تھے۔ اب غالب نے اس طرز کو الوداع کہا اور سہل نگاری کی طرف مائل ہوئے۔

غالب نے جس مشکل پسندی سے اپنی شعر گوئی کی ابتداء کی تھی اس کی عدم مقبولیت کی وجہ اس دور کا مذاق شعری تھا اس وقت لوگ سیدھا سادہ کلام پسند کرتے تھے۔ اس عہد میں اصل کمال فن سلاست اور سادگی کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت اچھا شعر اسی کو سمجھا جاتا تھا جو سنتے ہی قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرے۔ لوگ شعر میں غور کرنا اور اس کی تہوں تک جانا فضول سمجھتے تھے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ تھی کہ لوگ ذوق کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے کیوں کہ وہ آسان گو تھے۔ دوسری ایک اہم وجہ یہ ہے کہ غالب نے اس وقت کے حالات سے بغاوت کر رکھی تھی، کیونکہ جو اسلوب انہوں نے وضع کیا تھا وہ اس دور سے ہٹ کر تھا اس لئے لوگوں نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا لوگوں نے ان کو مشکل پسند اور مہمل گو کہہ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ حالی کی بصیرت کی داد دینی چاہئے کہ انہیں اس دور کی شاعری میں بھی جدت اور اپچ نظر آتی ہے۔ حالی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

''مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہوں یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اسے ان کی اور غیر معمولی اپچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی

بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اسی پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے پہو لیں ، اور لیک کے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں، جو ہنر یا پیشہ اختیار کرے اس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرِ مو تجاوز نہ کریں، اور ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں....برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اُرجنیلٹی یا غیر معمولی اپچ کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی.....مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہوسکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔'' ۶۵

غالب کے عہد میں ایسے اشعار پسند کئے جاتے تھے جس میں زبان عام فہم اور مانوس خیالات ہو جو پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی جانب فوراً مبذول کرے۔بیسویں صدی میں فن کے آداب بدلے۔نئے معیار قائم کئے گئے۔تجربے کے انوکھے فن پر توجہ دی گئی۔غالب کی شاعری کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا تو ان کے اس کلام میں بھی جس سے خود غالب نے تانظری کاٹ دیا ایک جہاں معانی نظر آیا۔

حالی اور ان کے معاصرین نے غالب نے جس طرزِ اظہار کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا، بیسویں صدی کے نقادوں نے اس میں بہت سی خوبیاں ڈھونڈ نکالی ہیں۔بیسویں صدی میں سادگی سے زیادہ پیچیدہ طرزِ اظہار کو مستحسن سمجھا گیا اور سادگی خیالات کے برعکس لطیف ابہام کو ضروری سمجھا گیا۔تنقیدی نقطہ نظر کی تبدیلی نے دورِ حاضر میں غالب کے ایسے کلام کو بھی جس کو خود غالب نے قلمزد کیا تھا۔ان کے فکر و فن کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اس کے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھا گیا۔غالب کے عہد میں استاد ذوق کی اہمیت تھی لوگ پیچیدہ کلام کو ایسے کلام پر ترجیح دیتے تھے جس کی تفہیم میں کسی طرح کی دشواری نہ ہو۔ایسا کلام جس میں سادگی ہو اچھا تو ہوسکتا ہے مگر معیاری ہونے کا ضامن نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔بقولِ آل احمد سرور:

''ابتدائی دور کے کلام میں غالب کے یہاں آرائش خم و کاکل سے زیادہ

اندیشہ ہائے دور دراز اور جسم کی پکار سے زیادہ روح کی پیاس، حسن کی سحر انگیزی سے زیادہ عشق کی دیدہ وری ملتی ہے....اس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ غبالب کے یہاں فنکار کا ذوق تماشا ہے۔ عاشق کا ذوق شہادت نہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عنفوانِ شباب میں ہی غالب کا ذہن انہیں تخیئل کے عشرُستان کی طرف لے گیا۔ وہ دنیا کی رنگینیوں سے گزرے مگر ان رنگینیوں میں غرق نہ ہو سکے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب کی شخصیت اپنا ایک مزاج بنانے میں کامیاب ہو گئی۔'' ٦٦ؔ

غالب کی توجہ زیادہ تر فارسی کی طرف تھی۔ انہوں نے اردو شاعری کی طرف کم توجہ دی۔ انہیں اپنی اردو شاعری پر ناز تھا، وہ اردو میں شعر محض تفنن طبع کے لئے کہتے تھے، وہ اپنے ایک خط میں منشی بخش کو لکھتے ہیں:

''بھائی صاحب، تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں، یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِ سبحانی 'فرما بیٹھتے ہیں کہ، بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ ناچار۔ کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔'' ٦٧ؔ

فارسی میں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزراز مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

حالی کو غالب کے کلام میں جدتِ مضامین اور طرفگی خیالات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب میر و سوادا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتاجا تاہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہیں، اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیّاح سمندر کے سفر میں ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت کا مشاہدہ

کرتا ہے، اس طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا

ہے۔"٦٨؎

حالی نے غالب کے خیالات کے انوکھے پن کو مختلف اشعار کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب نے اخلاقی معاملات، فطرت انسانی، عشق و عاشقی تصوف کے مضامین کو ان اشعار میں باندھا ہے، ان کی توضیح کی ہے مثلاً:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

بادی النظر میں اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ، یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے، اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے، کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے، یہ انسان کی طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے، اس قدر سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے، اسی قدر کام میں تاخیر اور سہل نگاری زیادہ کرتا ہے۔

حالی نے یہ واضح کرنے کے لئے کہ غالب کے خیالات میں انوکھا پن ہے، تشبیہات اور استعارات میں ندرت ہے، اسلوب بیان میں جدت ہے، کلامِ غالب سے بہت سی مثالیں دی ہیں اور ان کی تشریح بھی کی ہے، غالب کے کلام کی بنیاد ہی جدت طرازی پر ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ پامال سے پامال فرسودہ سے

فرسودہ اور کہنہ سے کہنہ مضمون کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس میں ایک نوع کی تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔
غالب نے ایک انسانی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اسے غم سے نجات نہیں ملتی۔شمع سے
تشبیہ دی ہے کہ شمع جب تک صبح نہیں ہو جاتی برابر جلتی رہتی ہے۔

غمِ ہستی کا اسدکس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اگرچہ دوسرے شعراء نے بھی زندگی کو شمع سے تشبیہ دی ہے،مگر جو انوکھا پہلو غالب کسی مضمون میں ڈھونڈ لیتے
ہیں وہ اُنہیں کا حصہ ہے۔آغاں جان عیش اور ذوق کے اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں شمع زندگی کا استعارہ ہے۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے
اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار دے یا اسے رو کر گذار دے

غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں نئے نئے خیالات ادا کرنے کی راہیں نکال لیتے ہیں۔
خیالات کی جدت اُنہیں نئے نئے استعارے وکنائے استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔غالب استعاروں اور
تشبیہوں کی مدد سے معنی آفرینی کی بھرمار لگا دیتے ہیں۔حالی کی نظر میں یہ چیز غایتِ درجہ ممدوح ہے۔وہ لکھتے
ہیں کہ:

''مرزا نے استعارہ وکنایہ وتمثیل جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان
ہے اور جس کی طرف ریختہ گوشعراء نے بہت کم توجہ کی ہے۔''۶۹

غالب کی یہ خصوصیت ان کی فارسی اردو شاعری میں پائی جاتی ہے۔اردو میں اس سے پہلے بھی استعاروں کا
استعمال ہوا ہے،مگر بالقصد نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں کیا ہے۔غالب ایک سیدھے سادے خیال کو بھی
استعارے کی مدد سے ادا کر کے اس میں ندرت پیدا کر دیتے ہیں یہی غالب کا کمالِ فن ہے۔اس ضمن میں
حالی نے غالب کے پانچ اشعار نقل کر کے ان کی تشریح کی ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت دردناک کیفیت طاری ہوتی اور اس کے رخصت ہو جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے اسے غالب قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالی کا خیال ہے ایسے بلیغ شعر اردو میں بہت کم ہیں جس طرح اس مضمون کو بہترین اسلوب میں غالب نے پیش کیا ہے۔ اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

کلام غالب کی تیسری خوبی یہ ہے کہ غالب کس سنجیدہ مضمون کو ایسے پیرائے میں ڈھالتے ہیں کہ وہ شوخی اور ظرافت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اسی کی بدولت ان کے کلام میں ایک قسم کی شگفتگی اور شادابی پیدا ہو گئی ہے۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف یوں ہی نہیں کہا ہے۔ غالب میں شوخی و ظرافت کی خصوصیت بہت صاف ستھری ہے اوروں کی طرح وہ اس کو ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں نہیں تبدیل ہونے دیتے یہ چیز غالب کے تقریباً تمام اصناف میں پائی جاتی ہے۔ بقولِ حالی:

''مرزا سے پہلے ریختہ گو شعراء میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرے انشاء، مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی۔ بخلاف مرزا غالب کے کہ انہوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔'' ۷۰

کلامِ غالب میں ایک اہم چیز جو دوسرے شعراء کے یہاں بہت کم ملتی ہے وہ ان کی شوخی اور ظرافت ہے، جو ان کی زندگی کے ہر ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ ان کے فارسی کلام میں اس کی عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں لیکن اردو میں بھی ایسی دلچسپ مثالوں کی کمی نہیں ان کی شوخی و ظرافت عامیانہ نہیں بلکہ خاصہ کی چیز ہے جو صرف اندازِ بیان سے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً:

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ وفساد نہیں

خصوصیت شوخی وظرافت میں غالب کا ہمسر نہ تو ایران نے پیدا کیا اور نہ ہی ہندوستان نے ۔شوخ نگاری عہدِ مغلیہ کے تمام شعراء کی خصوصیت تھی اور ایسا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ہر شاعر اپنی برتری کے لئے ایک دوسرے پر طعن کرتا تھا، اسی طعن اور طنز کی کوک سے شوخی وظرافت نے جنم لیا۔ کیونکہ ہلکے پھلکے طعن وطنز سے ہی شوخی وظرافت پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ قطعاً وقصداً کے علاوہ غزلوں میں بھی اس کا رواج ہو گیا۔

غزلوں میں شوخ نگاری کا ہدف زیادہ تر شیخ وزاہد کو قرار دیا جاتا ہے۔لیکن یہ اندازِ بیان وسیع ہو کر بہت سے معاملات حسن وعشق پر حاوی ہو گیا اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالب کی شوخ نگاری میں جتنی جدت و دلکشی پائی جاتی ہے وہ مشکل ہی سے کہیں اور نظر آسکتی ہے۔ غالب نے اپنی شوخ نگاری میں کبھی بازاری پن نہیں آنے دیا۔اردو کے دوسرے بڑے بڑے شعراء( میر،سودا، ذوق،انشاء، ناسخ،مصحفی اور داغ ) کے یہاں بھی طنز وظرافت نظر آتا ہے،لیکن کبھی کبھی سوقیانہ حدتک پہنچ جاتے ہیں۔غالب نے باوجود رندشاہد باز ہونے کے کبھی شرافت وتہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا نہ اردو میں نہ فارسی میں ۔اردو میں غالب کی اس متین و شائستہ شوخی وظرافت کی چند مثالیں ملاحظ ہوں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کے یہاں مشکل ہی سے دو چار اشعار ایسے مل سکیں گے جنہیں ہم نامناسب شوخی کی مثال میں پیش کرسکیں یا جو ذوق پر گراں ہوں مثلاً:

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

غالب کی ظرافت کی یہ خصوصیت کہ کبھی کبھی اس میں شدید تلخی غم بھی شامل ہوتی ہے،شاید ہی کہیں اور

مل سکے۔ مثلاً:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

واں گیا بھی میں، تو ان کی گالیوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں، صرف درباں ہو گئیں

یہ اشعار محض شوخی و ظرافت نہیں بلکہ ان میں تلخی غم و بے چارگی عشق کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ قوت صبر و تحمل کا اظہار بھی۔ غالب نے شوخی اور ظرافت کی آڑ میں کبھی اپنے قلم کو ہجو یا ہزل سے آلودہ نہیں کیا۔

حالی نے کلامِ غالب کی چوتھی خوبی یہ بیان کی ہے کہ ان کے بہت سے اشعار پہلو دار واقع ہوتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اٹھا سکتے۔'' [1]

حالی کا یہ شوق کس طرح مفاہیم میں تاویلات کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

کیوں کہ اس بت سے رکھو جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

حالی نے اس کے دو مفہوم بیان کئے ہیں۔ ایک ظاہری کا اور ایک لطیف معنی:

''لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے؛ پھر اس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔'' [2]

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنہ کو ہم دیکھتے ہیں

اس کے معنی تو یہی ہے کہ تیرے سرو قامت سے فتنہ قیامت کم تر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ

تیراقد اسی میں سے بنا گیا ہے، اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا۔

اسی طرح غالب کے اس مشہور شعر کی شرح تقریباً تمام شارحین نے نقل کی ہے کہ:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

بقولِ حالی:

''اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویراں ہے کہ اس کو یکھ کر گھر یاد آیا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے ہیں کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویراں ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔'' ۳ے

ڈاکٹر ابو محمد سحر حالی کی اس شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دشت کو دیکھ کر گھر یاد آنے کا یہ مفہوم کہ خوف معلوم ہوتا ہے قطعاً غیر شاعرانہ ہے اور کوئی اوسط درجے کا سخن فہم بھی شعر سے یہ مفہوم لینے کے لئے تیار نہیں ہوگا کیونکہ اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ دیوانے کو زیادہ سے زیادہ ویرانی ہی مرغوب ہوتی ہے''۔ ویرانی سے خوفزدہ ہونے کے متعلق کوئی پہلو نہیں ہوسکتا کیوں کہ دشت ویراں ہوتا ہی ہے۔ دراصل غالب نے اس شعر میں غزل کی روایات کے مطابق دشت کی ویراں سے مشابہ قرار دے کر اپنے گھر ہی کی طرح انتہائی ویرانی کا بیان کیا ہے۔'' ۴ے

ایک جگہ نظم طباطبائی اپنی شرح میں عبدالباری آسی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''شعر میں جہاں دوسری معنی کا احتمال پیدا ہو گیا وہ سست ہو گیا۔'' ۵ے

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالی نے جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا ہو وہ سست ہو گیا ہوگا مگر نظم کے اس بیان سے یہ اخذ کرنا درست نہیں ہے۔ نظم کے اس بیان پر بے خود موہانی نے سخت گرفت کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''یہ ارشاد کہ شعر میں جہاں دوسرے معنی کا احتمال پیدا ہوا وہ سست ہو گیا بجا ہے مگر جب احتمال ہو بھی جب تغیر لہجہ یا کسی اور صورت سے کئی مفہوم بے تکلف نکلیں تو داد کے قابل ہیں خواہ وہ مطالب مصنف کے ذہن میں شعر کہتے وقت موجود ہو یا نکات بعد الوقوع کے تحت آئیں اور یہ تو شاعری کا معجزہ ہے کہ شعر دو متضاد معنی رکھتا ہو اور دونوں اپنی جگہ لطیف اور مضبوط ہوں۔'' ۶ے

چنانچہ انہوں نے خاقانی کے ایک شعر سے چار اور میر تقی میر کے اس شعر سے کہ:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

سے پانچ معنی نکال کر دکھائے ہیں۔ اوران اشعار کا شمار عمدہ اشعار میں ہوتا ہے۔ غالب کے اشعار میں حالی کا دوہری معنویت تلاش کرنا اکثر درست ہے کیونکہ غالب کلام میں ابہام کی وجہ سے کثیر الجہتی مفاہیم کے حامل اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مرزا غالب کے بہت سے منتخب اشعار حالی نے درج کئے ہیں اوران کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ حالی کا طریقہ کار بڑی حد تک توضیحی ہے، انہوں نے غالب کے اشعار کو مختلف عناوین کے تحت تقسیم کیا ہے، اور اشعار کی عمدہ تشریح کی ہے۔ کہیں وہ تقابلی تنقید کی مدد سے انہیں ظہوری، حافظ اور نظیری کے مقابل ٹھہراتے ہیں۔ کہیں خیالات کے انوکھے پن، شوخی وظرافت، استعارے وکنائے اور تمثیل کے استعمال اور کبھی پہلو دار اشعار کی وضاحت کی۔

حالی پہلی بار غالب کی شاعری کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جو ان کے فن میں بڑی اہمیت رکھتی ہے بقول حالی نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی، جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو مجبور نہیں کرتیں۔ نئی طرز جو فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی وہ ریختے میں ڈیڑھ سو سال کے اندر پیدا ہو گئیں۔ حالی غالب کے ہاں نئی طرز کا ذکر کرتے ہیں۔ غالب کے کلام کو ہر دل عزیز بنانے میں یادگارِ غالب نے اہم رول ادا کیا۔

بقول آل احمد سرور:

''غالب کی شاعری اپنے زمانے میں خواص ہی میں محدود رہی، عوام تک
اسے پہنچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بیٹھانے میں یادگارِ
غالبؔ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیات
اعتدال ہے وہ نہ بجنوری کی طرح غالب کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور نہ
لطیف کی طرح ان پر غیر ہم آہنگی الزام لگاتے ہیں انہوں نے غالبؔ کی
جو خصوصیات گنائی ہے سب اپنی جگہ صحیح ہے اور تمام نقادوں، حتیٰ کہ شیخ محمد
اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگارِ
غالب میں ملتی ہے۔ انہوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح
کر غالب کی ترجمانی کا بھی حق ادا کیا ہے اور فارسی کے بعض شعراء سے
ان کا موازنہ یک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے۔'' ۷۷

حالی نے غالب کی اردو نثر کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مکاتیب پر سیر حاصل بحث کی ہے، ان کی ادبی اہمیت اور خوبیوں کو نمایاں کیا ہے۔ غالب کے خطوط اردو نثر کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس میں غالب کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ ان خطوط میں ایک دلکش ماحول اور ایک مانوس فضا ملتی ہے۔ یہاں زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ حالی کا خیال ہے کہ:

''مرزا غالب ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے، مگر سنہ
مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر معمور کیئے گئے، اور ہمہ تن
''مہر نیم روز'' کے لکھنے میں مصروف ہوگئے، اس وقت بہ ضرورت ان کو
اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی
خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر
غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت''
مہر نیم روز'' کی ترتیب و انشاء میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اس وقت ان
کی فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی۔ اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں
شاخ معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً

۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔‘‘۸؎

غالب کی مکتوب نگاری کا سبب حالی کے خیال میں غالب مہر نیم روز کی تالیف کے سلسلے میں ان کی مصروفیات ہیں۔ بیشتر نقادوں نے حالی کے اس نظریئے کو تسلیم کیا ہے۔ غالب کی اردو مکتوب نگاری کو مہر نیم روز کی تالیف میں غالب کی مصروفیات کا نتیجہ قرار دینا زیادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ مہر نیم روز کی تالیف کے دوران غالب کو کافی فرصت رہی۔ اس کے علاوہ اُنہیں کتاب کے مواد کے سلسلے میں کسی طرح کی دقت نہیں تھی کیونکہ مواد اُنہیں دوسرے احباب اردو میں مہیا کر دیتے تھے وہ اسے فارسی میں منتقل کر دیتے تھے۔ اب تک غالب کے جو اردو خطوط دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے قدیم تر خط ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کا ہے یہ خط منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھا گیا ہے۔ غالب کو فارسی سے خاص لگاؤ تھا، وہ اپنی فارسی دانی پر فخر بھی کرتے تھے۔ فارسی سے اس قدر فطری شغف کے باوجود غالب کا مکتوب نگاری کے لئے فارسی کی جگہ اردو کا سہارا لینا ایک توجہ طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔ جب انہوں نے خط نگاری کے لئے اردو کا انتخاب کیا ہے تو اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک اردو نثر کے لئے فضا ہموار ہو چکی تھی۔ انگریزی حکومت فارسی کی جگہ اردو کو سرسری زبان کا درجہ دے چکی تھی، جب تک اردو کا رواج کم تھا غالب فارسی زبان میں خط لکھا کرتے تھے۔ جب اردو کا رواج بڑھتا گیا، تو غالب نے خط و کتابت کے لئے اردو کو ہی منتخب کیا۔ غالب کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تکلف کو دخل نہیں ہوتا۔ انہوں نے خط لکھتے ہوئے القاب و آداب کے قدیم فرسودہ طریقے کو ترک کر دیا۔ جب کبھی لکھنے بیٹھتے تو نئے اور مختصر اور موزوں تر القاب لکھتے تھے۔ مثلاً وہ خط میں کبھی میاں، بر خوردار، کبھی بندہ پرور، کبھی مہراج جیسے القاب استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے ادائے مطلب کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی آپس میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ مثلاً

> ’’محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی تم محمد علی بیگ! لوہاروں کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔‘‘۹؎

غالب کے مزاج میں چاشنی، شوخی و ظرافت ہے وہ بات میں بات پیدا کرنے کے فن میں ماہر تھے بقول حالی:

''مرزا کی طبعیت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی، جیسے ستار کے تار میں سر
بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کے خلاّق
ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی، جو قوتِ پرواز کو طائر
کے ساتھ۔'' ۸۰؎

غالب شوخی اور ظرافت کی مدد سے کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر دیتے، جیسے ایک دوست کو رمضان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں، مگر روزہ کو بہلاتا رہتا ہوں، کبھی
پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی روٹی کا ٹکڑا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ
عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ
تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے، اور روزہ بہلانا
اور بات ہے۔'' ۸۱؎

ایک خط میں برسات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا،
فقدان راحت سے گھبرایا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے، ابر دو گھنٹے
برسے، تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔'' ۸۲؎

غالب کا یہ کمال ہے کہ تعزیت کے ایسے نازک موقعوں پر بھی خط لکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز کو فراموش نہیں کیا۔ بعض خطوط میں آخری وقت کی حالات اور دنیا کی بے ثباتی کا بیان بڑے خوبصورت طریقے سے کیا ہے۔ مثلاً:

''ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی
گراں جانی رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز
پیش ہے۔ زادراہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو
خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہادیہ زاویہ ہے۔ دوزخ
جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے اب تو گھبرا کے یہ

کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے۔''

۸۳

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں:

''یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشا بن گیا ہوں۔ رنج وذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کرلیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا ہم نے از راہ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ وعرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زادیہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں'' اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلا نصاحب ! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔'' ۸۴

بہر کیف یادگارِ غالب'' اپنی بعض کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ایک اہم اور مستند کتاب ہے اور غالب پر اس کے بعد جو تذکرے اور تبصرے سامنے آئے ہیں ان میں اسی کتاب کی آوازِ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یادگار غالب کے بعض پہلوؤں پر بے شک اعتراضات اُٹھائے گئے ہیں، لیکن غالب پر اس سے بہتر اور زیادہ مستند کتاب آج تک منظرِ عام پر نہیں آسکی۔ اسی کتاب نے غالب کی شخصیت اور عظمت کا انمٹ نقش سب کے دلوں پر بٹھایا ہے۔

یادگار غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالقیوم نے لکھا ہے کہ:

''غالب پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں سب سے زیادہ غالب کے کلام کے محاسن سے اسی کتاب نے قارئین کو آشنا کیا۔ حالی کے بعد جس

قدر غالبیات کے سلسلے میں معتبر تصانیف کو پڑھیے تو قدم قدم پر ''یادگار''
کا اثر ملتا ہے۔حالات زندگی،شاعری پر ریویو اور اشعار کی شرح کے سلسلے
میں ''یادگار'' سے فیض اٹھایا گیا ہے، یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔'' ۸۵

## حیات جاوید:

حیات جاوید سر سید کی حیات پر ایک ضخیم اور جامع سوانح عمری ہے، جو مولانا حالی کی سات سالہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔اگر چہ حالی نے یہ سوانح عمری سر سید کی حیات ہی میں لکھنی شروع کر دی تھی مگر سر سید کی حیات میں اسے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔حالی کی یہ آخری سوانحی تصنیف سر سید کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔حالی اس سے پہلے ''حیات سعدی'' اور ''یادگارِ غالب'' لکھ چکے تھے۔سر سید کے واقعات زندگی حالی کے نزدیک سعدی اور غالب کے حالات زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔کیونکہ سعدی اور غالب دونوں کا کمال شعر وادب تک محدود تھا، جبکہ سر سید ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ ادیب بھی تھے، مورخ بھی، مضمون نگار بھی، نقاد بھی اس سے بڑھ کر وہ ایک مصلح قوم تھے۔انہوں نے لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگایا، ان کی زندگی دوسروں کے لیے ایک مشعلِ راہ تھی۔حالی سوانح نگاری کو ایک نہایت کار آمد صنف سمجھتے تھے۔وہ حیات سعدی میں اس کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور
انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے
چھوڑ گئے ہیں، اور خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل
کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں ان کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو
خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔۔۔۔اور بیوگرافی سے اکثر نیکی کے
کرنے اور بدی سے بچنے کی نہایت زبردست تحریک دل میں پیدا ہوتی
ہے۔'' ۸۶

حالی نے ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر ''حیات جاوید'' لکھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سر سید کی بہترین سوانح عمری ہے۔

انہوں نے سرسید کو اوران کے پورے عہد کو اپنی تمام جزئیات کے ساتھ زندہ کر دیا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو اس کام کو انجام دینے میں حالی کے علاوہ اور کوئی دوسرا شخص موزوں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اس کا سبب یہ تھا کہ سوانح عمری لکھنے والے کا اپنے ہیرو سے پوری طرح واقف ہونا لازمی ہوتا ہے اور ظاہر ہے حالی سرسید کی پوری زندگی سے مکمل طور پر واقف تھے۔اوران سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔اسی لئے جب انھوں نے سرسید احمد خان کی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کیا تو ان کے ساتھ سارے ہمدردانہ رویہ کو پیش نظر رکھا۔سرسید حالی کی نظر میں عظیم شخص تھے۔وہ سرسید کے متعلق اپنے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''سرسید احمد خان مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان ہیں کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے الوالعزم بادشاہ بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے۔اوراس لیے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لیے درکار ہیں ہماری لیے بے سود ہوں گے۔'' ۸۷

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''البتہ سرسید کی لائف ہمارے لیے ایک ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے کہ ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل جو تنگنائے دنیا میں ظاہراً اس کی سب سے آخری منزل ہے،آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔'' ۸۸

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے دل میں سرسید احمد خان کی عظمت واحترام کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ موجود تھا۔اسی لئے ان کے دل میں سرسید کی شخصیت سے متعلق سارے ہمدردانہ جذبات موجود تھے۔اسی لئے انھوں نے ''حیات جاوید'' کی تخلیق کرتے وقت ایک سچے اور بلند پایہ سوانح نگار کا فرض ادا کیا اور ایک طرح سے اپنی معتدل مزاجی کے ثبوت پیش کئے۔

دوسرے حالی کی نظر میں سر سید کی عظمت کا راز یہ تھا کہ وہ ایک بحرانی دور میں مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ایک ایسے دور میں جبکہ مسلمان اپنی عزت وآبرو کھو بیٹھے تھے اور مغربی تہذیب ان پر حاوی ہو گئی تھی۔سر سید نے قوم کو یہ گر سکھایا کہ کس طرح اپنی تہذیب ،روایات اور عزتِ نفس کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزوں سے مفاہمت کی جا سکتی ہے اور انگریزی حکومت پر رسوخ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ حالی نے سر سید کے ساتھ اپنی زندگی کے تقریباً پچیس سال گزارے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار بھی تھے نیز فکری اور عملی شکل میں قومی بیداری کی تحریک میں ایک مشترکہ نظریہ بھی رکھتے تھے۔بقول سلام سندیلوی:

''دراصل حالی سر سید کی سوانح حیات لکھنے کے لیے بہت موزوں تھے۔
انھوں نے سر سید کے ساتھ اپنی زندگی کے تقریباً پچیس سال گزارے
تھے۔حالی اور سر سید کا ایسا ہی طویل ساتھ تھا جیسا کہ باسویل اور جانسن کا
تھا۔حالی سر سید کے رفیق ہی نہیں تھے بلکہ ان کی تحریک کے ایک اہم رکن
تھے۔'' ۸۹؎

حالی نے ''حیات جاوید'' کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے سر سید احمد خان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ تب کر لیا تھا جب سر سید نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔مگر اس وقت سر سید کی حالت ''پہلی رات کے چاند'' جیسی تھی۔کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں دیکھا۔لیکن جب انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا اجرا کیا تھا تو وہ ''چودھویں رات کے چاند'' کی طرح سب پر روشن ہو گئے۔حالی لکھتے ہیں کہ:

''راقم کو سر سید کی زندگی کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا
ہوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد
ڈال چکے تھے۔مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور باوجود سخت
مخالفتوں کے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ
تہذیب الاخلاق میں سر سید کی دلنشیں تحریریں جیسی کہ اردو زبان میں پہلے
کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں ،شائع ہو رہی تھیں اگر چہ سر سید نے اپنی زندگی

عام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک ان کا
حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا
لیکن مدرستہ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں
رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا۔'' ۹۰

''حیات جاوید'' کی ترتیب میں حالی کو ہر ممکنہ ذرائع نظر آئے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔انہوں نے کرنل گریہم کی مختصر سوانح عمری کا مطالعہ کیا۔منشی سراج الدین کے مسودے سے بھی فائدہ اٹھایا۔مواد کی فراہمی کے لیے خود علی گڑھ میں قیام کیا علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ،تہذیب الاخلاق اور سر سید کی جملہ تصانیف سے بھی استفادہ کیا۔سر سید کے خطوط کو بھی ذہن میں رکھا۔ان کے تعلق سے لکھی گئی موافق اور مخالف تحریروں سے بھی مدد لی،یعنی مواد جہاں جہاں سے دستیاب ہوسکتا تھا حاصل کیا اور اپنے پیش نظر رکھا۔حالی کو سر سید سے بے حد لگاؤ اور عقیدت تھی ،وہ چاہتے تھے کہ اپنے ہیرو کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔انہوں نے اپنے مواد کو ترتیب دیا اور پوری صداقت کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔حالی حیات جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا
چاہیے چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام
کیا۔جہاں خود سر سید اور ان کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا اور اس
کے بعد کئی دفعہ اسی کام کے لیے وہاں جا کر ٹھہرا۔میں آنریبل حاجی
اسمٰعیل خان کا شکر گذار ہوں کہ جس وقت ان کو میرا یہ ارادہ معلوم ہوا
انھوں نے وہ تمام مسودات جو منشی سراج الدین نے مرتب کیے تھے
میرے حوالہ کر دیے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں
کہ ان کے مسودات سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔'' ۹۱

اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کے سوا کرنل گریہم کی کتاب اور منشی سراج الدین احمد کے مسودات
سے بھی جا بجا مدد لی گئی ہے اور ان رسالوں اور اخباروں پر بھی ایک

سرسری نظر ڈالی گئی ہے جو خاص کر سرسید کی مخالفت کی غرض سے
ہندوستان میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے اور سرسید کے اخلاق و عادات وغیرہ
کے متعلق کچھ اپنی خاص واقفیت سے اور کچھ ان کے قدیم دوستوں کے
بیانات سے اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔'' ۹۲

اس سلسلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے کہ:

''حالی نے اپنے سوانحی مواد کو کتابی شکل دینے میں سات سال صرف کیے
تھے اور سرسید کی وفات کے بعد بھی تین سال تک اس میں لگے رہے
تھے۔لیکن ان کی سرسید سے عقیدت ان کی موت کے بعد بجائے کم
ہونے کے اور زیادہ ہوگئی۔اس کے علاوہ انہوں نے نہ صرف سرسید کی
سیرت نگاری کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا بلکہ اس جامع حیثیات شخص
کے کارناموں کی توضیح وتشریح کا مشن بھی اپنے آپ پر عائد کر لیا تھا جو
ممکن ہے کرنل گراہم کی سوانح عمری کے اثر کا نتیجہ ہو کیونکہ اس میں بھی
سرسید کے کردار اور کارناموں سے بحث کی گئی تھی گویا حیات جاوید حقیقی
معنوں میں سراج الدین احمد، کرنل گراہم اور خود حالی کی مختلف کوششوں کا
مجموعی امتزاج تھی۔'' ۹۳

غرض حالی نے ''حیات جاوید'' کی ترتیب کے لئے ہر ممکن صورت سے استفادہ کیا۔ جسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مواد کی فراہمی کی جتنی زبردست کوشش حالی نے کی وہ کسی سے کم نہیں تھی۔ یہ حالی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ وہ سرسید احمد خان کی ایسی سوانح عمری لکھی جو ہر طرح سے مکمل ہو۔

حالی نے ''حیات جاوید'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔سرسید کی ولادت ،بچپن ،خاندان ،تعلیم ،ابتدائی تصانیف ،انگریزی حکومت کی نوکری ،غدر کے حالات اور اس فتنہ وفساد میں ان کی خدمات ،ابتدائی تعلیم ،جہد و جہد و مشاغل، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند کی تکمیل ،سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ،اردو زبان کی حمایت ،سفر لندن ،سی۔ایس آئی کا خطاب ،تہذیب الاخلاق کا جاری ہونا ،کالج کا افتتاح ،تفسیر قرآن ،ایجوکیشنل کانفرس کا قیام ،انڈین نیشنل

کانگریس کی مخالفت اور پارلیمنٹ میں تقاریر۔ الغرض ان کی وفات تک کے تمام اہم واقعات کو اس حصّے میں شامل کر دیا۔ دوسرے حصّے میں سرسید کی ترقی کے اسباب کا جائزہ لیا ہے۔ یہ حصّہ حالی کی جانفشانی کا حاصل ہے۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی اور نکتہ سنجی سے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس حصّے میں حالی نے سرسید کی سرکاری، سیاسی، ملکی وقومی اور مذہبی خدمات، سرسید کی مخالفت، کامیابی اور اس کے اسباب، اخلاقی خصائل اور مذہب جیسے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ تاہم انہوں نے ہیرو کی کمزوریوں پر پردہ ڈالا۔ جس کا اعتراف انہوں نے ''حیات جاوید'' کے دیباچے میں کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''اگر چہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں ہے کہ کسی شخص کی بایوگرافی کریٹیکل طریقہ سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔'' ۹۴

یہی سبب ہے کہ حالی نے سرسید کے عیوب بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی کے ذہن پر سوانح نگاری کا اخلاقی پہلو نقش ہو چکا تھا۔ وہ سرسید کو ایک مثالی کردار کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے تا کہ زوال آمادہ قوم کے سامنے وہ نمونہ بن سکیں۔

حالی سرسید کی سوانح لکھتے وقت الجھنوں اور ذہنی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، کیوں کہ ایک طرف وہ زمانے کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے کریٹیکل سوانح نگاری سے احتراز کرنا چاہتے تھے۔ حالی کا معتدل اور متوازن نقطۂ نظر ان کے خلوص و دردمندی نے اس سوانح عمری کو ایک بے مثل سوانح عمری بنا دیا۔

بہر حال ''حیات جاوید'' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ سید احمد خان کی پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ کو دہلی میں ہوئی۔ ان کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطوں سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ بقول حالی:

> ''سید احمد خان ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں ان کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطوں سے آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے۔'' ۹۵

ان کے آباء واجداد ملک عرب سے ہجرت کر کے سب سے پہلے ایران کے شہر دامغان میں سکونت پذیر ہوئے اور پھر وہاں سے شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ہندوستان آ کر مقیم ہو گئے۔ سر سید کے دادا سید ہادی شاہانِ مغلیہ کے دربار سے جڑے ہوئے تھے اور وہیں سے انھیں 'جوادالدولہ' کا خطاب بھی ملا تھا۔ سید ہادی کے بیٹے اور سر سید کے والد میر متقی کا بھی دربار مغلیہ میں وہی مقام و رتبہ تھا جو کہ سید ہادی کا لیکن چونکہ اس وقت بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی اور خود میر متقی ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے، اس لیے انھوں نے دربار مغلیہ سے ملنے والے خطابات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر بھی اکبر شاہ سے ان کے کافی قریبی تعلقات تھے اور وہ ان کے دربار اور محل میں بے روک ٹوک آیا جایا کرتے تھے۔ بعض دفعہ سر سید بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے۔ اس کے علاوہ سر سید کے والد دہلی کے ایک مشہور پیر حضرت شاہ غلام علی سے بیعت تھے اور خود شاہ صاحب کی ان پر پدرانہ نظرِ عنایت تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کو مذہب اور خانقاہی زندگی سے لگاؤ ان کے والد صاحب کی وجہ سے تھا۔ سر سید کے نانا خواجہ فرید الدین بھی دربارِ مغلیہ سے وابستہ تھے۔ سر سید نے 'سیرت فریدیہ' کے عنوان سے اپنے نانا کی سوانح لکھی ہے، جس میں ان کے بارے میں مکمل تفصیلات بیان کی ہیں۔ سر سید کی زندگی پر نانا کے کافی اثرات تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سر سید کے والد میر متقی شادی کے بعد خواجہ فرید الدین کے گھر منتقل ہو گئے تھے، اس کے علاوہ چونکہ والد کا زیادہ تر وقت خانقاہی ماحول میں گزرتا تھا، اس لیے ابتدائی تعلیم و تربیت نانا اور والدہ کی زیرِ نگرانی میں ہوئی، جس کا اثر ان کی پوری زندگی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

بچپن میں سر سید کو کھیلنے کودنے کی پوری آزادی تھی لیکن ان کو ایک تنبیہ یہ ضرور کی گئی تھی کہ وہ جو بھی کھیل کھیلیں چھپا کر نہ کھیلیں بلکہ گھر کے افراد کے سامنے کھیلیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ بچوں میں بری عادتوں کے پڑنے کا خطرہ بالکل نہ کے برابر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کھیلوں میں کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو بچے اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ یہیں سے سر سید کے اندر اچھی عادات و خصائل پیدا ہونے شروع ہوئے۔ حالی ''حیات جاوید'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''بچپن میں سر سید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ
> ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے

پھریں۔ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور
دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس
میں کھیلنے کودنے کے لئے کافی تھے۔اس لیے ان کو نوکروں اور اجلافوں
کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ
کھیلنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی
کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت
کھیلوں۔'' ۹۲

حالی نے سرسید کی زبانی دسترخوان پر کھانے کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

''میرے نانا صبح کا کھانا اندر زنانے میں کھاتے تھے۔ایک چوڑا چکلا
دسترخوان بچھتا تھا۔بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں
کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔بچوں کے آگے خالی
رکابیاں ہوتی تھیں۔نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز
کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی
میں ڈال دیتے۔تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا
کھاتے تھے۔سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ
کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نکلے۔رات کا
کھانا وہ باہر دیوانخانے میں کھاتے تھے۔زنانہ ہو جاتا تھا۔میری والدہ
اور میری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آئی تھیں۔ہم سب لڑکے ان کے سامنے
بیٹھتے تھے۔ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔کسی کے پانو کا دھبا سفید چاندنی
پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی
کے کپڑے پر ہوتا تھا اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔شام کو چراغ جلنے
کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں
سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے جس کا سبق اچھا یاد ہوتا
اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے

اور گھر کر دیتے۔'' ۹۷

یہی وہ عادات وخصائل تھے جو بعد میں چل کر سرسید پوری قوم میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔تہذیب الاخلاق کی فائلیں اس کی گواہ ہیں کہ سرسید نے کھانے ، پینے ،رہائش وزیبائش سے متعلق کتنے مضامین لکھے ہیں اوراس بات کے لیے کتنے فکرمند رہا کرتے تھے یہ تمام خصلتیں ان کی قوم کے اندر پیدا ہو جائیں۔

حالی سرسید کی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی بلکہ ناظرہ قرآن ننھیال میں ایک استانی سے مکمل کیا۔اس کے بعد گھر کے باہر مکتب میں پڑھنے لگے اوراس وقت کے رواج کے مطابق مولوی حمید الدین سے کریما، خالق باری اور آمدنامہ جیسی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔فارسی میں بھی گلستان وبوستان اوراس جیسی دوسری کتابیں پڑھیں۔عربی میں شرح ملا،شرح تہذیب،میبذی،مختصر معانی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔لیکن یہ تمام کتابیں بے توجہی سے پڑھی گئیں۔اس میں انھوں نے کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔البتہ ان کے ننھیال میں علم ریاضی کا خوب دور دورہ تھا،لہذا اپنے ماموں سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔طب کی بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔لیکن اٹھارہ انیس سال کی عمر میں کسی استاد کی زیرنگرانی تعلیم حاصل کرنا چھوڑ دیا اور خود سے ہی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

حالی نے سرسید کے عنفوان شباب کا نقشہ بھی کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ عنفوان شباب میں سرسید اکثر طوائفوں کے مجرے بھی سننے جایا کرتے تھے اور شعروشاعری سے بھی انھیں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔لیکن زندگی کی یہ رنگینی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اوراپنے بڑے بھائی کی بے وقت موت کا سرسید پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ رنگین صحبتوں سے ان کا دل بالکل اچاٹ ہو گیا۔لباس وغیرہ بھی تبدیل ہو گئے ،داڑھی بھی بڑھالی اور مذہب کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔

محمد میر تقی کا جس وقت انتقال ہوا،اس وقت سرسید کی عمر بائیس سال تھی۔والد کی زندگی میں چونکہ ذریعہ معاش قلعہ سے ملنے والی رقم ہوا کرتی تھی،جس میں دربار کے بعض لوگوں کی عداوت کی وجہ سے اب کمی بیشی ہونے لگی تھی،اس لیے والد کے انتقال کے بعد سرسید نے قلعہ سے رشتہ توڑ لیا اور سرکار انگریزی کی نوکری کرنا ہی بہتر سمجھا۔حالی نے سرسید کی ابتدائی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس وقت وہ (سرسید) عدالت کی کاروائیوں سے انگریزی قوانین سے

محض ناواقف تھے۔سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کاروائی سے
اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خان اس وقت
دلی میں صدر امین تھے۔ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں ان کو
کام سیکھنے کی اجازت دیں۔انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید
نے وہاں کام سیکھنا شروع کیا۔چند مہینے ان کو کام سیکھتے گذرے تھے کہ
مولوی خلیل اللہ نے ان کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے
لیے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔سرسید
کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گذرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر
کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں جج ہو کر آئے۔سرسید کو وہ پہلے سے
جانتے تھے۔اس لیے یہ ان سے ملنے کو گئے اور نوکری کی درخواست کی
انھوں نے ان کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا لیکن انھوں نے
اس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ہر چند صاحب جج نے بہت اصرار اور
دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے بہ سہولیت کام لیں گے اور
ہر ایک بات بتاتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے
میں لیاقت نہیں پاتا اس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔غرض کہ بدستور
صدر امینی میں کام کرتے رہے۔اتفاق سے انھیں دنوں میں مسٹر ہملٹن
آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے وقت سرسید کو ایک چھٹی کے ذریعہ سے
اپنے جانشین مسٹر لینڈ زی کے سپرد کر گئے۔لیکن ابھی مسٹر لینڈ زی سرسید
کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے ان کو آگرہ
میں بلا لیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا
خالی ہوا اس پر مقرر کر دیا۔'' ۹۸

سرسید بخوبی اس امر سے واقف تھے کہ انگریز حکومت مسلمانوں کی کیوں مخالف ہے۔ایک طرف
مسلمان بھی انگریزوں سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ نہ تو وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی
انگریزوں سے کسی بھی قسم کی تعاون کو قبول کرتے۔ان حالات میں سرسید چاہتے تھے کہ کسی طرح دونوں قومیں

ایک دوسرے کے قریب آ جائیں اور آپسی نفرت ختم ہو،اور حکومت برطانیہ کے زیر سایہ مسلمانوں کو بھی ترقی کے مواقع میسر آئیں ۔سر سید چاہتے تھے کہ مسلمان سیاسی معاملات میں الجھنے سے بہتر تعلیم کی طرف راغب ہوں کیوں کہ تعلیم ہی وہ ذریعہ تھی جو مسلمانوں کو اعلیٰ مقام و مرتبہ تک پہنچا سکتی تھی اور حاکم و محکوم کے درمیان خلیج کو ختم کر سکتی تھی ۔چنانچہ سر سید نے ان تمام مسائل پر غور و فکر کیا اور ان کا حل نکالنے کی کوشش کی جو ۱۸۵۹ء میں ''اسباب بغاوت ہند'' کی صورت میں سامنے آیا۔اس کتاب میں انھوں نے ان حالات کا تجزیہ کیا جو ۱۸۵۷ء کے المیے کا سبب بنے۔ان کے مطابق حکومت کی لاپرواہی ، نا اہلی اور نا عاقبت اندیشی کے سبب بے شمار غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان کے انسداد کی کوئی صورت بھی نہیں نکالی گئی۔''اسباب بغاوت ہند'' میں سر سید نے ہندو اور مسلمانوں دونوں کی وکالت کی۔انگریزی میں ترجمہ ہو کر جب یہ کتاب کونسل (لندن) روانہ ہوئی تو مسٹر سیل بیڈن نے جو اس وقت فارن سکریڑی تھے اس کے خلاف تقریر کی اور اسے باغیانہ مضمون قرار دیا۔ اور کہا کہ ان سے حسب ضابطہ جواب طلب کیا جائے اور معقول جواب نہ ملنے پر سخت سے سخت سزا سنائی جائے۔مگر خوش قسمتی سے کوئی اور ممبر اس کا ہمنوا نہ ہوا اس لئے اس کی تجویز اور تقریر بے سود ثابت ہوئی۔وہیں بعض دیانت دار افسروں نے سر سید کے اعتراضات کو سراہا اور کتاب کے بیش تر حصوں کو جائز قرار دیا۔چنانچہ انگلستان کے مشہور اخبار''ہوم نیوز'' میں لکھا گیا:

> ''سید احمد خان نے جو غدر کے اسباب تحریر کئے تھے ان میں سے بعض نہایت قیمتی اور علم درآمد کے قابل تجویزیں پیش کی تھیں جو حکام ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔اس نے نہایت دلیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی ۔یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جا سکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔'' [99]

سر سید چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایسے مدارس قائم کئے جائیں جو جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکیں ۔سر سید نے کوشش کی کہ مسلمان مغربی علوم کی جانب متوجہ ہوں اور اس کی افادیت کو سمجھیں۔

چنانچہ انھوں نے ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی ۔جس کا اہم مقصد علوم کی بہترین کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرنا تھا۔اس سوسائٹی کے ذریعے تاریخ، سیاست اور معاشیات کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔سائنٹفک سوسائٹی نے بہت سی اہم کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے ایک بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ۔اس کے زیرِ اہتمام بہت سی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔اس کے علاوہ بہت سے سائنسی اخبارات بھی سوسائٹی کے لئے منگوائے گئے ۔سرسید سائنٹفک سوسائٹی کی اکثر مالی امداد بھی کیا کرتے۔ انہوں نے اپنا ذاتی پریس جو کہ انہوں نے آٹھ ہزار میں خریدا تھا سوسائٹی کو بطور عطیہ دے دیا۔اس سلسلے میں جارج ہنری لارنس نے سرسید کے متعلق کہا کہ:

''اگرچہ سوسائٹی سید احمد خان کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اس احساس کو اس عالیشان عطیے نے اور زیادہ کر دیا۔'' ۱۰۰؎

۱۰ مئی ۱۸۸۶ء کو سرسید نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علی گڑھ کے روسا اور انگریزی افسران شامل تھے،اس میں سرسید نے کہا کہ ہندوستانیوں گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے ۔لوگوں کو یہ رائے پسند آئی اور اسی وقت ہندو مسلمان اس سوسائٹی کے ممبر ہوئے اور اس کا نام علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا۔اس ایسوسی ایشن نے علی گڑھ میں بہت سے مفید کام کئے لیکن ۱۸۶۷ء میں سرسید کا تبادلہ بنارس میں ہو جانے کا باعث اس ایسوسی ایشن کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۸۶۶ء میں سرسید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی ۔اس ایسوسی ایشن کا اہم مقصد تھا کہ ہندوستان اپنے حقوق کو حکومت وقت کے سامنے رکھیں ۔اسی سال انھوں نے علی گڑھ سے ہفتہ وار اخبار ''دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا۔مولانا حالی اس خبار کے متعلق لکھا ہے کہ:

''اول اول سرسید زیادہ تر اس میں پولٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لئے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے ؛اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔'' ۱۰۱؎

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اس خبار کا مقصد تھا کہ ہندوستانیوں کے خیالات حکومت کے سامنے پیش کئے جائیں بعدازاں یہ اخبار ہفتہ میں دوبار شائع ہونے لگا۔اس میں تعلیمی، سیاسی، سماجی مضامین کثرت سے شائع ہونے لگے۔سرسید کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیانی نفرت دور ہو۔انھوں نے اس نکتے کو خوب سمجھ لیا کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ قدیم خوبیوں کو جدید اقدار میں ضم کر دیا جائے ۔مغرب کی فوقیت کو تسلیم کرتے ہوئے نئے علوم وسائنس کی روشنی میں اپنے مذہبی عقائد کو پرکھا جائے اور انھیں مضبوط کیا جائے ۔لہٰذا سرسید نے دورِ جدید کے سائنٹفک رجحان کے لحاظ سے اسلام کی عقلی تشریح کی اور اس بات کو ثابت کرنے کی حتی الامکان کوشش کی کہ اسلام کی تعلیم عقل وسائنس کے خلاف اور ناقابلِ عمل ہرگز نہیں ہے۔ اس طرح سرسید نے اسلام کو عقلی اور عملی طور پر قابل قبول بنا کر پیش کیا۔اوران کی کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا۔مسلمانوں کو نوکریاں ملنے لگیں، تجارت کرنے لگے، اور انھیں ان کے حقوق ملنے لگے۔اسی اسوسی ایشن کو قائم کرنے کا مقصد پورا ہوا۔

حالی سرسید کے سفر انگلستان کے متعلق لکھتے ہیں کہ سرسید نے جب انگلستان کے سفر کا قصد کیا تب ان کے پیش نظر دو اہم مقاصد تھے ۔ایک مغربی طریقہ تعلیم کے متعلق معلومات فراہم کرنا اور وہ اسباب وعوامل دریافت کرنا جس کے تحت مغربی مما لک کے باشندے ترقیات زمانہ سے روشناس ہوئے ۔دوسرا اہم مقصد سروليم ميور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا مدلل اور سائنٹفک جواب لکھنا تھا۔جب سرسید بنارس میں جج کے عہدے پر فائز تھے اسی دوران ولیم میور کی یہ کتاب منظر عام پر آئی۔سروليم ميور اس وقت صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔سرسید چونکہ جج کے عہدے پر فائز تھے چنانچہ اس کی بحالی اسی صورت حال میں ہوسکتی تھی کہ وہ مذہب اسلام پر میور کے اعتراضات ونکتہ چینیوں کو نظرانداز کر دیتے۔لیکن مذہب اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تقاضہ تھا کہ اعلیٰ سرکاری ملازمت چاہے چھوٹ جائیں لیکن باطل کے سامنے ہرگز سر تسلیم خم نہیں کیا جاسکتا۔حالانکہ سرسید کے احباب نے جواب لکھنے پر درپیش خطرات سے آگاہ بھی کیا تھا لیکن حق گوئی سے دستبردار ہونا سرسید کا شیوہ نہ تھا۔ان کا قلم بے تاب تھا۔سرسید چاہتے تھے کہ ولیم میور کے تمام اعتراضات کا منطقی اور استدلالی انداز میں جواب دیا جائے ۔اوراس کے لیے ہندوستان میں مواد کی کمی تھی، اور انگلینڈ کی کتب خانوں سے استفادہ کر کے ہی اس کتاب کا تسلی بخش اور منہ توڑ جواب دیا جاسکتا تھا۔ولیم

میور کی اس کتاب سے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ نئی روشنی کے پروردہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی اسلام کے خلاف خدشات پیدا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اسلام کی بقاء کے لئے ضروری تھا کہ ان شبہات کو دور کیا جائے۔

سر سید کی دلی تمنا تھی کہ مغربی ممالک کی طرح ان کا ملک بھی علوم وفنون اور دیگر ترقیات کا حامل ہو۔ ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ وہ خود انگلینڈ جائیں اور انگریزوں کی ترقی کے رازوں سے واقفیت حاصل کریں۔ سر سید کے پیش نظر کچھ مذہبی اور کچھ قومی مسائل بھی تھے۔ انھیں مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے انھوں نے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انگریزی حکومت میں چھٹی کی درخواست دی۔ یہ درخواست ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئی۔ اس میں سر سید نے اس سفر کے اغراض ومقاصد پر خاطر خواہ روشنی ڈالی:

''یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہیں کہ اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دیجائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تا کہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب وغریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقت ور اور دانا ہیں اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روبروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہموطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو

بھی اپنی پیروی کی ترغیب دو۔'' ۱۰۲؎

سرسید کی یہ درخواست منظور کی گئی اور یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ انگلینڈ کے لئے روانہ ہوئے۔ان کے اس سفر نے بہت سے الجھے ہوئے مسائل کو سمجھنے میں مدد دی۔ان کے تعلیمی منصوبوں میں اس سفر کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے ۔لندن میں انھوں نے ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کیا ۔ ہر معمولی سے لیکر اعلیٰ چیزوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ملک سے موازنہ کیا اوران کے دل میں بار بار کسک اٹھتی ہے اور جب یہ خیال آتا ہے کہ ہندوستان میں ایسی ترقیات کیوں نہیں تو وہ بے چین ہو اٹھتے ہیں ۔ چنانچہ اس سفر میں جو کیفیات ان کے دل پر گزریں نہایت سچائی کے ساتھ ان تمام واقعات کو قلمبند کر کے ہندوستان بھیجتے رہے ۔انگلینڈ کی سماجی ،تمدنی اور تعلیمی زندگی میں ہونے والی تمام ترقیات سے وہ اپنے ملک کو آشنا کرنا چاہتے تھے۔اعلیٰ تہذیب وتعلیم اوراعلیٰ معیار زندگی کی ترغیب وتحریک پیدا کرنے کے لیے ہی وہ ہندوستان میں اپنے سفر کے تمام تاثرات وکیفیات کی واضح علمی تصویریں بھیجتے رہتے تا کہ ہندوستانی عوام میں اعلیٰ تہذیب وتعلیم کی طرف رجحان بڑھے۔

لندن میں بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں اور عمائد خاص سے ملاقاتیں کیں ،وہاں کی تقریبات میں شرکت کیا کرتے ۔کئی مدبر اور سیاسی رہنماؤں نے ان کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ ہر جگہ ان کی پذیرائی کی۔ وائسرائے اور معزز انگریزوں نے انھیں اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔انھیں خطابات اور تمغہ اعزاز سے نوازا گیا۔اس سلسلے میں حالی یوں رقم طراز ہیں:

''۶اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا اوفس میں ڈیوک اوف ارگائل کے ہاتھ سے ان کو سی ۔ایس ۔آئی کا خطاب اور تمغا ملا ۔اس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی ۔تاریخ معین پر سرسید انڈیا آفس میں گئے ۔وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکرٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر ان کو اپنے ہمراہ اس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آف آرگائل ان کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چند قدم آگے بڑھے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکونس اوف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغا اپنے ہاتھ سے پہنایا اور مبارکباد کہہ کر سرسید کو رخصت کیا۔'' ۱۰۳؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت سر سید پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنہیں انگلینڈ میں ایسی قدر و منزلت حاصل ہوئی۔

اسلامی کتب خانے میں ہندوستان میں غدر کی تحریک کے باعث تباہ ہو چکے تھے ،اور سر سید بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ ولیم میور کی گستاخی کا جواب خود مغربی مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کر کے لکھیں ،تا کہ یورپی معترضین کسی جانب داری اور مذہبی حمایت پر محمول نہ کریں ۔یہی وجہ ہے کہ خود انہیں کتابوں سے مدد لے کر انھوں نے نہایت مدلل اور محققانہ طریقے سے میور کی کتاب کی تردید لکھی۔اس کے خاطر انھوں نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔عربی کتابیں فرانس اور جرمنی سے منگوائیں ۔اسلام کی حمایت میں کسی انگریز مصنف کی نایاب کتابیں نظر سے گزریں تو اسے اپنے خرچ پر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ محسن الملک کو لکھتے ہیں:

> ''مسٹر ڈیون پوٹ کی کتاب کا ترجمہ کرو۔اِلّا جب تک میں نہ آؤں اس کے چھاپنے کی فکر مت کرو۔نہایت مشکل سے میں نے ایک کتاب اور مسٹر ہگنیز کی تلاش کی ہے۔'' ۱۰۴

چنانچہ سر سید نے اپنی تمام تر کوششیں کتاب لکھنے میں صرف کر دیں ۔اور آخر ''خطبات احمدیہ'' کی تصنیف نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کی حمایت اور محبت اس میں نہیں کہ غیر قوموں کے ساتھ تعلقات سے پرہیز کیا جائے ، بلکہ اسلام کی سچی محبت سر سید کی خدمات تھیں ۔چنانچہ سر سید کی شب و روز کی مساعی سے خطبات ِ احمدیہ پایہ تکمیل کو پہنچی۔سر سید نے لندن ہی میں انگریزی ترجمہ کروا کر ۱۸۷۰ء میں شائع کروا دیا۔

اس سفر سے پہلے سر سید مسلمانوں میں تعلیمی اشاعت کے لئے ایک ورناکیولر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے لیکن اس سفر کے بعد ان کی رائے تبدیل ہوگئی۔ہندوستان میں انھوں نے جدید تعلیمی منصوبے بنائے تھے ان منصوبوں کو انگلینڈ کی سرزمین پر ایک سمت ملی ۔انھوں نے وہاں کی تعلیم وتربیت اور مغربی علوم وفنون کی ترویج کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہاں کے اخبارات و رسائل اور لائبریریوں سے گراں مایہ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جہاں ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی اور انھوں نے انگلینڈ ہی کی سرزمین پر اپنے اغراض ومقاصد کو عملی جامہ پہنایا۔اس سفر نے ان کے نظریات وافکار کے آئینے کو جلا بخشی ،انھوں نے جو منصوبے بنائے اس میں

مذہب ومعاشرت، علوم وفنون غرض زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا۔لندن میں انھوں نے اسپیکٹر اور ٹیٹلر انگریزی رسائل کا مطالعہ کیا، ان رسالوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دل میں اسی طرز پر اپنے ملک میں بھی رسالہ نکالنے کی تجویز پیدا ہوئی، چنانچہ نتیجتاً ''تہذیب الاخلاق'' منظر عام پر آیا۔اخبار و رسائل نکالتے وقت کچھ مقاصد ہوتے ہیں اکثر و بیشتر اشاعت کا سب سے اہم مقصد حصول زر ہوتا ہے، یا نام ونمود کی خواہش، لیکن تہذیب الاخلاق کا مقصد سرسید کی نظر میں قوم کی اصلاح اور نظام حیات میں تجدید فکر تھا، تہذیب الاخلاق کے اجرا سے سرسید کا اہم مقصد تھا کہ قوم کو دینی و دنیاوی کیفیت اور اس کی ابتر حالات سے باخبر کیا جائے۔اسے خواب غفلت سے بیدار کیا جائے، مردہ دلوں میں جوش، امنگ اور حوصلہ جیسی صفات پیدا کی جائیں تاکہ قوم اپنی ابتری سے ابھر کر سرگرم عمل ہوجائے، نیز سرسید اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔یہ رسالہ ایک ذہنی انقلاب کا محرک ثابت ہوا، یہ اسی رسالے کا کارنامہ تھا کہ مسلمان قومی ہمدردی اور قومی خیرخواہی جیسے الفاظ سے واقف ہوئے۔ان میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ بیدار ہوا۔مذہبی امور اور مذموم رسم و رواج میں تمیز کرنا بھی اسی رسالے کی بدولت سیکھا، اس کے علاوہ مسلمانوں میں اجتماعی قوت کی تحریک پیدا ہوئی اور قلمی میدان میں ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی۔جس میں سرسید کے حمایتی بھی تھے اور مخالفین بھی۔تہذیب الاخلاق نے سب ہی کو زورِ قلم آزمانے کا موقع دیا۔چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جو زبان چھوٹی سی چھوٹی بات ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتی تھی اس میں مشکل سے مشکل مضامین ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔سرسید کو شعر گوئی سے زیادہ مناسبت نہ تھی لیکن ان کی خواہش تھی کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے، لہٰذا حالی کے قلم سے مسدس مدوجزر اسلام منظر عام پر آئی۔ہر طرف بیداری کے آثار نظر آنے لگے، سیاست کا میدان ہو یا ادب ومعاشرت کا معاملہ، تعلیمی مسائل ہوں یا شعروادب کی زمین، ہر جگہ اصلاح ہونے لگی۔چنانچہ سرسید کی کوششوں کے نتیجے میں ادب کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا اور بہت کم وقت میں نثر و نظم کا ایسا سرمایہ فراہم ہوگیا جو باعث فخر تھا۔تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اردو ادب کو بھی کافی فائدہ پہنچا۔اس کا اثر اسلوب بیان موضوع اور غور وفکر کرنے کے طریقے پر بھی پڑا۔غرض اس نے ادب کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔سرسید نے اپنے مضامین کے ذریعہ اردو ادب میں گہرائی اور گیرائی اور وسعت پیدا کی۔اردو نثر کو اظہار مطالب کا ذریعہ بنایا۔تہذیب الاخلاق سے پہلے مبالغہ آمیز نثر کا رواج تھا تکلف وتصنع نثر کا خاص جز ہوا

کرتے تھے۔سرسید نے تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھ کر تعمیری نثر کی ابتدا کی اور یہ ثابت کیا کہ اردو نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔سرسید کی نثر غور وفکر اور خوش اسلوبی کے عنصر سے مزین تھی۔

تہذیب الاخلاق جن اغراض ومقاصد کولیکر شروع کیا گیا تھا ان میں اسے کامیابی ہوئی۔قوم کے اندر ترقی کے نشانات پائے جانے لگے، حالانکہ یہ مخالفت اور موافقت دونوں کے لئے توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں شک نہیں کہ زمانے کی سخت مخالفت کے باوجود یہ مقبول تھا۔

تہذیب الاخلاق کی تفصیل کے بعد حالی نے محمڈن کالج علی گڑھ کی مفصل کیفیات اور اس کی تعلیم وتربیت کے نتائج کا ذکر کیا ہے۔کالج قائم کرنے کے لئے انگریزی حکومت سے زمین حاصل کرنے کے واقعہ کوحالی نے بہت ہی تفصیل سے لکھا ہے۔اس سلسلے کے چند اقتباسات پیش ہیں:

> ''جس وسیع میدان میں اب محمڈن کالج علی گڑھ اور اس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانے میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریٹ ہوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی، اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کوسرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے، لیکن اب بھی قریب ۷۴ ایکڑ کی زمین باقی تھی، سرسید نے مدرسہ کے لئے کمیٹی کی طرف سے اس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔اس وقت ہنری لارنس علی گڑھ میں کلکٹر تھے، انھوں نے اس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیج دی اور سر ولیم میور نے بھی جو اس زمانے میں لیفٹیننٹ گورنر تھے اس قطعہ کے دینے کا وعدہ کرلیا، مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ مانٹی گیوٹ صاحب علی گڑھ میں قائم مقام کلکٹر ہوگئے ،۔انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لئے دیا جائے۔'' ۱۰۵؎

چنانچہ ان کی محنت کے باعث آخر کار کالج کی تعمیر کے لئے زمین تو مل گئی لیکن اب مسئلہ پیسوں کا تھا۔ حالی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

''لاٹری کے سوا انھوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی
اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی
کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا۔ جب خلیفہ سید محمد حسن خان مرحوم
وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا
ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ
روپئے طلب کئے جس پر انھوں نے ایک معقول رقم ان کے نظر کی۔ ان
کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علی گڑھ آئے، آپ سیادت
کے دعوے سے ان کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لئے پہنچے اور
وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپئے لیکر آئے۔ چندہ وصول کرنے کے
موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس
سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہ علی گڑھ میں انھوں
نے کتابوں کی دکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لئے دکان پر بیٹھے۔
نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی اپنی ریڈنگ کا جلسہ کیا، اور اسٹیج
پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔'' [۱۰۶]

غرض کالج کی تعمیر کے لئے انھوں نے ہر طرح کے طریقے آزمائے۔ حالی لکھتے ہیں کہ مدرسہ کے لئے انھوں نے کئی سفر کئے، جیسے پٹنہ، گورکھپور، الہ آباد، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدرآباد، نیل گری، بھوپال، اور جبل پور وغیرہ انھوں نے چندہ جمع کرنے کے لئے ہر طرح کی تدبیریں اختیار کیں حالی لکھتے ہیں:

''جب سے انھوں نے مدرسہ کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور
لحاظ کو جو ان کی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے
بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر ان کا نام اور ان کی رقم چندہ کی فہرست
میں بغیر ان کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی، اور ان کو صرف اس وقت
خبر ہوتی تھی جب ان سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے
تھے اور ادھر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر
دئے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ

مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارا تو اب یہ حال
ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ
سوال نہ کر بیٹھیں، ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک
دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے
کی بدملا تا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔'' ۱۰۷

اس باب میں حالی نے ٹرسٹی بل اور اس کے اختلاف کا ذکر بیان کیا ہے۔ ٹرسٹی بل کو حالی نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان باہمی اتحاد کا ترجمان قرار دیا۔ حالی کہتے ہیں کہ سرسید نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کی زندگی میں سرکاری قانون کے مطابق کالج کے لئے ٹرسٹی مقرر رکئے جائیں اور ایسے قاعدے اور قانون بنائیں جائیں جو کالج کی فلاح کے لئے مددگار ثابت ہوں۔ چنانچہ بقول حالی:

''پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر
انتظامات کے لئے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی
کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لئے بھیجیں۔'' ۱۰۸

سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہوئے اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہوں۔ چنانچہ کالج کی ترقی کے لئے انھوں نے ہر طرح کی کوششیں کیں لیکن اسی دوران ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے سرسید احمد خان بری طرح سے ٹوٹ گئے۔ جس کا ذکر حالی نے مع تفصیل یوں لکھا ہے:

''کالج کا بہت سا روپیہ بینک بنگال میں بہ صیغۂ امانت جمع رہتا تھا، جو وقتاً
فوقتاً بحسب ضرورت چکوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ
پرائمری نوٹ مالیت کالج بطور کیپٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے
جنکا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول ہوتا تھا۔ چک
بک سرسید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی، اور اس کی کنجی بھی انھیں
کے پاس رہتی تھی مگر جب چک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام
بہاری لال سرسید سے کنجی لے کر چیک نکال لیتا تھا اور اس کی خانہ پری کر
کے سرسید سے دستخط کرا لیتا تھا اور چیک جاری کر دیتا تھا۔ سرسید چونکہ

انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک
پر دستخط کر دیتے تھے کئی سال تک تو وہ ٹھیک ٹھاک کام کرتا رہا مگر جب اس
نے دیکھا کہ سیکریٹری کو اس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اس نے ہاتھ پاؤں
نکالنے شروع کئے جب چاہتا سکریٹری سے کنجی لیکر چیک نکال لیتا اور
جس قدر روپیہ چاہتا اس میں درج کر کے کبھی خود سکریٹری سے دستخط کرا
لیتا اور کبھی آپ ان کے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری کر دیتا۔ یہاں تک کہ
جب زرامانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اس نے ایک نہایت
دلیری کا کام کیا، ۴۹ ہزار کے پرامیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے بینک
کی سپردگی میں تھے اور کسی کو ان کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف
کرنے کا اختیار نہ تھا ان پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اس نے ٹرسٹیوں کی
طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً
فوقتاً جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت ہو پرامیسری نوٹوں کی کفالت پر
سودی روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کر کے اس کو
بینک میں بھیج دیا، کچھ کم ۶۳ ہزار روپیہ تو وہ زرامانت میں سے غبن کر چکا
تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا۔
یہاں تک کہ علاوہ زرامانت کے ۴۲ ہزار ۵ سو ستر روپیہ اور بینک سے
وصول کر کے خورد برد کر گیا۔'' [۱۰۹]

اس کے بعد حالی نے سر سید کی وفات کا تذکرہ کیا ہے۔ غبن والے معاملے نے سر سید کی طبیعت کو بہت حد تک مکدر کر دیا تھا۔ آخری ایام میں انہوں نے بات چیت ترک کر دی تھی۔ دوستوں کے اسرار کرنے پر کہتے:

''اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔'' [۱۱۰]

اور مارچ ۱۸۹۸ء کو سر سید اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حالی کا بیان ہے کہ:

''سر سید کی وفات پر لوگوں نے صرف زبانی مدح وثنا اور مرثیہ خوانی ونوحہ
خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ عملی طور پر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ یہ

شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت
کا نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چیٹک
ایک ایسی مردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور نا
اتفاقی میں شہرہ آفاق تھی۔'' [111]

''حیات جاوید'' کے دوسرے حصے میں حالی نے سرسید کی ترقی کے اسباب بیان کئے ہیں۔جس میں اہم سرسید کی جسمانی قابلیت، خاندانی اثرات، یورپ و مصلحین کے حالات وکارہائے نمایاں کی تقلید وغیرہ کو سرسید کی ترقی کے عوامل میں شمار کیا ہے۔مثلاً حالی لکھتے ہیں:

''سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے
ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات
کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے
جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی
شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقاتِ حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم
مساعدت نہیں کی۔وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم
خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ان کی
ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور انکی ننھیال
ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسن
تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور
اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔وہ خوش قسمتی سے بچپن میں
زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔انھوں نے
اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی۔
ان کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن کی تعلیم و تادیب
سرسید جیسے جوہر قابل کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔انھوں نے حسنِ
اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک
ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا، وہ پڑھتے لکھتے بھی

تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس
کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا
تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی
گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔'' ۱۱۲

ان کی ترقی کا ایک سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح نہیں کیا، جس کے سبب دماغی اور جسمانی صحت بحال تھی۔ حالی رقم طراز ہیں:

''سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس
برس تجرد اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی ان کے تمام بڑے بڑے
کاموں کی بنیاد تھی اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز ان کو ان کاموں کے
سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ
کیا چیز تھی جس نے چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست، ذی
استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا
اور تجرد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا۔'' ۱۱۳

اس کے علاوہ سب سے اہم جسے حالی نے سرسید کی ترقی کی اہم وجہ قرار دیا ہے وہ مذہب ہے۔ حالی کے مطابق جب تک کوئی شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ کوئی بڑا کام ظہور میں نہیں لا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مذہب ایک ایسی ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایشیائی ملکوں میں مذہبی
آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم
رکھ سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت
ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کر دیتا ہے، تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کر
دیتا ہے، آگ میں تپتا ہے، برف میں گلتا ہے، گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر نا
قابل برداشت تکلیف اٹھاتا ہے۔ مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا
ہوا ہو طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے
مقتضا کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابل عمل سمجھ
کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت

سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور
کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے
والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا
ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا
تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔'' [۱۱۴]

سرسید کی خدمات نے ملک وقوم کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ زندگی کے ہر شعبے میں کارآمد نظر آتا ہے۔ ان کی خدمات مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی سبھی میدانوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ مذہبی عقائد کے متعلق سرسید کو بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سرسید اپنی عقل وفہم کے ذریعے تمام پریشانیوں کا منہ توڑ جواب دیتے رہے۔ سب سے پہلا مسئلہ جو تعلیمی راہ میں حائل تھا وہ قومیت کا مسئلہ تھا۔ سرسید نے اپنی تمام زندگی قومی خدمت اور خیر خواہی کے لئے وقف کر دی۔ اس سلسلے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

''ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اسی سرگرمی اور
ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کش
زاہد عبادت الٰہی بجالاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی ان کے ذوق وشوق کو کم
کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے ان کی
ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر انھوں نے مخالفتیں جھیلیں، ان
کے کفر کے بے شمار فتوے لکھے گئے، ان کو دہری، ملحد، کافر اور دجال سب
کچھ کہا گیا، ان کو بارہا قتل کی دھمکیاں دی گئیں، صدہا گمنام خطوں میں
ان مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں، اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہو
سکا ان کی توہین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام
اسی ذوق وشوق کے ساتھ کیے گئے، بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اسی
قدر ان کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی۔ لوگ ان کو برا کہہ کر اور گالیاں
دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ برا سنکر اور گالیاں
کھا کر خوش ہوتے رہے۔ ان کی بہن کے انتقال کی خبر ان کو اس وقت
پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کاروائی میں مصروف تھے۔ جب تک

جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز وتکفین میں
شریک نہ ہوئے ۔ جوان بیٹے کی موت سے ان کو سخت صدمہ پہنچا پندرہ
بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک
فراموش نہ ہوا، بایں ہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور
ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلی کی آمدرفت میں مصروف ہوا
انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور
ایسے مواقع کو تابمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا دماغ تازہ
ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہوا ۔ دلی میں انھیں خیالات سے وہ
جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے ۔ لوگوں کو
سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کئے اور حق یہ ہے کہ
ان کے اعتراض بالکل بجا تھے کیوں کہ ''من جھل شیئاً
اعداہ '' الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ ان کے تمام کاموں
کی محرک کوئی ایسی روحانی امنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی خلجان غالب
نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی امنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ امنگ
بڑھتی جاتی تھی ۔'' ۱۱۵

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید پر کسی تنگ نظری یا فرقہ پرستی کا غلبہ نہ تھا اور وہ عقلی دلائل اور ذہنی شعور سے ہر معاملے میں برمحل فیصلہ لینے کے قائل تھے ۔ سرسید کے تعلقات جن لوگوں سے تھے وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان نہایت پرخلوص اور محبت سے بھرپور ہوتے تھے اور وہ اپنے دوستانہ تعلقات میں کسی مذہب وملت کا خیال دل میں نہ لاتے تھے ۔ چنانچہ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

'' ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک
ہو کر ایک گائے قربانی کے لیے خرید لی ۔ عین بقرعید کے دن نماز عید کے
بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے ۔ یہ سن کر
وہ از خود رفتہ ہو گئے ، فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی
سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں

سے چھین کر اس کے مالک کو واپس دی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت
کی اور آئندہ کے لیے قطعی ممانعت کر دی کہ کالج کے احاطہ میں کبھی کوئی
ایسا نہ کرنے پائے۔'' ۱٦٦

حالی نے سرسید کی زندگی کے جہاں بہت سے کارناموں کا ذکر کیا ہے اس میں ان کا اہم کارنامہ تعلیم کے مسائل کا حل ہے۔ سرسید نے بہت ہی غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ تمام مسائل کا حل اور تمام مصائب کا علاج جدید تعلیم ہے۔ تہذیب الاخلاق میں انھوں نے بار بار رقم کیا کہ سوئے ہوؤں کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کا کام اس وقت تک جاری رہے گا جب تک قوم میں بیداری اور خیر خواہی جیسی خوبیاں نہ پیدا ہوں گی۔ جب تک قوم جدید علم کی طرف نہ متوجہ ہو جائے اور اجتماعی قوت کا احساس پیدا ہو جائے۔ سرسید نے تعلیم کے معاملے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اور جدید تعلیم کے حصول کے لئے دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو رغبت دلائی۔ انہوں نے بے عملوں کو جدوجہد کا درس دیا وہیں ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے اندر انہیں صفات کو پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ حالی کے مطابق سرسید نے اپنی زندگی میں جن کاموں کو قومی ترقی اور خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاح کے لئے قدم اٹھایا اس میں زیادہ تر فیصلے عقلی دلائل پر ہوتے اور کوئی بھی تقلیدی قدم کسی مذہبی، سیاسی اور معاشرتی طے شدہ اصولوں پر نہیں اٹھایا۔ ان کی سیکولر خیالات کا اندازہ ان کی تحریروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں قومی نقطۂ نظر ہمیشہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں حیات جاوید کا اقتباس پیش ہے:

''ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمدردی
اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام
طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے جو اول
سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں
لوگوں کو بولنے سکھائے ہیں۔'' ۱٦۷

حالی اس سلسلے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ سرسید نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے، اس کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس

میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں ۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ
علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔فرض
کرو کہ ایک دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں ،ان میں سے
کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو،مگر اس اختلاف طبایع کی
وجہ سے اس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔اسی طرح
اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ
باہمی رنج کی پیدا نہیں ہوسکتی ۔ ہر شخص اپنے ایمان کی کا مختار بلکہ میری
رائے میں اس پر مجبور ہے۔اس لیے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں
ہے اسی کو وہ اختیار کریگا، وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا، اچھا
ہے تو اس کے لیے اور برا ہے تو اس کے لیے۔لیکن آپس کی محبت میں جو
انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جز ہے،اس سے کچھ نقصان نہیں
آسکتا۔'' ۱۱۸

مختصر یہ کہ حالی نے سرسید کی حالات سے زیادہ، حیات جاوید میں ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔
ایسا انداز اختیار کرنے میں بذات خود ان کی طبیعت کا بڑا دخل ہے ۔ چونکہ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر
بھری تھی ۔اس لئے کارناموں پر زیادہ نظر رکھنا فطری امر تھا،اور حالی کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا
کہ جہاں سرسید کی تعریف وتوصیف کرنے والے موجود ہیں وہیں تنقید کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ۔ چنانچہ
حیات جاوید کے دیباچہ میں انھوں نے اپنی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''اگر چہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس
کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں ہے کہ
کسی شخص کی بایوگرافی کریٹیکل طریقہ سے لکھی جائے ۔اس کی خوبیوں
کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات
کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔چناچہ اسی خیال سے ہم
نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک
ہم کو معلوم ہوسکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان

کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی
سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انھیں لوگوں
کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس موج خیز اور پر
آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک
گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے۔ان کو سب نے بھلا
جانا کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا برائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔وہ کہیں رستہ
نہیں بھولے کیونکہ انھوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر ادھر
قدم نہیں رکھا۔لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے
چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے،تقلید کی جڑ کاٹی ہے
، بڑے بڑے علما و مفسرین کو لتاڑا ہے،اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف
کیا ہے،قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی
ہیں،جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے
نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم
سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ایسے شخص کی
لائف چُپ چاپ کیونکر لکھی جاسکتی ہے۔ضرور ہیں کہ اس کا سونا کسوٹی پر
کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔''[119]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کو ''حیات جاوید'' کی تصنیف کے دوران کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ جہاں وہ سرسید کی لغزش کا ذکر کرنا چاہتے ہوں تب ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ لغزش کے ذکر سے کہیں کارناموں کی اہمیت نہ کم ہو جائے۔ چنانچہ ایسی حالت میں ان کا معتدل اور متوازن اسلوب کام آیا۔

سرسید کی سوانح لکھنا اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا محاکمہ کرنا آسان نہ تھا۔موضوع ان کا جتنا پسندیدہ تھا اتنا ہی اس کو گرفت میں لانا مشکل تھا۔لیکن حالی نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا۔حالی نے حیات جاوید کو مرتب کرتے وقت اپنی پسند و ناپسند کو بالائے طاق رکھا۔انھوں نے دیانت وصداقت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔حالانکہ بعض جگہوں پر سرسید کے کاموں کی تاویلیں ضرور کی ہیں،لیکن اس کے باوجود واقعات کو کہیں بھی توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے۔انھوں نے سرسید کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو پیش نظر رکھ کر کتاب

مرتب کی ہے۔اگر حیات جاوید کواردو کی بہترین سوانح عمری کہیں تو بے جانہ ہوگا۔اس کا اسلوب مدلل اوردل کش ہے۔سادہ سلیس نثر اپنی شگفتگی کے ساتھ موجود ہے۔حالی نے اس کتاب میں مورخ اور نقاد دونوں کے فرائض بحسن وخوبی ادا کئے ہیں۔انھوں نے جہاں سرسید کی زندگی اوران کے کارناموں کو جانچا اور پرکھا ہے، وہیں انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

حالی نے مغربی طریقہ سوانح نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرسید کی کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً:

''اگر چہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پرؔان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں بااینہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ ان کی لٹریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔'' ۱۲۰

حیات جاوید پر تنقید کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔کسی نے حیات جاوید کو مدلل مداحی سے تعبیر کیا تو کسی نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں محض سرسید کی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔اسی طرح اس کی ضخامت پر بھی کچھ ناقدین نے اعتراض کیا۔حالی کی حیات جاوید کے متعلق علامہ شبلی نے مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ۷ اگست ۱۹۰۰ء کے ایک خط میں اسے ''کتاب المناقب اور مدلل مداحی'' قرار دیا۔

''حیات جاوید'' کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں۔اور وہ بھی غیر مکمل خیر وللناس فیما یعشقوں مذاہب۔'' ۱۲۱

دوسری مرتبہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں لکھا:

''حیات جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے،اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بد طینتی ہے،لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔۔۔بہر حال میں حیات جاوید کو محض ''مدلل مداحی'' سمجھتا ہوں۔'' ۱۲۲

لیکن اس اعتراضات کے باوجود کئی ناقدین نے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے بقول ڈاکٹر عبدالقیوم:

''بہ حیثیت مجموعی سرسید کی لائف اس سے بہتر اب تک کسی شخص نے نہیں لکھی۔ اپنی خامیوں کے باوجود سرسید اور ان کے عہد کے مطالعے کے سلسلے میں کوئی شخص اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔'' ۱۲۳؎

ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حیات جاوید' پر یہی سب سے بڑا اعتراض ہے کہ حالی نے یہاں فن سے شناسائی کا اچھا ثبوت نہیں دیا ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ ''حیات جاوید' 'اردو زبان کی سب سے اچھی سوانح عمری ہے اور اس لائق بھی ہے کہ دنیا کی اچھی کتابوں کی صف میں شامل کی جائے۔'' ۱۲۴؎

ڈاکٹر سید عبداللہ حیات جاوید کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''حیات جاوید کو اس لحاظ سے حالی کے اسلوب کا شہکار کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ان کے قلم نے بڑی ہمہ گیری قدرت اور وسیع تصرف کا ثبوت دیا ہے۔ سادگی، پاکیزگی، متانت، لطیف نکتہ سنجی ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ ان کی علمی تحریریں بھی اس وصف خاص سے متصف ہیں۔ ان کی عبارت میدان میں بہنے والے کسی نرم سیر دریا کی طرح ہے کہ راستے کی سب منزلوں کو الگ الگ ہمواری کے ساتھ طے کرتا جاتا ہے اور سطح پر معمولی شکن بھی پیدا نہیں ہوتا۔'' ۱۲۵؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ حیات جاوید خوبیوں اور خامیوں کا مرکب ہے۔ کچھ واقعات اور معاملات سرے سے بیان ہی نہیں کئے تو کچھ واقعات کا محض سرسری بیان ملتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کتاب پر جتنے اعتراضات ہوئے ہیں اتنی ہی اس کی اہمیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ حیات جاوید کا اسلوب مدلل اور دلکش ہے۔ بقول سلام سندیلوی:

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی کی سوانح عمریوں میں کچھ خامیاں موجود ہیں، مگر ان خامیوں کے باوجود حالی کی سوانح عمریوں میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہیں اور خوبیوں کی تعداد خامیوں سے بہت زیادہ ہے۔

مثلاً حالی اپنی سوانح عمریوں کے لیے بہت کاوش سے مواد اکھٹا کرتے ہیں۔وہ واقعات کی صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ان کو اپنے ہیرو سے بہت عقیدت ہوتی ہے اس کے باوجود وہ اپنے ہیرو کو فرشتہ بنا کر نہیں پیش کرتے ہیں۔وہ ہیرو کے واقعات بیان کرتے وقت اپنی ذات کو الگ رکھتے ہیں اور انانیتی لہجہ نہیں اختیار کرتے ہیں۔ان کی نثر سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ان کی تحریر تصنع اور آورد سے پاک نظر آتی ہے یہ ساری خوبیاں ایسی ہیں جو حالی کو ایک عظیم سوانح نگار بنا دیتی ہیں۔دراصل حالی ایک پیدائشی سوانح نگار ہیں۔ان کے متعلق سید عبداللہ نے نہایت حسین بات کہی ہے:''اردو میں سوانح نگاری بہت سے اہل قلم نے کی ہے۔مگر ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس سوانح نگار کا دل ہو۔سوانح نگاری کا دل صرف حالی کے حصے میں آیا۔'' [۱۲٦]

## حوالہ جات

۱۔فروغ اردو حالی نمبر، حصہ اول،فروری ۱۹۵۹ءص ۲۹
۲۔فروغ اردو حالی نمبر، حصہ اول،فروری ۱۹۵۹ءص ۳۱۰
۳۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۱۲۔۱۱
۴۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۱۲۔۱۱
۵۔الطاف حسین حالی، مقالات حالی،ص ۲۶۷
۶۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۱۲
۷۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۱۳۔۱۲
۸۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۱۴
۹۔ڈاکٹر مولوی عبدالحق، بحوالہ اردو کی اردو نثر نگاری ص ۱۲۶
۱۰۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،ص ۸۰۲
۱۱۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۲۰۔۱۹
۱۲۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۲۶
۱۳۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۲۰
۱۴۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۶۱۔۶۰
۱۵۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۳۶۔۳۵
۱۶۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۲۵
۱۷۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۳۴
۱۸۔ڈاکٹر عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری،ص ۱۲۳
۱۹۔مہدی افادی، افادات مہدی،ص ۳۱۰
۲۰۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۴۲
۲۱۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی،ص ۲۵۵

۲۲۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی، ص ۸۱۔۷۷

۲۳۔الطاف حسین حالی، حیات سعدی، ص ۲۴۶

۲۴۔ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقاء، ص ۱۱۱

۲۵۔ڈاکٹر عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، ص ۱۴۴

۲۶۔حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، ص ۵۵۷

۲۷۔فروغ اردو، حالی نمبر، حصہ اول، فروری ۱۹۵۹ء ص ۳۰۵

۲۸۔سلام سندیلوی، تجربہ و تجزیہ، ص ۱۲۴

۲۹۔شیخ اکرام، غالب نامہ ص ۹۹۔۹۸

۳۰۔مولوی عبدالحق، یاد حالی، رسالہ ص ۲۳۷

۳۱۔شیخ اکرام، غالب نامہ ص ۹۷

۳۲۔ڈاکٹر عبدالقیوم حالی کی اردو نثر نگاری ص ۹۸۔۱۹۹

۳۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۹

۳۴۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۶

۳۵۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۵

۳۶۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۲۰

۳۷۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۰

۳۸۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۶

۳۹۔سلام سندیلوی، تجربہ و تجزیہ، ص ۱۳۲

۴۰۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۱۳۔۱۴

۴۱۔غالب کا ایک فرضی استاد، عبدلودود، غالب نمبر علی گڑھ میگزین ۱۹۴۸ء، ص ۴۹

۴۲۔سلام سندیلوی، تجربہ و تجزیہ، ص ۱۳۲

۴۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۲۷

۴۴۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۵۷

۴۵۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۵۷

۴۶۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۵۸

۴۷۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۵۸

۴۸۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۷۲

۴۹۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۷۳

۵۰۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۷۸

۵۱۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۸۰

۵۲۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۸۲

۵۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب ص ۲۰

۵۴۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۸۳۔۸۲

۵۵۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۴۳۔۴۲

۵۶۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ۷۹۔۷۸

۵۷۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۹۵

۵۸۔سلام سندیلوی، تجربہ وتجزیہ، ص ۱۳۴

۵۹۔سلام سندیلوی، تجربہ وتجزیہ، ص ۱۳۵

۶۰۔فروغ ارود، حالی نمبر، حصہ اول، ص ۳۰

۶۱۔آل احمد سروسر، کچھ خطبے کچھ مقالے، ص ۱۵۷

۶۲۔آل احمد سروسر، کچھ خطبے کچھ مقالے، ص ۱۵۸

۶۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۲۳

۶۴۔آل احمد سروسر، کچھ خطبے کچھ مقالے، ص ۱۶۹

۶۵۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۲۹۔۱۲۸

۶۶۔آل احمد سرور، مسرت سے بصیرت تک، ص ۱۵۴

۶۷۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۳۱

۶۸۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۳۳

۶۹۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۴۳

۷۰۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۴۵

۷۱۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، ص ۱۴۵

۷۲۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۱۴۷۔۱۴۶

۷۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۱۴۵۔۱۴۶

۷۴۔ڈاکٹر ابومحمد سحر، شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ،ص ۱۳۵۔۱۳۴

۷۵۔نظم طباطبائی، مضمون شرح غالب،ص ۳۲۲

۷۶۔ڈاکٹر ابومحمد سحر، شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ،ص ۱۳۶۔۱۳۵

۷۷۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، نقش حالی، حصہ دوم،ص ۴۲۰

۷۸۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۱۹۷

۷۹۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۱۹۹

۸۰۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۲۰۱۔۲۰۲

۸۱۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۲۰۳

۸۲۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۲۰۴

۸۳۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۲۱۳

۸۴۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب،ص ۲۱۱

۸۵۔ڈاکٹر عبدلقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، ص ۲۰۰

۸۶۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۱۳۔۱۲

۸۷۔الطاف حسین حالی، حیات جاوید،ص ۱۹

۸۸۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۲۱

۸۹۔سلام سندیلوی، تجربہ و تجزیہ،ص ۱۴۵

۹۰۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۲۳

۹۱۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۲۵

۹۲۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۲۸

۹۳۔ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری،ص ۱۷۶

۹۴۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۲۶

۹۵۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۳۲۔۳۱

۹۶۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص ۵۰۔۴۹

۹۷۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۵۱

۹۸۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۶۱۔۶۰

۹۹۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۷۔۳۲۶

۱۰۰۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۱۲۸

۱۰۱۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۱۳۱

۱۰۲۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۵۰۔۱۴۹

۱۰۳۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۱۵۵

۱۰۴۔سیدراس مسعود(مرتبہ)،خطوط سرسید،ص۴۵

۱۰۵۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۱۸۷

۱۰۶۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۱۹۵

۱۰۷۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۰۲

۱۰۸۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۷۲

۱۰۹۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۷۹۔۲۷۸

۱۱۰۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۸۳

۱۱۱۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۹۴

۱۱۲۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۳۰۱۔۳۰۰

۱۱۳۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۳۰۳۔۳۰۲

۱۱۴۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۳۰۴

۱۱۵۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۳۱۱۔۳۱۰

۱۱۶۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۷۸۶

۱۱۷۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۳۵۷

۱۱۸۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۷۸۶

۱۱۹۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۶

۱۲۰۔الطاف حسین حالی حیات جاوید،ص۲۲۲

۱۲۱۔سیدسلیمان ندوی(مرتبہ)،مکاتب شبلی حصہ اول،ص۲۵۔۱۲۴

۱۲۲،سید سلیمان ندوی (مرتبہ) مکاتب شبلی حصہ اول،ص۱۳۴

۱۲۳۔ڈاکٹر عبدالقیوم،حالی کی اردو نثر نگاری،ص۲۹۹

۱۲۴۔ڈاکٹر عبدالقیوم،حالی کی اردو نثر نگاری،ص۲۹۹

۱۲۵۔ڈاکٹر سید محمد عبداللہ،وجہی سے عبدالحق تک،ص۳۵۲۔۳۵۱

۱۲۶۔سلام سندیلوی،تجربہ وتجزیہ،ص۱۵۵

# باب چہارم

## ﴾......شبلی کی سوانح نگاری......﴿

اردو ادب میں مولانا شبلی نعمانی کا نام کئی حیثیتوں سے لیا جاتا ہے۔شبلی بیک وقت مورخ بھی تھے اور معلم بھی،محقق بھی تھے اور نقاد بھی،شاعر بھی تھے اور سوانح نگار بھی۔اردو ادب میں ان کی نمایاں حیثیت ایک سوانح نگار اور نقاد کی ہے۔شبلی نعمانی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے سید عابد حسین لکھتے ہیں:

''یوں تو شبلی شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی،
معلم بھی تھے اور مصلح بھی،مگر ان کی یہ سب حیثیتیں تابع تھیں۔ایک
مرکزی حیثیت سے وہ اسلامی تہذیب کے ترجمان تھے۔'' [1]

مولانا شبلی کثیر التصانیف مصنف ہیں۔انہوں نے علمی ادبی ،تحقیقی ،تاریخی ،تنقیدی اور سوانحی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور علم و فن کا حق ادا کر دیا ہے۔ان کی نگارشات اور تخلیقات سے متعلق آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''انہوں نے اردو میں تاریخی ذوق پیدا کیا۔خود بڑی اچھی سوانح عمریاں
اور تاریخیں لکھیں اور تحقیق و تدقیق ،واقعات کی چھان بین اور ماخذ کی
تلاش اور تاریخ میں ایک صاف اور واضح نقطۂ نظر ان سب کی اہمیت
دکھائی اور جتائی۔انہوں نے ادب،سیاست،تعلیم،مذہب،فلسفہ سب کو
متاثر کیا اور سب پر اپنا کچھ نہ کچھ نقش چھوڑا۔وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر
طبیعت رکھتے تھے۔انہوں نے اردو نثر کا دامن بہت وسیع کیا اور اسے

کہاں سے کہاں پہنچادیا۔'' ۲؎

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد سوانح نگاری کی تاریخ میں دوسرا بڑا نام مولانا شبلی کا ہی لیا جاتا ہے۔ جہاں حالی کی سوانح عمریوں نے اردو ادب میں اس صنف کی بنیاد ڈالی وہیں شبلی کی سوانحی تصانیف نے اس عمارت کو بلند کیا۔ دونوں نے صنف سوانح کو مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا، لیکن سوانح لکھنے کا انداز دونوں کا جداگانہ ہے۔

شبلی کی سوانح عمریوں میں المامون، النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ جن میں عظیم المرتبت ہستیوں کے بارے میں اردو زبان میں اتنا معتبر اور مستند مواد جمع ہو گیا ہے کہ ان کے حالات زندگی، علمی کارنامے اور فکری بصیرت مربوط طریقہ سے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن شبلی کی سوانح عمریوں میں سوانح نگاری کے ساتھ تاریخی اجزاء بھی اتنے مدغم ہو گئے ہیں کہ وہ تاریخ کے ضمن بھی زیر بحث آتے رہیں گے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے پیش نظر صرف سوانح نگاری نہیں ماضی کا احاطہ بھی تھا۔ انہوں نے مختلف مباحث پر محققانہ اور عالمانہ نظر ڈالی ہے۔ اور اپنے اسلوب میں دلچسپی اور شگفتگی پیدا کر دی ہے۔

انگریزوں نے جب ہندوستان کو پوری طرح سے حاصل کرلیا اور اپنی عظمت اور بڑائی کے قصے سنا سنا کر ہندوستان کی عوام کو مرعوب کرنے کی کوشش کرنے لگے جس کے نتیجے میں یہاں کے جدید تعلیم یافتہ لوگ یورپین کو قابلیت اور دانش مندی کا سرچشمہ سمجھنے لگے۔ دوسری طرف انگریزوں نے اس بات کو بھی اپنا فرض بنا لیا کہ جس طرح سے بھی ہو ہمیں مسلمانوں کی تاریخ میں ردوبدل کرنا ہے تاکہ اس غلط فہمی کے تحت وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں، اور اپنے آباواجداد اور اپنے اسلاف سے اتنی نفرت ہو جائے کہ وہ ان کا نام اپنے نام کے ساتھ لیتے ہوئے شرمائیں۔ خود شبلی اس بات کو اس طرح لکھتے ہیں:

> ''یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیہ کاری کے واقعات کو اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں یقین آچلا اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔'' ۳؎

اس احساس کمتری بلکہ ذہنی غلامی سے نکالنے کی واحد صورت یہ تھی تاریخ اسلام کے تابناک پہلوؤں سے مسلمانوں کا تعارف کرایا جاتا اور انہیں محرومی وپسپائی سے نجات دلا کر عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا جاتا ،تاریخ اسلام کی نامور شخصیتوں پر قلم اٹھانے سے شبلی کا ایک اور مقصد اردو ادب کو علم وفن کے بیش بہا سرمایہ سے مالا مال کرنا تھا،اس مقصد سے انہوں نے اہل قلم حضرات کو عربی وفارسی کے بجائے اردو میں تصنیف وتالیف کی ترغیب دی اور خود بھی اس زبان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔

اس تمہید سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سوانح نگاری کے میدان میں قدم رکھنے سے علامہ شبلی کے دو مقاصد تھے اول مشاہیر اسلام کے احوال سے مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلانا ،دوم زبان وادب کے دامن کو وسیع کرنا۔شبلی چاہتے تھے کہ مشاہیر اسلام کے تعارف میں ان کے کارناموں کو اتنے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا جائے کہ مخالفین اسلام مرعوب ہو کر اپنے اعتراضات پر خود شرمندہ ہو جائیں ۔اس کام کو انجام دینے کے لیے انھوں نے سلسلہ ناموران اسلام کے تحت سوانح نگاری کا کام شروع کیا۔اس سلسلے میں انھوں نے ان ناموں کو منتخب کیا جن کی عظمت اور حکمت سے پوری دنیا واقف ہے۔اس سلسلے میں شبلی خود لکھتے ہیں:

> ''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھوں ،لیکن مشکل یہ تھی کہ نہ میں تمام خاندانوں کا استقصا کر سکتا تھا نہ کسی خاص سلسلہ کے انتخاب کی مجھ کو کوئی وجہ مرجح ملتی تھی ،آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ رائل ہیروز آف اسلام (یعنی نامور فرمانروایان ِاسلام) کا ایک سلسلہ لکھوں ،جس کا طریقہ یہ ہو کہ اسلام میں آج تک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ،ان میں سے صرف وہ نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقہ میں عظمت حکومت کے اعتبار سے اپنا ہمسر نہ رکھتے تھے،اوران کے حالات اس ترتیب اور جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو۔'' [۴]

## المامون:

شبلی نے تاریخ کے جن نامور فرمانروایان اسلام کو اپنی سوانحی تصنیفات کا حصہ بنایا اس کی سب سے پہلی کڑی خلافت عباسیہ کے جلیل القدر خلیفہ مامون الرشید ہیں۔علامہ شبلی کی یہ پہلی تصنیف ''المامون'' کے نام سے ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کے قیام کے دوران شائع ہوئی۔ یہ تصنیف مامون الرشید سے علامہ شبلی کی عقیدت و محبت کا پتہ دیتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مامون الرشید کی عظمت و محبت شبلی کے دل و دماغ میں پہلے سے ہی پیوست ہو چکی تھی۔المامون کے اس اقتباس سے اچھی طرح اس کا اندازہ لگتا ہے:

> ''اسلام کو آج تیرہ سو برس سے کچھ اوپر ہوئے اس وسیع مدت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل و کمال کے اعتبار سے مامون کی شان یکتائی کا حریف ہوسکتا۔افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء و سلاطین کے پہلو میں جگہ دی، ورنہ شاعری 'ایام العرب' ادب،فقہ،فلسفہ،کون سی بزم ہے جہاں فخر و شرف کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا۔'' ۵

مامون الرشید سے علامہ شبلی کی عقیدت و محبت کا اندازہ اس بات بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے خلافت عباسیہ کا ہیرو ہارون رشید کو نہیں بلکہ مامون الرشید کو قرار دیا ہے۔انہوں نے مامون کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جا بجا ان کی تعریف بھی کی ہے۔مگر کمال یہ ہے کہ عقیدت و محبت کے باوجود تصنیفی انصاف اور قلمی دیانت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔انہوں نے اگر مامون کے محاسن کو اجاگر کیا ہے تو اس کے معائب کی بھی بھرپور نشاندہی کی ہے۔مامون الرشید کی وہ خوبیاں جس سے شبلی متاثر ہوئے وہ ملکی انتظام و انصرام اور علوم وفنون کی سربراہی کے ساتھ اس کی ذاتی خوبیاں اور اخلاقی خصوصیات بھی تھے جو اسے دوسرے حکمرانوں سے ممتاز کرتے ہیں۔مثلاً مامون کا اپنے رعایا کو عفو درگزر کرنا جس کا ذکر خود اس کی زبانی اس طرح کیا ہے:

> ''مامون اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھ کو عفو میں جو مزہ آتا ہے اگر لوگ جان جائیں تو جرم اور نافرمانی کو میرے پاس تحفہ لے کر آئیں۔'' ۶

مامون کے عدل و انصاف کی صفت کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں تحریر فرمایا:

> ''ایک دن کسی سپاہی نے ایک شخص کو بیگار میں پکڑا، وہ دردناک آواز سے چلاّیا کہ واعمراہ! یعنی ہائے عمرؓ تم کہاں ہو۔مامون کو اطلاع ہوئی

،اس شخص کو طلب کیا اور کہا کہ کیا حضرت عمرؓ کا عدل تجھ کو یاد آیا؟ اس نے
کہا ہاں مامون نے کہا کہ ’’خدا کی قسم اگر میری رعیت حضرت عمرؓ کی سی
رعیت ہوتی تو میں ان سے بھی زیادہ عادل ہوتا۔‘‘ پھر اس کو کچھ انعام دلایا
اور سپاہی کو موقوف کر دیا۔‘‘ [7]

**علامہ شبلیؒ مامون الرشید کے مساوات کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:**

ایک دن ایک شکستہ حال بڑھیا نے دربار میں آکر زبانی یہ شکایت پیش کی
کہ ایک ظالم نے میری جائداد چھین لی ہے، مامون نے کہا ’’کس نے
اور کہاں ہے۔‘‘ اس نے اشارہ سے بتایا کہ آپ کے پہلو میں، مامون
نے دیکھا تو خود اس کا بیٹا عباس تھا۔ وزیر اعظم کو حکم دیا کہ شہزادے کو
بڑھیا کے برابر لے جا کر کھڑا کر دے، اور دونوں کے اظہار سنے، شہزادہ
عباس رک رک کر، آہستہ گفتگو کرتا تھا۔ لیکن بڑھیا کی آوز بے باکی کے
ساتھ بلند ہوتی جاتی تھی، وزیر اعظم نے روکا کہ خلیفہ کے سامنے چلا کر
گفتگو کرنا خلاف ادب ہے، مامون نے کہا نہیں جس طرح چاہے آزادی
سے کہنے دو۔ سچائی نے اس کی زبان تیز کر دی ہے اور عباس کو گونگا بنا دیا
ہے، آخر مقدمہ کا فیصلہ بڑھیا کے حق میں ہوا، اور جائیداد واپس دلا دی
گئی۔ [8]

**مامون علم دوست اور علماء کا قدر دان تھا، اس نے اپنے دور حکومت میں بڑے بڑے علمی کارناموں کی سر پرستی کی، جس کی بدولت اعلی پیمانے پر علمی خدمات انجام پائے، اور مامون کا زمانہ اس باب میں بہت زیادہ روشن ہے، اسی کے پیش نظر علامہ شبلی نے اس کے ذاتی فضل و کمال اور علمی ذوق کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:**

’’ایک دن علماء کا مجمع تھا، ہر فن کے اہل کمال دربار میں حاضر تھے، ایک
عورت فریادی آئی کہ میرا بھائی چھ سو اشرفیاں چھوڑ کر قضا کر گیا، مگر لوگوں
نے ترکہ میں مجھ کو ایک ہی اشرفی دلوائی، مامون نے ذرا دیر دل ہی دل
میں کچھ حساب لگایا، دیکھا تو سہام صحیح تھے، عورت سے کہا ہاں تجھ کو اتنا ہی

ملنا چاہئے۔اس غیر متوقع جواب پر سب کو حیرت ہوئی۔علماء نے پوچھا، امیر المومنین کیونکر؟ مامون نے کہاام متوفی کی دو بیٹیاں ہوں گی دوثلث یعنی چار سو اشرفیاں تو ان کو ملیں ، ماں بھی ہوگی ،جس کو سدس یعنی سو اشرفیاں پہونچیں،زوجہ کوثمن یعنی پچھتر ملا ہوگا،۲۵ باقی رہے،مامون نے عورت رکی طرف مخاطب ہوکر کہا،سچ کہنا تیرے بارہ بھائی ہیں،عورت نے تسلیم کیا ہاں،مامون نے کہا دو دوان کو ملی ۲۴ ہوئیں ،ایک باقی رہی ،وہ تیرا حق ہے۔'' ۹

مامون بڑا علم دوست تھا،شعراءواد با کا سر پرست تھا۔اسے علوم وفنون سے گہرا شغف تھا۔دولت اسلامیہ میں اول جس نے رصد خانہ کی بنیاد ڈالی اور بیش بہا آلات رصد یہ مہیا کئے وہ یہی نامور خلیفہ مامون ہے،اس کام کے لئے اس کے علاوہ ان لوگوں کے جو دربار میں تھے تمام ممالک محروسہ سے ہئیت و ہندسہ کے ماہرین فن طلب کئے اور ۲۱۴ھ میں بمقام شماسیہ عظیم الشان رصد خانہ قائم کیا۔

شبلی مامون کے محاسن سے گزر کران کے معائب تک بھی جاپہونچتے ہیں اوروہ مامون کی بعض اخلاقی کمزوریوں اورعیش پرستیوں کومنظر عام پرلانے سے قطعاً نہیں چوکتے ،اور مامون کی بزم عیش کا مقابلہ دورصحابہؓ سے کرتے ہوئے اسلام کی سادگی اور مامون کی رنگین مزاجی کا فرق واضح کردیتے ہیں۔وہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدراور باعظمت اسلامی حکمراں کی سادہ مزاجی اوراعتدال پسندی کا مقابلہ مامون کی مصرفانہ زندگی سے یوں کرتے ہیں:

''اس کے ساتھ اب مامون کے عہد کا مقابلہ کروکہ اس کے غیر معتدل اصرافات پر کروڑوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نکتہ چینی کی جرأت نہیں کرسکتا۔کل بیت المال (پبلک فنڈ)ایک شخص کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہےاور جس طرح چاہےاس پرآزادانہ تصرف کرسکتا ہے،اس قسم کے بے قاعدہ مصارف سے ہم یہ بات باآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ملکی عہدے کم تھےاور جس قدر بھی تھے ان کی تنخواہیں بیش قرار نہ تھیں۔بزم عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھا ہے،بےتکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں، پری

پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دور شراب چل رہا ہے، ساز چھیڑا جا رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں یاران باصفا بدمست ہوتے جاتے ہیں، آغاز خلافت میں بیس مہینے تک مامون نغمہ و سرور سے بالکل محترز رہا، چند روز دن کے بعد شوق پیدا ہوا مگر اتنا ہی کہ احتیاط کے ساتھ کبھی کبھی سن لیتا تھا، یہ حالت بھی چار برس تک قائم رہی پھر تو ایسی چاٹ پڑ گئی کہ ایک دن ان صحبتوں کے بغیر بسر نہیں کرسکتا تھا۔'' ۱۰

مامون کی عیش پرستی کی نشاندہی کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''ان مغنیوں کے سوا ایک اور طایفہ تھا جس سے مامون کے جلسوں کی زیب و زینت تھی، روم و ایشیائے کوشک کی گل اندام نازنینیں جو لٹائی کی لوٹ میں پکڑ آتی تھیں، دلال ان کو سستے داموں پر خرید لیتے تھے، اور موسیقی شاعری، ایام العرب، ادب، خوشنویسی، ظرافت، حاضر جوابی کی تعلیم دلاتے تھے، ان فنون میں کامل ہو کر وہ نہایت گراں قیمتوں پر بازار میں بکتی تھیں، مامون کے شبستان عیش میں ان حوروشوں کا ایک بڑا جھرمٹ رہتا تھا جن کی خریداری اور تربیت نے خزانہ عامرہ کو اکثر زیر بار کر دیا تھا۔'' ۱۱

مامون میں بہت ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے اندر خامیاں بھی تھیں جس کے تذکرہ نے شبلی کی صداقت پسندی کو نمایاں کر دیا ہے:

''اس غیر متوقع فتح کی خوشی میں مامون جیسے رقیق القلب شخص کو بھی ایسا سنگ دل بنا دیا کہ اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوش خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔'' ۱۲

سرسید نے شبلی کی سوانح نگاری میں صدق بیانی کا تذکرہ کرتے ہوئے المامون کے دیباچے میں لکھا ہے:

''عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بہ دستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے، جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے

بھونڈی ، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے پن کو
زیادہ بھونڈا۔اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔'' ۱۳؎

شبلی کی یہ تصنیف ''المامون'' دوحصوں میں منقسم ہے ۔پہلے حصے میں مامون کی ولادت و طفولیت، تعلیم وتربیت ، ولی عہدی ، مامون وامین کی مخالفت ،تخت نشینی ،خانہ جنگیاں ،فتوحات ملکی ،بغداد کی تہذیب وثقافت اور وفات تک کے حالات مذکور ہیں ۔جس سے اس زمانے کے احوال وکوائف سے خاصا واقفیت ہوجاتی ہے ۔جس میں مامون نے آنکھیں کھولی ۔سلسلہ بنوامیہ کی حریفانہ طاقتیں ، بنوامیہ کی سلطنت ، ہاشمیوں کی کوششیں ،اوردولت عباسیہ کے آغاز کا اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے ۔دوسرے حصہ میں سلطنت کے انتظام وانصرام ،آمدنی کے ذرائع ،فوجی حکمتیں ،عدالتی کارروائیاں ، ہارون کی خلوت وجلوت ،ان کے مشاغل ،جلوسی آداب ،اس دور کی طرز زندگی ،سلطان کے اخلاق وعادات ، نیز ان تمام کارناموں کا ذکر اتنی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ قارئین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں ۔

شبلی کی یہ سوانحی تصنیف اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔جس میں جدید معیار و مذاق کے مطابق بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں سوانحی عناصر کو یکجا کیا گیا ہے اور قارئین کے معیار و مذاق کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے گلدستۂ تحریر بنا کر پیش کیا گیا ہے ،مثلاً شبلی نے مامون کی تاریخ پیدائش بیان کرنے کے لئے وقت اور حالات کا سراپا کھینچ دیا ہے ۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ربیع الاول ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا ، اس کی ولادت کی رات بھی عجیب
رات تھی جس میں ایک خلیفہ (ہادی) نے وفات پائی ،دوسرا ہارون رشید
تخت نشیں ہوا ،تیسرا مامون عالم وجود میں آیا ،خلیفہ مہدی نے وصیت کی
تھی کے میرے بعد ہادی تخت نشین ہو ،اوراس کے بعد ہارون ، ہادی نے
بدنیتی سے ہارون کو محروم کرنا چاہا ،اور چونکہ ہارون خانہ جنگیوں سے ہمیشہ
پرہیز کرتا تھا ،اس لئے ممکن تھا کہ ہادی اپنے خودغرضانہ ارادہ میں
کامیاب ہوجاتا لیکن موت نے دفعتہً اس کی تمام امیدوں کو خاک میں
ملا دیا ، ہارون بستر خواب پر سو رہا تھا کہ وزیر اعظم یحییٰ نے جگا کر مژدۂ
خلافت سنایا ، ہارون نے نہایت یاس سے کہا ،''دیکھو! تم ہنسی کرتے ہو ،

بھائی صاحب سن لیں گے یہی ہنسی بلائے جان ہوگی ؛‘‘یحییٰ نے عرض کیا کہ’’ قضائے الٰہی نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا ،آپ اطمینان سے سر پر خلافت کو زینت دیں‘‘اسی گفتگو میں خواص مژدہ لائی کہ’’مشکوی معلیٰ میں وارث تاج وتخت پیدا ہوا‘‘یہی وہ مبارک فال لڑکا تھا جس کی قسمت میں مامون الرشید اعظم ہونا لکھا تھا،ہارون نے مبارک فالی کے لحاظ سے عبداللہ نام رکھا، کیونکہ بانی دولت عباسیہ یعنی خلیفہ سفاح کا بھی یہی نام تھا، مامون کی ماں ایک کنیز تھی ،جس کا نام مراجل تھااور بادغیس ہرات کا ایک شہر ہے وہیں پیدا ہوئی تھی،علی بن عیسیٰ گورنر خراسان نے اس کو ہارون کی خدمت میں پیشکش بھیجا تھا،افسوس ہے کہ مراجل دو،ہی چار روز کے بعد انتقال کر گئی اور مامون کو مادر مہربان کے دامن شفقت میں پلنا نصیب نہ ہوا۔‘‘ [۱۴]

علامہ شبلی نے مامون کی ذہانت وفطانت کے جوہر کونمایاں کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’ایک دن سورہ صف کا سبق تھا،کسائی حسب عادت سر جھکائے سن رہا تھا،جب مامون اس آیت پر پہنچا،یا یھاالذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون ،(اے ایمان والوں،وہ بات کیوں کہتے ہو؟ جو کرتے نہیں ) تو بے اختیار کسائی کی نظر اٹھ گئی مامون نے خیال کیا کہ میں نے شاید آیت کے پڑھنے میں کچھ غلطی کی ،مگر جب پھر مکرر پڑھا تو معلوم ہوا کہ صحیح پڑھی تھی،تھوڑی دیر کے بعد جب کسائی چلا گیا تو مامون ہارون کی خدمت میں حاضر ہوا،اورعرض کی کہ اگر حضور نے کسائی کو کچھ دینے کے لئے کہا تو ایفائے وعدہ فرمایئے ، ہارون نے کہا’’ہاں اس نے قاریوں کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی،جس کو میں نے منظور بھی کیا تھا،کیا اس نے تم سے کچھ تذکرہ کیا، مامون نے کہانہیں ، ہارون نے پوچھا پھر تم کو کیونکر معلوم ہوا، مامون نے اس وقت کا ماجرا عرض کیا اور کہا کہ خاص اس آیت پر کسائی کا دفعتہً چونک پڑنا بے

وجہ نہیں ہوسکتا تھا، ہارون اپنے کم سن بیٹے کی اس ذہانت سے نہایت
متعجب اور خوش ہوا۔'' ۱۵

علامہ شبلی نے اپنے ہیرو کے فضل وکمال کی ابتدائی اٹھان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یزیدی نے مامون وامین کو برجستہ گوئی اور حسن تقریر کی بھی تعلیم دی تھی،
ان دونوں کی قابلیت پر یزیدی کو خود تعجب ہوتا تھا، اور وہ کہا کرتا تھا
کہ ''خلفائے بنوامیہ کے لڑکے قبائل عرب میں بھیج دئے جایا کرتے تھے
کہ شستہ بیانی سیکھیں، مگر تم تو گھر بیٹے ان سے کہیں زیادہ فصیح اور زبان
آور ہو۔'' اول اول اس نے جمعہ کے دن ایک بڑے مجمع میں جو فصیح و بلیغ
خطبہ پڑھا ایسے پرتاثیر لہجہ میں پڑھا کہ تمام حاضرین کے دل دہل گئے
اور اکثر لوگ رو پڑے۔'' ۱۶

اسلامی فتوحات جس تیزی اور رفتار سے دور صحابہ و بنوامیہ کے عہد حکومت میں ہوئیں، اس سے دولت عباسیہ کی تاریخ اور خود مامون کا دور بھی سرے سے خالی نظر آتا ہے، وجہ یہ کہ مامون کا دور شروع سے ہی خانہ جنگیوں اور بغاوتوں سے دوچار رہا، مگر ہاں مامون نے اپنے دور میں فتوحات اسلامی کے دائرہ کو کم بھی نہیں ہونے دیا، شبلی نے اس کو مامون کی بلند حوصلگی قرار دیا ہے اور اس باب میں مامون کو اپنے اسلاف ہارون رشید، منصور، مہدی کا ہمسر قرار دیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگرچہ مامون کا عہد حکومت شروع ہی سے خانہ جنگیوں اور بغاوتوں میں
الجھا رہا، تاہم اس کے وسیع حوصلوں نے فتوحات اسلامی کا دائرہ تنگ
نہیں ہونے دیا، صحابہ اور بنی امیہ کی سی عظیم فتوحات تو دولت عباسیہ کی
تاریخ میں سرے سے ناپید ہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میدان میں
مامون اپنے نامور اسلاف ہارون الرشید، منصور، مہدی سے کچھ پیچھے
نہیں ہے۔'' ۱۷

جس طرح عہد بنوامیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ملکی فتوحات، تخت وتاج اور حکومت وسلطنت کی عظیم کامیابیاں ملیں، علامہ شبلی نے خلافت عباسیہ میں مختلف علوم وفنون میں بیش بہا تصنیف وتالیف اور قلمی خدمات

کوعہد بنوامیہ کی ملکی فتوحات کا بدل قرار دیتے ہوئے قلمی فتوحات سے تعبیر کیا ہے اور اسے اس دور کی عظیم کامیابی بتایا ہے، جس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

''بنوامیہ کے قبضہ میں صرف تلوار تھی ، بخلاف اس کے دولت عباسیہ کے ہاتھ میں قلم تھا اس لحاظ سے اگر اس خاندان کی ملکی فتوحات زیادہ وسیع نہ ہوں تو نہ کچھ تعجب ہوسکتا ہے نہ ہم اس پر کوئی الزام عائد کر سکتے ہیں، عباسیوں کو جس چیز نے دنیا کی تاریخ میں زیادہ نامور کر دیا وہ ان کے قلم کی فتوحات ہیں، جس کا اقرار ایشیا و یورپ دونوں کو ہے، اور جس کی وجہ سے یورپ کی استادی کا مژدۂ فخر آج بھی مسلمانوں کے دماغ کو مختل رکھتا ہے۔''[۱۸]

مامون صرف ۴۸ برس کا تھا، تو داعی اجل کو کس طرح لبیک کہا وہ علامہ شبلی سے سنیے:

مامون نے مرنے سے ذرا پہلے تمام افسران فوج ، علما قضاۃ ، اور خاندان شاہی کو جمع کیا، اور نہایت موثر لفظوں میں وصیت کی جس کا مختصر مضمون یہ ہے:

مجھ کو اپنے گناہوں کا اقرار ہے ، بیم وامید دونوں مجھ پر حاوی ہو رہے ہیں، لیکن جب بھی خدا کے عفو کا خیال کرتا ہوں ، تو امید کا پلہ گراں ہو جاتا ہے، جب میں مر جاؤں تو مجھ کو اچھی طرح غسل دو، وضو کراؤ، کفن بھی اچھا ہو، پھر خدا کی حمد و ثنا پڑھ کے مجھ کو تابوت پر لٹا دو، تدفین میں جہاں تک ممکن ہو جلدی کرو، جو شخص کبیر السن اور رشتہ میں سب سے زیادہ قریب ہو، وہ نماز پڑھائے ، نماز میں تکبیر پانچ بار کہی جائے ، قبر میں وہ شخص اتارے جو رشتہ میں قریب ہو، اور مجھ سے محبت رکھتا ہو، قبر میں میرا منہ قبلہ کی طرف رہے، سر اور پاؤں پر سے کفن ہٹا دیا جائے ، پھر قبر کو برابر کر کے لوگ چلے جائیں اور مجھ کو میرے اعمال کے ساتھ چھوڑ دیں، کیونکہ تم لوگ مل کر بھی نہ مجھ کو آرام پہنچا سکتے ہو، نہ میری تکلیف دفع کر سکتے ہو، ہو سکے تو بھلائی سے میرا نام لو، ورنہ چپ رہو، کیونکہ برا کہنے سے تم پر بھی مؤاخذہ ہوگا، میرے لئے کوئی شخص چلا کر نہ روئے ، شاید میں

بھی اس کے ساتھ مواخذہ میں آؤں ۔'' [۱۹]

یہ اس شخص کے عالم نزع کی تصویر ہے، جس کی شادی کے جشن کے موقع پر پانچ کروڑ درہم خرچ کیے گئے، اور جس کے طرب ونشاط کی مرقع آرائی او پر گزر چکی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، وہ عالم بقا کو نہیں بلکہ کسی سفر پر جا رہا تھا تدفین کی ساری ہدایتیں دے کر اللہ تعالی کی طرف رجوع کر کے کہتا ہے:

''تعریف کے قابل صرف خدا کی ذات ہے، جس نے سب کی قسمت میں مرنا لکھ دیا ہے، اور بقا میں آپ یگانہ رہا، دیکھو میں کس اوج کا تاجدار تھا، لیکن حکم الٰہی کے سامنے کچھ اور نہ چل سکا، بلکہ حکومت نے میری آئندہ زندگی اور پر خطر کر دی، اے کاش عبداللہ (مامون کا اصلی نام) نہ پیدا ہوتا۔'' [۲۰]

یہ تذکرہ ایک ایسے تاجدار کا ہے جس کی حکومت کا دائرہ بقول شبلی تمام عالم اسلام کو محیط تھا، اسی عالم میں وہ اپنے ولی عہد کو اپنے پاس بلا کر کہتا ہے:

''ابواسحٰق! میرے پاس آؤ، اور میرے حال سے عبرت پذیر ہو، خدا نے خلافت کا طوق تیری گردن میں ڈالا ہے، تجھ کو اس کی طرح رہنا چاہیئے جو مواخذۂ الٰہی سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے، رعایا کی بھلائی کا جو کام پیش آئے، اس کو سب کاموں پر مقدم رکھنا، زبردست عاجزوں کو ستانے نہ پائیں، ضعیفوں سے محبت اور آشتی سے پیش آنا، جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں، ان کی خطاؤں سے اغماض کرنا، اور سب کے روزینے اور تنخواہیں بر قرار رہیں۔'' [۲۱]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مامون اپنے بستر مرگ پر بھی اپنی حکومت وسلطنت کی فلاح کا کس قدر خواہاں تھا۔ جب یہ ساری باتیں کر چکا تو اس نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں جس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا، حاضرین میں سے کسی نے کلمۂ توحید کی تلقین کی، ایک نصرانی حکیم ابن ماسویہ نامی کو اس پر تعجب ہوا، اور وہ حقارت سے بولا کہ اپنی ہدایت رہنے دو، اس وقت مامون کے نزدیک خدا اور مانی یکساں ہیں، اس کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''مامون اس آواز سے دفعتہً چونک پڑا، اس قدر غضب ناک ہوا کہ اس
کے تمام اعضا تھرانے لگے، چہرہ اور آنکھیں بالکل سرخ ہوگئیں، ہاتھ
بڑھا کر چاہا کہ ابن ماسویہ کو پکڑے، اور اس بدگمانی کی پوری سزادے مگر
اعضا قابو میں نہ تھے منہ سے کچھ کہنا چاہا، زبان نے یاری نہ دی، نہایت
حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اسی
حالت میں خدا نے اس کی زبان کھول دی وہ خدا کی طرف مخاطب ہوا،
اور کہا اے وہ جس کی سلطنت کبھی نہ زائل ہوگی، اس پر رحم کر جس کی
سلطنت زائل ہورہی ہے، اسی پر اس کے نفس واپسی نے الوداع کہا، اور
خدا کے سایۂ رحمت میں چلی گئی۔'' ۲۲

شبلی نے اس سوگواری کی تصویر پیش کرنے میں جو دردناک انداز بیان کا استعمال کیا ہے اس کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''مولانا شبلی پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں کہ:

اس میں مولانا کے قلم کا وہی زور ہے، جو مامون کی شبستان عیش کی مرقع
آرائی میں ہے فرق صرف غمنا کی اور نشاط انگیزی کا ہے، مولانا نے اپنے
زمانہ کی کم مایہ اردو نثر نگاری میں اپنے قلم کا جو اعجاز دکھایا ہے، اس کی مثال
اس کے معاصر اہل قلم میں کم ملے گی، اس کتاب میں اس کے ادب وانشا
کا جو گل وصنوبر ہے وہ شعر العجم کے علاوہ اس کی کسی اور کتاب میں نہیں،
شعر العجم حسن وعشق کا صحیفہ تھا، اس کے لکھنے میں قلم کی سرشاری نے ساتھ
دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن المامون میں تاریخ کے خشک واقعات
سمیٹے جارہے تھے، اس کو مولانا نے ادب وانشا کا صحیفہ بنادیا۔'' ۲۳

شبلی کی تحریروں میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی مضمون میں خشکی اور بے کیفی محسوس ہونے نہیں دیتے، اور اپنے موضوع کو دلچسپ اور خوش گوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور اس میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے المامون میں بغداد کی سیر کرا کے، ہارون وزبیدہ کے محل کے پرلطف وپرکیف داستاں چھیڑ کر قاری کو مسحور کر دیا ہے۔

## سیرۃ النعمان:

علامہ شبلیؒ نے مامون الرشید کی سوانح عمری تصنیف کرنے کے بعد اپنی سوانحی تصانیف میں ترتیب کے لحاظ سے سیرۃ النعمان کو دوسرا مقام دیا۔شبلی نے تو اسلامی حکومتوں کی ایک نہایت مفصل اور بسیط تاریخ لکھنی چاہی ، لیکن جب تمام خاندانوں کا استقصا کرنے میں انہیں مشکل پیش آئی تو اپنا فیصلہ بدل کر ''نامور فرماں روایان اسلام'' کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا پروگرام بنایا لیکن اس طریقے پر کہ اسلام میں آج تک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ، ان میں سے وہ نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقہ میں عظمتِ حکومت کے اعتبار سے اپنا ہم سر نہ رکھتے تھے ، چنانچہ المامون کے بعد انہوں نے الفاروق پر قلم اٹھایا ، اگر چہ یہ بات بھی اصول ترتیب کے خلاف تھی لیکن اس سلسلے میں انہوں نے المامون میں ہی اپنا عذر پیش کر دیا ہے،اور اصول ترتیب کی خلاف ورزی کی وجہ بیان کر دیا ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

> ''یہ حصہ جو میں قوم کے سامنے پیش کر رہا ہوں مامون الرشید عباسی کی تاریخ ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام المامون ہے، اس بات کا مجھ کو افسوس ہے کہ چند مجبوریوں کی وجہ سے اس سلسلے میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکا، اور خلفائے راشدین و بنو امیہ کو چھوڑ کر پہلے اس خاندان کو لیا، جو ترتیباً تیسرے نمبر پر تھا ، آئندہ بھی شاید میں ترتیب کی پابندی نہ کر سکوں۔'' ۲۴؎

اور یہی ہوا کہ علامہ شبلی پھر اپنی ترتیب قائم نہ رکھ سکے، چنانچہ الفاروق کا خاصہ حصہ لکھ لینے کے بعد ایک موڑ پر پہنچ کر انہیں یہ سلسلہ روکنا پڑا اور اس کا سبب بھی شبلی نے خود بتایا ہے، ملاحظہ ہو:

> ''المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں ، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر آنہیں چکیں ، اس زمانۂ انتظار میں بیکار بیٹھنا تو مشکل تھا، خیال ہوا کہ کسی اور

نامور کی لائف شروع کر دوں۔'' ۲۵

علامہ شبلی نے الفاروق کی تصنیفی کارروائی کیوں روکی کہ پورا منصوبہ ہی بدل گیا۔ جو سلسلہ ''رائل ہیروز آف اسلام'' سے شروع ہوا تھا، اب اس سلسلہ کا نام بدل کر ''نامورانِ اسلام'' ہوگیا، اور حکمرانوں کی قید سے بالکل آزاد ہوگیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

''اول اول جب مجھ کو اس کا خیال پیدا ہوا تو نہایت وسیع بنیاد پر ہوا، جس طرح میں نے خلافت وسلطنت کے مختلف خاندانوں سے ہیروز انتخاب کیے، ارادہ تھا کہ اسی طرح علوم وفنون کے جدا جدا خاندان قائم کیے جائیں اور جو لوگ ان خاص فنون میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے، اس کو اس سلسلے کا ہیرو قرار دیا جائے۔'' ۲۶

جب شبلی نے الفاروق کی تصنیف سے ہاتھ اٹھایا تو اسباب میں یہ بھی جوڑ دیا:

''خیال ہوا کہ کسی اور نامور کی لائف شروع کروں لیکن یہ دیکھ کر کہ الفاروق ناتمام ہے طبیعت رک جاتی تھی اور اس میدان میں قلم آگے نہ بڑھ سکتا تھا، ادھر یہ خلش چین نہ لینے دیتی تھی کہ علمی نام آوروں کے کارنامے دکھانے ضرور ہیں، کیونکہ اسلام میں تیغ وقلم کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔'' ۲۷

آخرکار شبلیؒ نے مامون کی سوانح عمری ''المامون'' کے بعد ''سیرۃ النعمان'' کے نام سے امام اعظم ابوحنیفہؒ پر قلم اٹھایا، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلافت وسلطنت کے بعد کسی صاحبِ علم وفن اور ذوالفضل والکمال کا انتخاب کرنے میں شبلیؒ کی نظر انتخاب امام اعظم ابوحنیفہ پر ہی کیوں جا کر رکی۔ آخر اس میدان کے دوسرے شہسوار بھی تو تھے۔ اس کے کیا اسباب تھے۔ اور یقیناً تھے۔ سب سے پہلی اور بڑی وجہ یہ کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے علامہ شبلیؒ کا قلبی لگاؤ تھا، وہ شبلی کے علمی و مذہبی ہیرو تھے، اسی گہری عقیدت کے سبب مولانا فاروق چڑیا کوٹی نے اس کے نام کے بعد نعمانی لکھنا شروع کر دیا تھا، علی گڑھ کے قیام سے پہلے علامہ شبلی کٹر حنفی تھے، علی گڑھ پہنچنے کے بعد اس کے قلب میں کشادگی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور مزاج میں اعتدال پیدا ہوگیا، لیکن امام صاحب سے ان کی عقیدت ومحبت ماند نہیں پڑی اور جیسے ہی خلافت وسلطنت سے ان کی نگاہ

ہٹی امام ابوحنیفہؒ پر جا پڑی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک اردو میں امام ابوحنیفہؒ پر کوئی با قاعدہ اور مبسوط سوانح عمری سامنے نہیں آئی تھی۔ لہذا اردو کو اس محرومی سے نجات دلانے کے لیے قلم اٹھا لینا کوئی تعجب کی بات نہیں، اس طرح اردو اور شبلی دونوں کا حق ادا ہوتا تھا۔ تیسرا سبب امام صاحب کے گرد من گھڑت، بعید از قیاس اور مضحکہ خیز روایات کا پردہ پڑا ہوا تھا، شبلی اپنے تحقیقی اور حقیقت پسند قلم کی نوک سے اس پردے کو چاک کر کے ایک ایسی شخصیت کو سامنے لانا چاہتے تھے جو حقیقی ہو، صاف ستھری ہو، پاکیزہ ہو اور فہم و ادراک کے دائرہ میں ہو۔

اس سلسلے میں شبلی فرماتے ہیں:

''ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش اعتقادی اور مبالغہ کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی، ''چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی''۔ ''تیس برس تک متصل روزے رکھے''۔

''جہاں وفات کی اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا''۔ ''نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پڑ گیا تو اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی۔ اسی طرح ایک شبہ پر بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا، ان کا صرف دس آنہ ماہوار تھا۔'' یہ اور اس قسم کے بہت سے افسانے ان کی نسبت مشہور ہیں، لطف یہ ہے کہ ہمارے مؤرخین انہیں دور از کار قصوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہوسکتا ہے۔'' ۲۸

''چوتھا سبب یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ کی ذات و شخصیت کو نہایت برگزیدہ اور بلند و بالا سمجھنے کے باوجود شبلی اسے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر نہایت کھرے انداز میں دنیائے علم و فن کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، اس لیے شبلی کا تحقیق پسند قلم بے قرار ہوا تھا، علامہ خود لکھتے ہیں: ''عام تاریخی واقعات

میں گوروا ۃ حدیث کی طرح بال کی کھال نکالی ہے تاہم کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا جس کی سند موجود نہ ہوساتھ ہی اس کا التزام کیا ہے کہ ایسی کتاب کا مواد نہ دیا جائے جو خود میری نظر سے نہ گزری ہو، کیونکہ نقل درنقل ہوکر اکثر روایتیں اپنی حالت پر قائم نہیں رہتیں۔''۲۹

سیرۃ النعمان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۱ء میں منظر عام پر آیا، مولانا کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ بھی دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کے پہلے حصے میں امام ابوحنیفہؒ کا نام ونسب ولادت وسن رشد، تعلیم وتربیت، شیوخِ حدیث، درس وافتاء، وبقیہ زندگی، اور دربار کے تعلقات، وفات، عام اخلاق وعادات، مناظرات و فتاوی، ذہانت طباعی اوراس قسم کے حالات نہایت تفصیل سے مذکور ہیں۔دوسرے حصے میں اصول اور مسائل سے جوعلم کلام اورفن حدیث سے متعلق تفصیلی بحث ہے، اورواقعات واسانید کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ فن حدیث میں ان کا کیا پایہ تھا، فن فقہ پر تفصیلی ریویو ہے، جس میں تدوین فقہ کے تاریخی حالات کے ساتھ وہ خصوصیتیں تفصیلا بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے فقہ حنفی کواورائمہ کی فقہوں پر ترجیح حاصل ہے۔خاتمہ میں امام صاحب کے ناموراورممتاز شاگردوں کے مختصر حالات ہیں۔

شبلی نے جس آب وتاب اور وقار کے ساتھ امام صاحب کی سوانح لکھی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر نیر جہاں لکھتی ہیں:

''سیرۃ النعمان میں سوانح نگار شبلی بڑی آب وتاب مگر نہایت وقار کے ساتھ سامنے آتے ہیں، اور اپنے مقصد کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، یہاں اپنے ہیرو کی بعض کمزوریوں سے چشم پوشی کرتے ہیں، نہ تاویلیں پیش کرتے ہیں اور نہ تو وکیل کا فرض انجام دیتے ہیں، دراصل یہاں امام صاحب کا مقدمہ لڑنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی، وہ امام صاحب کو بشر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، اور اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں، بشر کے ساتھ بشری کمزوریاں بھی ہوں گی، بشری اخلاق وکردار بھی ہوگا، اس لیے کہ گوشت پوست کا انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے، فرشتہ نہیں ہوتا اور اسے فرشتہ ہونا بھی نہیں چاہیئے ورنہ وہ

انسان کے لیےنمونہ نہیں بن سکتا۔شبلی نے کوشش بھی یہی کی ہے کہ امام
صاحب کوانسان ہی کے روپ میں پیش کیا جائے ،انہوں نے اخلاق و
کردار کی نہایت حقیقی تصویر کھینچی ہے، اور امام صاحب سے بے پناہ
عقیدت کے باوجود خوش اعتقادی اور جانبداری سے مطلق کام نہیں لیا
ہے، واقعات کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اور کہیں بھی
صاحب سوانح کی شخصیت کو بشریت کے دائرے سے باہر نہیں جانے دیا
ہے اور عام انسانی خصائل کو بیان کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا ثبوت نہیں
دیا ہے۔'' ۳۰

ایک سوانح نگار کو جس احتیاط اور غیر جانب دارانہ طور سے خامہ فرسائی کرنی چاہیئے اسے شبلی نے بدرجہ اتم ملحوظ رکھا ہے،اور خود اس کے متعلق کسی حکیم کے حوالے سے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''کسی نامور مقتدیٰ کے حالات لکھو تو اس کے وہ فضائل بھی ضرور دکھاؤ
جن میں انسانی فطرت کی جھلک نظر آتی ہے،اس سے لوگوں کو اچھے
کاموں میں ان کی تقلید کی خواہش پیدا ہوگی ،بخلاف اس کے کہ اگر فرشتہ
بنا کر پیش کروگے تو لوگ شاید اس کی پرستش کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن
ان کی ریس کرنے کا خیال ہرگز نہ پیدا ہوگا، وہ سمجھیں گے کہ یہ شخص دائرہ
انسانی سے باہر تھا، ہم انسان ہو کر کیوں کر اس کی تقلید کر سکتے ہیں۔'' ۳۱

علامہ شبلیؒ نے امام صاحب کی شخصیت، اخلاق و کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں دلکشی اور جاذبیت کے ساتھ پختگی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور اپنے طرز تحریر کو بھی سادگی کے ساتھ دلفریبی کا جامہ پہنایا ہے، اگر چہ انہوں نے خوبصورت کو خوبصورت کہا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے اس کا اثر دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتا ہے، امام صاحب کی کردار نگاری میں شبلی نے جو انداز اختیار کیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ امام صاحب کی سیرۃ طیبہ اپنی اصل شکل میں سامنے آتی ہے بلکہ حضرت امام صاحب سے ان کی عقیدت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور ان کی زندگی سے علامہ کی دلچسپی اور غیر معمولی شغف کا اندازہ ہوتا ہے، دیکھئے امام صاحب کا شخصی خاکہ قاضی ابو یوسفؒ کی زبانی کتنی دل کشی کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

''جہاں تک میں جانتا ہوں ، ابو حنیفہ کے اخلاق و اعادات یہ تھے کہ
نہایت پرہیز گار تھے، منہیات سے بہت بچتے تھے، اکثر چپ رہتے تھے
اور سوچا کرتے تھے، کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تھا تو جواب
دیتے ورنہ خاموش رہتے ، نہایت سخی اور فیاض تھے، کسی کے آگے حاجت
نہ لے جاتے ، اہل دنیا سے احتراز تھا، دنیوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے،
غیبت سے بہت بچتے تھے، جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ
کرتے ، بہت بڑے عالم تھے اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں
بھی فیاض تھے۔'' ۳۲

اس کے بعد علامہ شبلیؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا شخصی خاکہ خود اپنی تحریروں میں یوں بیان کیا ہے:

''امام صاحب کو خدا نے حسنِ سیرت کے ساتھ جمالِ صورت بھی دیا تھا،
میانہ قد، خوش رو اور موزوں اندام تھے، گفتگو نہایت شیریں اور آواز بلند
اور صاف تھی، کیسا ہی پیچیدہ مضمون ہو نہایت صفائی اور فصاحت سے ادا
کر سکتے تھے، مزاج میں تکلف تھا، اور اکثر خوش لباس رہتے تھے، کبھی کبھی
سنجاب و قاقم کے جبے بھی استعمال کرتے تھے، ابو مطیع بلخی ان کے شاگرد
کا بیان ہے کہ ''میں نے ایک دن ان کو نہایت قیمتی چادر اور قمیص پہنے
دیکھا، جن کی قیمت کم از کم چار سو درہم ہوگی۔'' ۳۳

علامہ شبلیؒ امام صاحب کی نفاست پسندی اور آپ کی پاکیزہ طبیعت کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک دن نصر بن محمد ان سے ملنے گئے ، امام صاحب کہیں باہر جانے کی
تیاری کر رہے تھے، ان سے کہا ذرا دیر کے لیے اپنی چادر مجھے دے دو،
واپس آئے تو شکایت کی کہ ناحق تمہاری چادر لے کر مجھ کو شرمندہ ہونا پڑا،
انہوں نے کہا کیوں، فرمایا: بہت گندی ہے''۔ ۳۴

کوفہ جو امام صاحب کا مولد و مسکن تھا، اسلام کی وسعت کا گویا دیباچہ تھا، حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو خط لکھ کر آباد کرنے کا حکم دیا تھا، اس کی بنیاد کے چند ہی دنوں کے بعد جمعیت کے اعتبار سے کوفہ نے وہ حالت پیدا کی کہ عمر فاروقؓ کوفہ کو رمح اللہ، کنز الایمان یعنی خدا کا علم ، ایمان کا خزانہ فرمایا کرتے تھے

،حضرت علیؓ نے اس شہر کو دارالخلافہ قرار دیا،صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص جن میں ۲۴ وہ بزرگ تھے جو غزوۂ بدر میں رسول اللہ کے ہم رکاب رہے تھے وہاں گئے اور بہتوں نے سکونت اختیار کرلی،ان بزرگوں کی بدولت ہر جگہ حدیث وروایت کے چرچے پھیل گئے تھے اور کوفہ کا ایک ایک گھر حدیث وروایت کا درسگاہ بن گیا تھا۔اس وقت وسعت علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے چار شہر مکہ معظّمہ،مدینہ منورہ،کوفہ اور بصرہ علوم اسلامی کے دارالعلوم خیال کیے جاتے تھے،سفیان بن عیینہ جو ائمہ حدیث شمار کیے جاتے ہیں اکثر فرماتے تھے کہ مناسک کے لیے مکہ مکرمہ،قرأت کے لیے مدینہ منورہ، اور حلال وحرام کے لیے یعنی فقہ کے لیے کوفہ ہے،امام صاحب نے ایسے ماحول اور علم کدے میں اپنی آنکھیں کھولیں جہاں ہر طرف علوم حدیث ہی کی باز گشت تھی ، پھر کسی کا یہ کہنا کہ امام صاحب علوم حدیث سے بالکل بے بہرہ تھے،یا امام صاحب کو صرف ۷ یا ۱۹ حدیثیں یاد تھیں یا تو تاریخ علوم اسلامیہ سے ناواقفیت کی علامت ہوسکتی ہے یا امام ابوحنیفہؒ اور فقہ حنفی سے انتہا درجہ کا تعصب ہوسکتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے،علامہ شبلیؒ نے امام صاحب کے تحصیل علوم حدیث کے سلسلے میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی ہے جس کا ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے:

> ''فقہ میں امام صاحب نے زیادہ تر حماد کا حلقہ درس کافی سمجھا تھا،لیکن حدیث میں یہ قناعت ممکن نہ تھی ، یہاں صرف ذہانت اور اجتہاد سے کام نہیں چل سکتا تھا، بلکہ درایت کے سات روایت کی بھی ضرورت تھی ،حدیثیں اس وقت تک نہایت پریشان اور غیر مرتب تھیں، یہاں تک کہ بڑے بڑے اساتذہ دو چار سو حدیثوں سے زیادہ یاد نہیں رکھتے تھے، یہ تعداد ضروری مسائل کیلئے بھی کافی نہ تھی ،اس کے علاوہ طریقِ روایت میں اس قدر اختلافات پیدا ہوگئے تھے کہ ایک حدیث جب تک متعدد طریقوں سے نہ معلوم ہو اس کے مفہوم اور تعبیر کا ٹھیک ٹھیک متعین ہونا دشوار تھا، امام صاحب کو حماد کی صحبت اور پختگیِ عمر نے ان ضرورتوں سے اچھی طرح واقف کردیا تھا اس لیے نہایت سعی اور اہتمام سے حدیثوں کے بہم پہنچانے پر توجہ کی،تقریباً کوفہ میں کوئی ایسا محدث باقی نہ تھا،جس کے سامنے امام صاحب نے زانوے شاگردی طے نہ کیا ہو،اور

حدیثیں نہ سیکھی ہوں، ابوالمحاسن شافعی نے جہاں ان کے شیوخ حدیث
کے نام گنائے ہیں ترانوے شخصوں کی نسبت لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے
والے یا نزیل تھے۔'' ۳۵

امام صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کو اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کی شاگردی نصیب ہوئی، آپ کے اکثر اساتذہ تابعین تھے، آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایک واسطہ تھا، امام صاحب کے شیوخ مدت تک صحابہؓ کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے، اوران کے حلقۂ درسِ حدیث وفقہ میں کمال اور مہارت حاصل کی تھی، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب علم، فضل وکمال، عبادت وریاضت، امانت ودیانت میں بے مثال تھے، علامہ شبلیؒ امام صاحب کے اساتذہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تہذیب التہذیب، تہذیب الاسماء وتذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں اگرچہ
جیسا کہ ان کتابوں کا عام طریقہ ہے امام صاحب کے شیوخ کا استقصا
نہیں کیا ہے، تاہم انہیں کتابوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے
ایک گروہ کثیر سے روایت کیں جن میں ۲۹ شخص خاص کوفہ کے رہنے
والے تھے، اوران میں اکثر تابعی تھے شیوخ کوفہ میں خاص کر امام شعبی،
سلمہ بن کہیل، محارب بن وثار، ابواسحٰق سبعی، عون بن عبداللہ، سماک بن
حرب، عمرو بن حرب، عمر بن مرۃ منصور بن المعمر، اعمش، ابراہیم بن عدی
بن ثابت الانصاری، عطابن السائب، موسیٰ ابن عائشہ، عقلمۃ بن
مرثد بہت بڑے محدث اور سند و روایت کے مرجع عام تھے سفیان ثوری
اور امام حنبل وغیرہ کا سلسلہ سند اکثر انہیں بزرگوں تک پہنچتا ہے۔'' ۳۶

امام صاحب کی تجارت بہت وسیع تھی، لاکھوں کا لین دین اور کاروبار چلتا تھا۔ بڑے بڑے سوداگروں سے ان کا واسطہ تھا، پھر بھی امام صاحب امانت ودیانت اور احتیاط کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ ناجائز طور پر ایک دانہ بھی ان کے خزانہ میں نہیں داخل ہوسکتا تھا، حالانکہ اس احتیاط میں انہیں اکثر نقصان اٹھانا پڑتا تھا، اگران کے مال میں کوئی عیب ہوتا تو وہ خریداروں کو آگاہ کرادیتے تھے، ایک دفعہ یوں بھی ہوا کہ جب نوکروں نے خریداروں کو 'خز' کے تھان کے عیب سے واقفیت نہ کرواتے ہوئے تھان بیچ ڈالے تو انہیں نہایت

افسوس ہوااوراس کی تلافی یوں کی کہ تھانوں کی قیمت جوتیس ہزار درہم کی تھی سب خیرات کر دیا۔اس سے متعلق علامہ شبلیؒ نے ایک بہت دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے:

> ''ایک دن ایک عورت 'خز' کا تھان لے کر آئی کہ فروخت کرادیجئے ،امام صاحب نے دام پوچھے اس نے سو روپیہ بتائے ،فرمایا کہ کم ہیں،اس نے کہا تو دوسو روپے،فرمایا یہ تھان پانچ سو روپئے سے کم قیمت کا نہیں،اس نے متعجب ہوکر کہا آپ شاید ہنسی کرتے ہیں ،امام صاحب نے پانچ سو روپے اپنے پاس سے دے دیا اور تھان رکھ لیا،اس احتیاط اور دیانت نے ان کے کارخانہ کو بجائے نقصان پہنچانے کے اور بھی چمکا دیا۔'' ۳۷

تجارت اور اکتساب دولت سے ان کا مقصود زیادہ تر عام لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا، جتنے احباب اور ملنے والے تھے سب کے لئے روزینے مقرر کر رکھے تھے،شیوخ اور محدثین کے لئے تجارت کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تھا کہ اس سے جو نفع ہوتا تھا سال کے سال ان لوگوں کو پہنچا دیا جاتا تھا، عام رواج تھا کہ گھر والوں کیلئے کوئی ،شاگردوں میں جس کو تنگ حال دیکھتے اس کی ضروریات خانگی کی کفالت کرتے کہ اطمینان سے علم کی تکمیل کر سکے بہت سے لوگ جن کو مفلسی کی وجہ سے تحصیل علم کا موقع نہیں مل سکتا امام صاحب ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے رتبوں پر پہنچے انہیں میں ابو یوسف صاحبؒ بھی ہیں۔

امام صاحبؒ اس دولت مندی اور عظمت وشان کے ساتھ نہایت متواضع ،حلیم ،اوراخلاق مند تھے، ایک مرتبہ کی بات ہے کہ مسجد خیف میں امام صاحب تشریف فرماں تھے،شاگردوں کا حلقہ لگا ہوا تھا،ان میں کچھ اجنبی بھی شامل تھے،ایک اجنبی نے مسئلہ پوچھا،امام صاحب نے مناسب جواب دیا،اس نے کہا ''مگر حسن بصری نے اس کے خلاف بتایا ہے،اس پر امام صاحب نے فرمایا:''حسن بصری نے غلطی کی'' اب حاضرین میں سے ایک شخص جو کہ حسن بصری کا معتقد تھا طیش میں آ گیا اور جھلا کر کہا ''او ابن الفاحشہ! تو حسن کو خاطی کہتا ہے'' اس گستاخی اور بیہودہ گوئی نے تمام مجلس کو برہم کر دیا اور لوگوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر سزا دیں، مگر امام صاحب نے روکا،آپ کے روکنے سے لوگ مجبور ہو گئے ،مگر کافی دیر تک مجلس میں سناٹا چھایا رہا، پھر جب لوگوں کا جوش اور غصہ کم ہوا تو امام صاحب نے اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا،''ہاں حسن نے غلطی کی

ہے اور عبداللہ بن مسعودؓ نے اس باب میں جو روایت کی ہے وہ صحیح ہے۔'' علامہ شبلیؒ نے امام صاحب کی حلم و بردباری کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

''یزید بن کمیت کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر تھا، ایک شخص نے ان سے گستاخانہ گفتگو شروع کی، امام صاحب تحمل سے جواب دیتے تھے، وہ اور شوخ ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس نے امام صاحب کو زندیق کہہ دیا، اس پر فرمایا کہ خدا تم کو بخشے، وہ خوب جانتا ہے کہ میری نسبت جو تم نے لفظ کہا صحیح نہیں ہے امام صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی پر لعنت نہیں کی، کسی سے انتقام نہیں لیا، کسی مسلمان یا ذمی کو نہیں ستایا، کسی سے فریب اور بدعہدی نہیں کی۔'' ۳۸

اس کے علاوہ بھی دوسرے واقعات جو کہ علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النعمان میں ذکر کئے ہیں جس سے امام صاحب کا نہایت حلیم اور بردبار ہونا، کسی پر بدزبانی و بدکلامی یا کسی پر لعن طعن اور چغلخوری سے غایت درجہ احتیاط و احتراز کرنا معلوم ہوتا ہے، امام صاحب کا یہ رویہ نہ صرف یہ کہ اپنے شاگردوں اور ہم نشینوں کے ساتھ محدود تھا بلکہ اجنبیوں، پڑوسیوں، ہمسایوں اور عام لوگوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ تھا آپ کے حسن اخلاق کی مثال دیتے ہوئے علامہ شبلیؒ ایک موچی کا واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''محلّہ میں ایک موچی رہتا تھا جو نہایت رنگین طبع اور خوش مزاج تھا، اس کا معمول تھا کہ دن بھر مزدوری کرتا شام کو بازار جا کر گوشت اور شراب مول لاتا، کچھ رات گئے دوست واحباب جمع ہوتے، خود سیخ پر کباب لگاتا اور یاروں کو کھلاتا، ساتھ ہی شراب کا دور چلتا اور مزے

میں آ کر یہ شعر گاتا:

''اضاعونی وای فتیٰ اضاعو
لیوم کریہۃ و سداد ثغر''

یعنی ''لوگوں نے مجھکو کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھویا جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا ہے۔'' امام صاحب ذکر و شغل میں رات کو کم سوتے

تھے اس کی نغمہ سنجیاں سنتے اور فرط اخلاق کی وجہ سے کچھ تعرض نہ کرتے
ایک رات کوتوال ادھر آنکلا اور اس غریب کو گرفتار کر کے قید خانہ میں بھیج
دیا، صبح کو امام صاحب نے دوستوں سے تذکرہ کیا کہ رات ہمارے
ہمسایہ کی آواز نہیں آئی، لوگوں نے رات کا ماجرا بیان کیا اسی وقت سواری
طلب کی، دربار کے کپڑے پہنے اور دارالامارۃ کا قصد کیا، یہ عباسیہ کا عہد
حکومت تھا، عیسیٰ بن موسیٰ کے خلیفہ کا برادرزادہ اور تمام خاندان میں عقل
وتدبر، دلیری اور شجاعت کے لحاظ سے ممتاز تھا کوفہ کا گورنر تھا لوگوں نے
اطلاع دی کہ امام صاحب آپ سے ملنے کو آتے ہیں اس نے درباریوں
کو استقبال کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ دارالامارۃ کے صحن تک امام صاحب
کو سواری پر لائیں سواری قریب آئی تو تعظیم کو اٹھا اور نہایت ادب سے
لاکر بٹھایا، پھر عرض کی کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟ مجھکو بلا بھیجتے کہ
میں خود حاضر ہوتا، امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے محلّہ میں ایک موچی
رہتا تھا، کوتوال نے اس کو گرفتار کرلیا ہے میں چاہتا ہوں کہ وہ رہا کر دیا
جائے، عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو حکم بھیجا اور وہ رہا کر دیا
گیا۔'' ۳۹

امام صاحب نہایت خوش مزاج اور سلیم الطبع انسان تھے، عبادت وریاضت آپ کا بڑا مشغلہ تھا، اس باب میں آپ کی شہرت ضرب المثل تھی، علامہ شبلیؒ نے امام صاحب کے زہد وتقویٰ، ذکر واذکار، عبادت وریاضت اور خشیت الٰہی کے متعلق یوں تحریر فرمایا ہے:

''نہایت مرتاض اور زاہد تھے، ذکر وعبادت میں اس کو مزہ آتا تھا اور
بڑے ذوق وخلوص سے ادا کرتے تھے، اس باب میں ان کی شہرت ضرب
المثل ہوگئی تھی، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی پرہیزگاری اور عبادت
کے واقعات تواتر کی حد کو پہنچ گئے ہیں، اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے کے
وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے، ابرہیم بصری کا بیان ہے کہ
ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ شریک تھا، امام نماز میں یہ

آیت پڑھی" ولاتحسبن اللہ غافلا عما یعمل الظالمون "یعنی خدا کو ظالموں کی کردار سے بے خبر نہ سمجھنا، امام ابوحنیفہؒ پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ زائدہ لکھتے ہیں کہ مجھکو ایک ضروری مسئلہ دریافت کرنا تھا، امام ابوحنیفہ کے ساتھ نماز عشاء میں شریک ہوا اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں وہ قرآن پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچے" ووقانا عذاب السموم "بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور یہی آیت پڑھتے رہے، ایک بار نماز میں یہ آیت پڑھی" بل الساعة موعدھم والساعة ادھیٰ و ام "یعنی قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے، اسی آیت میں رات ختم ہوگئی بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔" [۴۰]

اخلاق و عادات، آزادی و بے نیازی، امانت و دیانت، سخاوت و فیاضی، شاگردوں اور عوام الناس کے ساتھ حسن سلوک، لوگوں سے عفو درگذر، حلم و بردباری، پڑوسیوں اور ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی، عبادت و ریاضت کے تذکرے کے بعد علامہ شبلی نے اپنے ہیرو کے ان کمالات کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی بنیاد پر امام صاحب نہ صرف یہ کہ علامہ شبلیؒ کی اصل وجہ انتخاب بنے بلکہ امت مسلمہ کے بڑے بڑے علم وفکر، تدبر و تفکر، ذہانت و فطانت کے اماموں کے امام بنے، چنانچہ علامہ شبلیؒ انہیں کمالات کی مثالیں پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"جو چیز امام صاحب کی قوت ایجاد، جدتِ طبع، دقت نظر، وسعتِ معلومات، غرض ان تمام کمالات کا علمی آئینہ ہے وہ علم فقہ ہے جس کی ترتیب و تدوین میں ان کو وہ پایہ حاصل ہوا، جو ارسطو کو منطق اور اقلیدس کو ہندسہ میں۔ لیکن اس پر تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے، اسی ضرورت سے ہم نے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ اس بحث کے لیے خاص کر دیا ہے، اس موقع پر صرف وہ واقعات لکھتے ہیں جو امام صاحب کی علمی تاریخ کے عام واقعات ہیں۔" [۴۱]

یہ امام صاحب کی ذہانت اور طباعی کی محکم دلیل ہے کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت عام فہم اور دلنشیں انداز میں پیش کر دیا کرتے تھے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''ایک دفعہ ضحاک خارجی جو خارجیوں کا ایک مشہور سردار تھا اور بنوامیہ کے زمانے میں کوفہ پر قابض ہوگیا تھا، امام صاحب کے پاس آیا اور تلوار دکھا کر کہا کہ توبہ کرو، انہوں نے پوچھا، کس بات سے، ضحاک نے کہا، تمہارا عقیدہ ہے کہ علی نے معاویہ کے جھگڑے میں ثالثی مان لی تھی، حالانکہ جب وہ حق پر تھے تو ثالث ماننے کے کیا معنی؟ امام صاحب نے کہا کہ، اگر میرا قتل مقصود ہے تو اور بات ہے ورنہ اگر حق منظور ہے تو مجھ کو تقریر کی اجازت دو، ضحاک نے کہا، میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا، اگر بحث آپس میں طے نہ ہو تو کیا علاج؟ ضحاک نے کہا، ہم دونوں ایک شخص کو منصف قرار دیں، چنانچہ ضحاک ہی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص انتخاب کیا گیا تا کہ دونوں فریق کی صحت و غلطی کا تصفیہ کرے، امام صاحب نے فرمایا، یہی تو حضرت علی علیہ السلام نے بھی کیا تھا، پھر ان پر کیا الزام ہے؟ ضحاک دم بخود ہوگیا اور چپکے اٹھ کر چلا آیا۔'' ۴۲؎

شبلیؒ نے امام صاحب کی ذہانت و فطانت، عقل و فراست کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے اور ان کی شخصیت و کردار اور قابلیت و صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لئے نہایت عمدگی کے ساتھ واقعات نگاری سے قارئین کا ذہن اپنی مٹھی میں لے لیا ہے، یہاں تک کہ امام صاحب کی تمام فطری و جبلی خوبیاں، خاصیتیں اور محاسن پوری طرح قارئین کے سامنے آجاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ امام صاحب کی شخصیت کہیں بھی خوش اعتقادی کا شکار نہیں ہوتی، علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النعمان میں انہیں باتوں اور واقعات کو اہمیت دی ہے جو فہم وادراک کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اپنے ہیرو کی شخصیت کو برتر ثابت کرنے کے لئے محض خوش اعتقادی اور خوش اعتمادی سے پیدا ہونے والے واقعات پر زور نہیں دیا ہے، حالانکہ علامہ شبلیؒ دوسرے سوانح نگاروں کی طرح غیر مستند اور تاریخی اعتبار سے کمزور بیانات سے اپنے اسلوب میں رنگ بھر سکتے

تھے،لیکن علامہ نے فن کوعقیدت پر ترجیح دی ہے،تا کہ قارئین اس فطرت انسانی کے اعلیٰ نمونہ کے نقوشِ پا کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنا سکیں۔اور علامہ شبلی کی یہی خصوصیت ان کو دوسرے سوانح نگاروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

شبلیؒ کا ہیرو صرف علم وفضل اور ذہانت وفطانت کا ہی اعلیٰ تر نمونہ نہیں تھا، بلکہ قدرت نے اس کی فطرت میں ظرافت و حاضر جوابی کے عناصر بھی بدرجہ اتم بھر دیے تھے،جن سے کام لے کر اس نے بعض مسائل چٹکیوں میں حل کر دیے ہیں۔لیکن علامہ شبلیؒ کی نگاہ صرف امام صاحب کے محاسن میں الجھ کر نہیں رہ جاتی بلکہ بشری کمزوریوں کی تہہ تک بھی جا پہنچتی ہے،البتہ ہیرو کی کمزوریاں ان کے نزدیک بشری اوصاف ہیں جن سے گریز ممکن نہیں۔شبلیؒ لکھتے ہیں:

''امام صاحب کے مناظرات میں کہیں کہیں ہم اس ادعا اور جوش مقابلہ کا اثر پاتے ہیں جو بظاہر اس کی تواضع اور بےنفسی کے خلاف ہے،لیکن یہ انسانی جذبات ہیں ،جن سے کوئی شخص بری نہیں ہوسکتا، ہم نے امام شافعیؒ، امام مالکؒ ،امام بخاریؒ ،امام مسلمؒ اور بڑے بڑے ائمہ کے مناظرات کتابوں میں پڑھے ہیں،ان میں اس سے زیادہ ادعا اور حوصلہ مندی کا زور پایا جاتا ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر اس قسم کی باتیں بزرگوں کے حالات میں مذکور نہ ہوتیں تو ہم کو شبہ ہوتا کہ تذکرہ نویسوں نے ان بزرگوں کی اصلی تصویر نہیں دکھائی ہے بلکہ خوش اعتقادیوں کا خاکہ کھینچا ہے۔''[۴۳]

شبلیؒ اپنے ہیرو کے علم وفضل اور دوسرے کمالات کے اعتراف کے باوجود ان کے فقہی اجتہادات کے متعلق صاف صاف الفاظ میں برملا طور پر کہتے ہیں:

''......لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کی نسبت یہ عام دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مسائل صحیح اور یقینی ہیں ،امام صاحبؒ مجتہد تھے پیغمبر نہ تھے،اسی لیے ان کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے۔''[۴۴]

اپنے مذہبی اور علمی ہیرو کی کسی بشری یا علمی کمزوری کو منظر عام پر لانے کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ شبلی نے عقیدت واحترام کے باوجود اپنی بے لاگ تحقیقی نظر کے ساتھ صاحب سوانح کی زندگی کے تمام

گوشوں کو بے نقاب کرنے کی جسارت کی ہے،اوراس طرح وہ سیرۃ النعمان میں بحیثیت سوانح نگار زیادہ پختہ اور کامیاب نظر آتے ہیں ،اور المامون کے مقابلے میں گہرے فنی شعور کا اظہار کرتے ہیں ، اپنی اس سوانحی تصنیف میں انہوں نے بڑی حد تک سوانح نگاری کے فنی اور تکنیکی اصولوں پر عمل کیا ہے،اور تحقیق و تلاش کی نہایت اعلیٰ مثال پیش کی ہےاس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی گراں قدر رائے ملاحظہ ہو:

''ہمارے خیال میں سیرۃ النعمان اس موضوع پر بہترین کتاب ہے،اس میں انہوں نے محبت اور عقیدت کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کی صحیح تصویر پیش کی ہے،حضرت امام کی لائف کی جزئیات فراہم کرنے میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ محنت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے بلکہ ان کی زینت میں بڑی کاریگری اور صناعی کا ثبوت بھی پیش کیا ہے.........اردو میں کیا مشرق کی سب زبانوں میں یہ کتاب اپنے موضوع پر جدید طرز تصنیف اور جدید انداز تصنیف کا اولین اور نفیس نمونہ ہے۔'' ۴۵؎

سیرۃ النعمان کی سوانحی خوبی کا اعتراف الطاف فاطمہ اپنے لفظوں میں اس طرح بیان کرتی ہیں:

''سیرۃ النعمان میں شبلی نے انہی باتوں اور واقعات کو اہمیت دی ہے جو عقل وادراک کے معیار پر پوری اترتی ہیں، محض خوش اعتقادی سے پید اشدہ واقعات پر زور نہیں دیا۔'' ۴۶؎

شبلی کے پاس جو مواد موجود تھے اس سے انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔اور امام ابوحنیفہؒ کے ذاتی حالات کو نہایت دلچسپ اور پر کیف انداز میں پیش کیا۔اور بحیثیت سوانح نگار ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ جس کا خیال علامہ شبلیؒ کے عہد میں آسان نہیں تھا۔اس لئے کہ وہ عقیدت واحترام اور اخلاق ومروت کا دور تھا اوراسی کے ساتھ ہیرو کو ان تمام صفات سے متصف کرنے کا دور تھا، جو انسانوں میں کم اور فرشتوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں،شبلی کی اس سوانحی تصنیف میں بھی بعض امور پر طویل گفتگو موجود ہیں اور ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو سوانحی دائرہ سے باہر اور غیر ضروری ہیں ،لیکن بحیثیت مجموعی سوانح نگار علامہ شبلیؒ کا پلہ بہت بھاری اور آپ کا قد نمایاں نظر آتا ہے۔

## الفاروق:

ویسے تو شبلی نے کئی سوانح عمریاں تصنیف کیں، مگر وہ سوانحی تصنیف جس پر علاّمہ کو سب سے زیادہ ناز تھا وہ ''الفاروق'' ہے۔ وہ اس کو اپنی بہترین تصنیف خیال کرتے تھے، اور آپ کا یہ خیال بجا بھی تھا، اس کی دلیل علمی و ادبی حلقوں میں ''الفاروق'' کی مقبولیت اور شہرت عامہ ہے، اس کی مقبولیت کی بنا پر اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور متعدد زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ علامہ شبلیؒ کو اپنی اس مایہ ناز تصنیف کا آغاز کرنے اور تمام تصنیف وطباعت کے مراحل کو عبور کر کے منظر عام پر لانے میں بہت سے دشوار گزار اور صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیرۃ النعمان کے دیباچہ میں علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

> ''المامون کے بعد میں نے الفاروق لکھنی شروع کی تھی اور ایک معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا لیکن بعض مجبوریوں سے چند روز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔'' ۴۷؎

الفاروق کی تصنیفی توقف کی وجہ بتاتے ہوئے علامہ شبلیؒ نے ان لوگوں کا جواب بھی دیا ہے، جو اس کے توقف پر مختلف قسم کی بدگمانیوں کے شکار ہوئے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس پر کوتاہ بینوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں، حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے نہایت ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آ چکیں۔'' ۴۸؎

علامہ شبلیؒ کے قلم میں وہ کشش تھی کہ ان کی بعض تصانیف کی شہرت شائع ہونے سے پہلے ہی ارباب علم وفن کے حلقہ میں گونج اٹھتی تھی، اور شائقین قلم وقرطاس اس کی طباعت کے لئے شدت سے منتظر ہو جاتے تھے، اہل علم اور صاحب ذوق پلکیں بچھائے نظر آتے تھے، ''الفاروق'' علامہ کی ایسی ہی تصنیف تھی، کہ جس نے اپنی اشاعت سے پہلے ہی اپنے قارئین منتظرین کے دلوں کو اپنے لئے مسخر کر لیا تھا، جس کے متعلق وہ خود دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> ''الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہو چکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آ گیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا، تاہم نام میں کچھ ایسی

دلچسپی تھی کہ خود بخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار
نہیں ہو چکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق
کا لفظ بچہ بچہ کے زبان پر تھا۔'' ۴۹ؔ

سرسید چاہتے تھے کہ ''الفاروق'' کی تصنیف نہ ہو، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ الفاروق کا وجود ایسا نہ ہو کہ کالج کے ہمدردوں میں سنی اور شیعی کا فرق پیدا کر دے، اس زمانے میں کالج کے ہمدردوں میں سب سے قابل تعظیم نام 'نواب عماد الملک سید حسن بلگرامی' کا تھا، سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ وہ شیعہ ہیں، اس لیے یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب ہوگی۔ کیوں کہ انہیں اٹھارہویں صدی اور شاہان اودھ کا وہ زمانہ یاد تھا جب شیعہ سنی مسئلے نے قوم کا اجتماعی نظام درہم برہم کر دیا تھا، انہوں نے بڑی مشکل سے دونوں فریقوں کو اپنی خوشی سے مل کر کام کرنے کا طریقہ بتایا تھا، اور وہ ہر ایسی چیز سے ڈرتے تھے جس سے پرانی تلخ بحثیں تازہ ہونے کا امکان ہو، وہ ابھی الفاروق اور المرتضٰی لکھے جانے کے حق میں نہ تھے اور انہوں نے شبلی کو الفاروق کے بجائے الغزالی لکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ علی گڑھ سے شائع ہونے والے ایک میگزین ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' مؤرخہ ۱۰/ مارچ ۱۸۹۳ء میں سرسید نے لکھا ہے:

''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی ''الفاروق'' نہ لکھیں۔'' ۵۰ؔ

مگر اس کے لیے علامہ شبلی کو سرسید کی موافقت کیسے ملی، اور یہ نا اتفاقی کیونکر دور ہوئی، اس سے متعلق اختر وقار عظیم تحریر فرماتے ہیں:

''شبلی کو سرسید کے اس خیال سے اتفاق نہ تھا، کچھ عرصے تک تو وہ ان کے
ادب میں چپ رہے، پھر انہوں نے سرسید کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلہ
میں نواب سید حسین بلگرامی سے مشورہ کریں جو شیعہ ہونے کے علاوہ کالج
کے ہمدردوں میں بھی شمار ہوتے تھے، چنانچہ سرسید نے انہیں خط لکھا جس
کا جواب بقول شبلی یہ آیا کہ:
''اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے، اور حیف ہے کہ اس کی سوانح عمری
بھی نہ لکھی جائے۔'' ۵۱ؔ

چنانچہ نواب صاحب نے حضرت عمرؓ کی سوانح کی تصنیف کے لئے جس وسیع نظری اور کشادہ قلبی کا

مظاہرہ کیا ہے اس کی نظیر خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے، اور اسی کے ساتھ علامہ شبلی کے اس طلب و جستجو کا بھی پتہ چلتا ہے جو ان کے دل میں گھر کر چکا تھا، جس کی بنا پر انہوں نے تمام رکاوٹوں کا بڑی حکمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔

علامہ شبلی نے اس کتاب کی تصنیف میں صرف ہندوستان کے ذخیرۂ معلومات سے استفادہ نہیں کیا، کیونکہ اس کے لئے جس نوع کے مراجع ومصادر کی ضرورت تھی اور علامہ شبلی جس بلند معیار و مذاق کے مطابق اس کتاب کو لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے یہ مواد کافی نہ تھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم ومصر و شام، قسطنطنیہ اور ترکی وغیرہ ممالک کا سفر کیا، جس کا ایک مقصد ''الفاروق'' کے مراجع ومواد کی فراہمی بھی تھا، جس کے متعلق اختر وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ پہلا سفر تھا، جو محض علمی شوق پورا کرنے کے لیے کیا گیا۔'' ۵۲

اس سفر میں علامہ شبلی نے متعدد نادر و کمیاب کتابوں اور مخطوطات کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے ضروری اقتباسات بھی نقل کیے اور الفاروق کے لیے کافی مواد بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی اور کوئی دقیقہ تلاش و جستجو کا باقی نہ رکھا گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''الفاروق کے لیے جن کتابوں سے معلومات ان کو مل سکتی تھی ان کا مطالعہ کی اور ان سے ضروری اقتباسات لکھ کر اپنے ساتھ لائے، جن میں طبقات ابن سعد، سیرۃ العمر بن امام جوزی، انساب الاشراف بلاذری، اخبار القضاۃ محمد بن خلف اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل، وغیرہ کے حوالے الفاروق میں موجود ہیں۔'' ۵۳

چنانچہ جس قدر اس کتاب کے لکھنے میں مشکلات زیادہ پیش آئیں، اسی قدر اس میں غیر متوقع کامیابی بھی حاصل ہوئی، جس کو علامہ خود محسوس کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

> ''میں اپنی تصنیفات میں ''الفاروق'' کو سب سے زیادہ پسند کرتا

ہوں۔'' ۵۴؎

''الفاروق'' بھی علامہ شبلی کے عام دستور کے مطابق دو حصوں میں منقسم ہے۔اس کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوتا ہے،مقدمہ کے شروع میں عرب کی اس خاص خصوصیت کا ذکر ہے کہ ان میں بعض خاص خاص باتیں ایسی پائی جاتی تھیں جن کو تاریخی سلسلے سے تعلق تھا اور جو اور قوموں میں نہیں پائی جاتی تھیں،مثلاً انساب کا چرچا،ایام العرب اور شاعری وغیرہ۔پھر اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار،ان کی خصوصیات اور مورخ کے فرائض وغیرہ سے مفصل بحث کی گئی ہے،اس میں یوروپین مورخوں کی بے اعتدالیوں اور اسلام کے بارے میں ان کے گمراہ کن انداز فکر کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں حضرت عمرؓ کے حسب ونسب، ولادت،سن رشد،قبول اسلام،اور ہجرت وغیرہ سے لے کر خلافت اسلامیہ کے لیے ان کے انتخاب اور پھر ان کے عہد کی فتوحات ملکی کے حالات ہیں۔آپ کی ولادت سے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ مشہور روایت کے مطابق ہجرت نبوی سے ۴۰ برس قبل پیدا ہوئے،ان کی ولادت اور بچپن کے حالات بالکل نامعلوم ہیں،حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں عمرو بن عاص کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے کہ میں چند احباب کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً ایک غل اٹھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ خطاب کے گھر بیٹا پیدا ہوا،اس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پیدا ہونے پر غیر معمولی خوشی کی گئی تھی، ان کے سن رشد کے حالات بھی بہت کم معلوم ہیں،اور کیوں کر معلوم ہوتے اس وقت کس کو خیال تھا کہ یہ جوان آگے چل کر فاروق اعظمؓ ہونے والا ہے۔'' ۵۵؎

مذکورہ بالا عنوان کے تحت حضرت عمرؓ کے سلسلۂ نسب، ان کی خاندانی عظمت، خاندان کی مذہبی سیادت،جد امجد نفیل کے رتبہ،والد خطاب کے خاندان قریش کے ممتاز فرد اور حضرت عمر کے برادر عم زاد زید وغیرہ کا قدرے تفصیل سے تذکرہ ہے۔

پھر ان چیزوں کی تعلیم حاصل کرنے کا ذکر ہے جو اس وقت عرب میں لازمہ شرافت خیال کی جاتی تھی

یعنی نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی، خطابت، اور شاعری کے عمدہ ذوق، تجارت کو ذریعہ معاش بنانے اور اس غرض سے دور دور ملکوں کے سفر کا تذکرہ ہے۔ علامہ شبلیؒ کے خیال میں اسی کی بدولت حضرت عمر میں خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری، معاملہ دانی وغیرہ اوصاف اسلام لانے سے قبل ہی پیدا ہو گئے تھے۔

اسی زمانے میں حضرت عمرؓ نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا، اور یہ وہ خصوصیت تھی جو اس زمانے میں بہت کم لوگوں کو حاصل تھی، علامہ شبلیؒ نے اس کے متعلق علامہ بلاذری کی سند کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو قریش کے تمام قبیلے میں سترہ (۱۷) آدمی تھے جو لکھنا جانتے تھے، ان میں سے ایک عمر بن خطابؓ تھے۔'' ۵۶

اس کے بعد قبول اسلام کا عنوان آتا ہے، حضرت عمرؓ بن خطاب کا قبول اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھا، الفاروق میں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ تین صفحوں میں لکھا ہے، اس میں اگرچہ کوئی ندرت نہیں مگر عام کتب میں مذکور واقعہ سے کچھ الگ ہٹ کر ضرور ہے مثلاً حضرت عمر بن خطابؓ جو آیتیں پڑھ کر بے اختیار ''اشھد ان لا الـه الا اللـه واشھد ان محمداً رسول اللـه'' پکار اٹھے تھے، علامہ شبلیؒ نے ان کو سورۂ صف کی آیات بتایا ہے۔ پورا واقعہ کچھ اس طرح سے ہے:

> ''حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ عرب میں آفتابِ رسالت طلوع ہوا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی، حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل نامانوس نہیں رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید اسلام لائے، سعید کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلے میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے، لبینہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے

تحاشا مارتے ،اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا،لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے،لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا،ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے،آخر مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ (نعوذ باللہ ) خود بانی اسلام کا قصہ پاک کر دیں، تلوار کمر سے لگا کر سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے۔راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے ،ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں''انھوں نے کہا کہ ''پہلے اپنے گھر کی خبر لو خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں''فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لیے،لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی ،بہن سے پوچھا کہ یہ کیا آواز تھی ،بہن نے کہا کچھ نہیں۔ بولے کہ نہیں میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو''یہ کہہ کر بہنوئی سے دست وگریبان ہو گئے۔اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا بدن لہولہان ہو گیا،اسی حالت میں ان کی زبان سے نکلا کہ عمر! جو بن آئے کرو لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا'' ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا،بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا،ان کے بدن سے خون جاری تھا، یہ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔فرمایا کہ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھکو بھی سناؤ۔فاطمہ نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیئے ،اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ ی ''سبح للہ ما فی السمٰوات والارض و ھو العزیز الحکیم'' ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے ''اٰمنو اباللہ ورسولہ'' تو بے اختیار پکار اٹھے کہ''اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ'' یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارقم

کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا پناہ گزین تھے، حضرت عمرؓ نے
آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے اور اس تازہ
واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ تھی، اس لیے صحابہ کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہؓ نے
کہا کہ "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر
دیا جائے گا" حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا، کیوں عمر کس ارادہ سے آیا
ہے؟ نبوت کی پر رعب آواز نے ان کو کپکپا دیا نہایت خضوع کے ساتھ
عرض کی کہ "ایمان لانے کے لیے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ
اللہ اکبر پکار کر اُٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر
کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔" ۵۷

اس واقعہ میں علامہ شبلی کے طریقہ ادا اور اچھوتے انداز بیان نے جو کیفیت و جاذبیت پیدا کی ہے وہ پڑھنے والوں کو مست اور سرشار کر دینے کیلئے کافی ہے، اس واقعہ میں غور طلب امر یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے ان آیات کو جس سے حضرت عمر بن خطابؓ متأثر ہو کر حق بجانب ہوئے وہ سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات بتائے ہیں، مگر غالباً مرجوح ہونے کی وجہ سے علامہ شبلیؒ نے ان اقوال کو نظر انداز کیا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام سے کافروں پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو گیا، اسلام کو ایسی عظمت و ترقی ہوئی کہ اسلام نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا، اب حضرت عمر بن خطابؓ کی ذہانت، جرأت و جواں مردی، ہمت و حوصلہ الغرض پوری کسبی اور خداداد صلاحیتیں صرف اور صرف اسلام کے لیے ہی استعمال ہو رہی تھیں، ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک مسئلہ درپیش ہوا کہ نماز باجماعت کے لیے لوگوں کو کیسے اطلاع دی جائے تو مختلف رائے سامنے آئیں مگر اولیت حضرت عمر فاروقؓ کی رائے کو ملی، چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

"یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں نماز کے اعلان کے لئے بوق اور
ناقوس کا رواج تھا، اس لیے صحابہؓ نے یہی رائے دی، ابن ہشام نے
روایت کی ہے کہ یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز تھی، بہرحال یہ
مسئلہ زیر بحث تھا، اور کوئی رائے قرار نہیں پاتی تھی کہ حضرت عمرؓ آ نکلے،

اور انہوں نے کہا کہ ایک آدمی اعلان کرنے کے لئے کیوں نہ مقرر کیا جائے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ اذان ،نماز کا دیباچہ اور اسلام کا ایک بڑا اشعار ہے، حضرت عمرؓ کے لیے اس سے زیادہ کیا فخر کی بات ہوسکتی ہے کہ یہ شعار اعظم انہیں کی رائے کے موافق قائم ہوا۔" ۵۸ؔ

جس طرح بھوکے کو صرف اور صرف دوروٹی چاہئے ہوتی ہے ویسے ہی حق کے شناوروں کو حق کے سوا کسی اور چیز سے اتفاق ہی نہیں ہوتا، چنانچہ اس کے متعلق ڈاکٹر نیر جہاں لکھتی ہیں:

"حضرت عمرؓ جب کفر کو "حق" سمجھ رہے تھے تو اس "حق" کی حمایت میں تلوار لے کر نکل آئے اور جب اصل حق یعنی اسلام کے سائے میں آ گئے تو اسلام کے سوا کسی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ چنانچہ حق و باطل کے درمیان پہلی جنگ ، جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ معاملے کا سوال در پیش ہوا تو فاروق اعظمؓ کی حقپسندی ہر امتحان سے کامیاب گزر گئی۔" ۵۹ؔ

اسی مضمون کو علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں دیکھئے:

"......بحث پیدا ہوئی کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ سے رائے لی، اور ان لوگوں نے مختلف رائیں دیں، حضرت ابوبکر نے کہا کہ یہ اپنے ہی بھائی بند ہیں، اس لیے ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے ، حضرت عمر نے اختلاف کی اور کہا، اسلام کے معاملے میں رشتہ وقرابت کو دخل نہیں ، ان سب کو قتل کر دینا چاہئے ، اور اس طرح کہ ہم میں ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کر دے، علی عقیل کی گردن ماریں ،حمزہ عباس کا سر اڑا دیں ، اور فلاں شخص جو میرا عزیز ہے اس کا کام میں تمام کردوں۔" ۶۰ؔ

شبلیؒ اپنی اس تصنیف سے انگریزوں کی اسلام دشمنی، اسلام پر طرح طرح کے حملے، بے بنیاد اور من گھڑت الزامات کا دندان شکن جواب دینا چاہتے تھے، انگریزوں کو صلیبی جنگ میں شرمناک شکست ہوئی تھی، انہوں نے ہندوستان

میں سلطنت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں سے لی تھی، اور اسلام کانٹا بن کر عالمی سطح پر ان کے رگ و پے میں چبھ رہا تھا، اور جس کی کسک ان کو چین نہیں لینے دیتی تھی، لہذا علامہ شبلیؒ چاہتے تھے کہ فاروق اعظمؓ کی بے مثال شخصیت جن کے بارے میں محمد الیاس اعظمی نے لکھا ہے کہ:

''قانون فطرت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ فضائل انسانی کی مختلف انواع ہیں اور ہر فضیلت کا جدا راستہ ہے، ممکن بلکہ کثیر الوقوع ہے کہ ایک شخص ایک فضیلت کے لحاظ سے تمام دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن اور فضائل سے اس کو بہت کم حصہ ملا تھا، سکندر سب سے بڑا فاتح تھا، لیکن حکیم نہ تھا، ارسطو حکیم تھا، لیکن کشورستان نہ تھا، بڑے بڑے کمالات ایک طرف چھوٹی چھوٹی فضیلتیں بھی ایک شخص میں مشکل سے جمع ہوتی ہیں، بہت سے نامور گذرے ہیں جو بہادر ہیں لیکن پاکیزہ اخلاق نہ تھے، بہت سے پاکیزہ اخلاق تھے لیکن صاحب تدبیر نہ تھے، بہت سے دونوں کے جامع تھے لیکن علم وفضل سے بے بہرہ تھے۔ اب حضرت عمرؓ کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو، صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، مسیح بھی تھے اور سلیمان بھی۔، تیمور بھی تھے اور نوشیراں بھی امام ابوحنیفہ بھی تھے اور ابراہیم ادہم بھی۔'' [۶۱]

.....کو سامنے کھڑا کر کے عیسائی دنیا سے سیدھا سوال کریں کہ ان کی سیاسی سماجی اور روحانی تاریخ میں کبھی کوئی ''عمرؓ'' بھی پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نیر جہاں اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

''اس تصنیف سے علامہ شبلی بتانا چاہتے تھے کہ انگریزوں کی تدبیر ملکی اور نظام حکومت نام ہے عیاری، موقع پرستی اور ابن الوقتی کا، لیکن 'عمر فاروقؓ تو نام ہے حق اور باطل میں فرق کرنے والے کا، شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلانے والے کا، طاقتوں کا سر جھکانے والے اور کمزوروں کے سر اٹھانے والے کا۔'' [۶۲]

لہذا دشمنان اسلام کے حملوں کا جواب دینے کے لیے عمر ابن خطابؓ کی حیات اور کارنامے نہ سامنے لائے جاتے تو اور کیا جاتا اور یہ فرض علامہ شبلیؒ نہ انجام دیتے تو اور کون انجام دیتا۔

حصہ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کی تفصیل ہے، فاروق اعظمؓ کی فتوحات کی وسعت کا دیگر مشہور فاتحین مثلاً چنگیز وسکندر سے موازنہ، نظام حکومت کے دوران شخصی اور جمہوری سلطنت کے موازنے، مجلس شوریٰ، صوبہ جات و اضلاع کی تقسیم اور ان کے انتظام، رفاہ عام، شہروں کی آبادی، صیغۂ فوج، صیغۂ مذہبی اور غلاموں کے حقوق سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ذاتی قابلیت، سیرت، مذاق شعروادب، علمی رجحانات اور فطری سادگی، اخلاق و عادات اور خصوصاً مذہبی اجتہادات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سید شاہ علی دوسرے حصے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> دوسرے حصے کی جزئیات نگاری، تلاش وتحقیق، حسن انتخاب، کثرت معلومات اور شگفتہ زبان، انداز بیان وغیرہ نہایت قابل داد ہے۔ خصوصاً قیاس، فقہ، پولیس، خمس، بیت المال مختلف انتظامی شعبوں کی جداجدا شاخوں پر بحث، ان کے اقوال و افعال اور لطائف و واقعات، خطوط و فرامین وغیرہ کی شمولیت نہایت قابل تعریف ہے۔ گو حضرت عمرؓ کے تاریخ اسلام سے تعلق اور کتاب کے ''لائف اینڈ ورک'' کے طرز پر ہونے کے باعث بعض مباحث سوانح عمری سے زیادہ تاریخ کی تعریف میں آتے ہیں۔'' ۶۳؎

اسلام کے اس جلیل القدر ہیرو نے اپنے عہد خلافت میں خالص شورائی نظام اور جمہوری حکومت قائم کی، آج پوری دنیا راج پاٹ، راجے رجواڑے اور شاہی نظام حکومت کو چھوڑ اسی جمہوری نظام حکومت و سلطنت کا ڈنکا پیٹتی اور ایوان جمہوریت میں انسانی سروں کو گنتی نظر آتی ہے، اور دور فاروقی کی جمہوریت کا احترام کرتی ہے۔ علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کے قائم کردہ نظام حکومت کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم آج تیرہ سو سال بعد بھی فاروقی جمہوریت کا ڈھانچہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور دیکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آ سکتا تھا، مجلس شوریٰ کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ ''الصلوۃ جامعۃ''، یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں، جب لوگ جمع

ہوجاتے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے، نماز
کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور پھر بحث طلب امر پیش کیا
جاتا تھا، معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے
جاتے تھے، لیکن جب کوئی اہم امر پیش آتا تھا تو مہاجرین وانصار کا
اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔مجلس
شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت حاصل
تھی۔صوبہ جات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کئے
جاتے تھے، بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا
تھا۔'' ٦٤ؔ

آج بھی چھوٹے بڑے محکمہ جات، وزارات وسفارات اور اعلیٰ عہدوں کے لیے تقرریاں ہوتی ہیں اور اس بات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ عیش وعشرت اور راحت وآرام کا ہر ممکن انتظام ہو، رعب ودبدبے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔لیکن فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں جو عمال اور موظفین مقرر کئے جاتے تو ان سے کیا عہد لیا جاتا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں:

''ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ
کھائے گا، دروازے پر دربان نہ رکھے گا، اہل حاجت کے لیے دروازہ
ہمیشہ کھلا رکھے گا، یہ شرطیں اکثر پروانۂ تقرری میں درج کی جاتی تھیں اور
ان کو مجمع عام میں پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔'' ٦٥ؔ

آج بھی یہ سلسلہ رائج ہے کے جب بھی کوئی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا ہے تقرری کے وقت متعلقہ افراد کی مالی حیثیت وجائداد کی فہرست پیش کرنے کی محض رسم ادا کی جاتی ہے۔جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں بھی شپت گرہن کے وقت یہ سارے رسوم ادا کیے جاتے ہیں۔لیکن حضرت عمرؓ نے بغیر کسی نظیر کے اعلیٰ عہدوں پر جو تقرریاں کیں وہ رہتی دنیا تک کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔جس کے متعلق علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

''جس وقت کوئی عامل مقرر ہوتا تھا اس کے پاس جس قدر مال اور اسباب
ہوتا تھا اس کی مفصل فہرست تیار کرا کر محفوظ رکھی جاتی تھی اور عامل کی مالی
حالت میں غیر معمولی ترقی ہوتی تھی تو اس سے مواخذہ کیا جاتا تھا۔'' ٦٦ؔ

اورصرف یہی نہیں بلکہ ہر سال عمال اور حکام کے متعلق عام لوگوں سے جائزہ لیا جاتا تھا، اور اس کے لئے کوئی خاص مجلس یا خفیہ میٹنگ منعقد نہیں کی جاتی تھی، بلکہ مجمع عام میں عوام الناس کی رائے لی جاتی، جس کا طرز علامہ شبلیؒ نے یہ بتایا ہے:

''تمام عمال کو حکم تھا کہ ہر سال حج کے زمانے میں حاضر ہوں، حج کی تقریب سے تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے، حضرت عمرؓ کھڑے ہوکر باعلان کہتے تھے کہ جس کسی کو عامل سے کچھ شکایت ہو پیش کرے۔'' ۶۷

اسی سے متعلق شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کا ایک انوکھا واقعہ تحریر کیا ہے، جس سے حضرت عمرؓ کا رعایا کے ساتھ برتاؤ اور ان کے حقوق کی پاسداری، اور عمّال وحکّام کے معاملات میں آپ کا احتیاط اور آپ کی حساسیت کا باریک بیں پہلو نظر آتا ہے۔ واقعہ کچھ اس طرح سے ہے:

''ایک دفعہ حضرت عمر نے بہت بڑا مجمع کر کے خطبہ دیا، اور کہا کہ ''صاحبو! عمال جو مقرر کر کے بھیجے جاتے ہیں اس لیے نہیں بھیجے جاتے کہ تم کو طمانچے ماریں یا تمہارا مال چھین لیں، بلکہ میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا طریقہ سکھائیں۔ سواگر کسی عامل نے اس کے خلاف کیا ہو تو مجھ سے بیان کرو، تاکہ میں اس کا انتقام لوں۔'' عمرو بن العاص نے جو مصر کے گورنر تھے، اٹھ کر کہا کہ ''اگر کوئی عامل ادب دینے کے لیے کسی کو مارے گا، تب بھی آپ اس کو سزا دیں گے'' حضرت عمرؓ نے کہا اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ضرور میں سزا دوں گا، کیونکہ میں نے خود رسول للہ صلی اللہ علیہ سلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے، خبردار مسلمانوں کو نہ مارا کرو ورنہ ذلیل ہو جائیں گے، ان کے حقوق تلف نہ کرو، ورنہ وہ کفرانِ نعمت پر مجبور ہوں گے۔'' ۶۸

اور حضرت عمرؓ کی یہ باتیں زمانہ ماضی قریب کے شاہی فرامین کے مثل یا موجودہ دور کے حکومتوں اور سلطنتوں کی طرح انتخابی منشور میں پیش کئے جانے والے جھوٹے اور بے بنیاد وعدے کی حد تک نہیں تھے،

کہ جس میں صرف عوام کا دل جیتنے کا دلفریب انداز نظر آتا ہے، اور عوام الناس کو صرف جھاگ اور بسا اوقات نرا شاہی ہاتھ لگتا ہے۔ اور کیونکر ایسا ہوتا کہ جس طرح خلیفۃ المسلمین کو اپنے ماتحت عمال و حکام سے معاملات کی تفتیش و تحقیق میں کوئی تامل نہیں تھا اسی طرح اس وقت کے زندہ دل رعایا کو بھی خلیفہ سے اپنے حقوق جتانے اور عمال و حکام کے کسی بھی بد نظمی یا کمی بیشی کی شکایت کرنے یا اس سے آگاہ کرنے میں کوئی جھجھک نہ تھی، اس کی بنیادی وجہ اسلام کا وہ زریں اصول ہے کہ یہاں اعلیٰ وادنیٰ کا کوئی تصور نہیں اسلام نے اونچ نیچ کو جڑ سے ختم کر دیا کہ خلیفہ ہو یا گورنر، امیر ہو یا مامور، حاکم ہو یا محکوم ان کے بیچ کسی قسم کا امتیاز وتفوق کی دیوار نہ تھی، جو کسی بھی انتظامی امور کے استحکام کی ساکھ ہوتی ہے، ہاں اسلام میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی کوئی تفریق ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے، فاروق اعظمؓ کا دور حکومت ایسے عملی مثالوں کا شاہکار ہے، جس کا اندازہ علامہ شبلیؒ کے ذکر کردہ ان دو واقعات سے ہوتا ہے: کہ

> ''ایک دفعہ حضرت عمرؓ بازار میں پھر رہے تھے، ایک طرف سے آواز آئی کہ ''عمر! کیا عاملوں کے لیے چند قواعد مقرر کرنے سے تم عذاب الٰہی سے بچ جاؤ گے، تم کو یہ خبر ہے کہ عیاض بن غنم جو مصر کا عامل ہے، باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس کے دروازے پر دربان مقرر ہے'' حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا اور کہا کہ عیاض کو جس حالت میں پاؤ ساتھ لو الاؤ۔ محمد بن مسلمہ نے وہاں پہنچ کر دیکھا تو واقعی دروازہ پر دربان تھا، اور عیاض باریک کپڑے کا کرتا پہنے بیٹھے تھے، اسی ہیئت اور لباس میں ساتھ لے کر مدینہ آئے، حضرت عمرؓ نے وہ کرتا اتروا کر ململ کا کرتا پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جا کر چراؤ، عیاض کو انکار کی مجال نہ تھی، مگر بار بار کہتے تھے کہ اس سے تو مرجانا بہتر ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا تجھ کو اس سے عار کیوں ہے؟ تیرے باپ کا نام غنم اسی وجہ سے پڑا تھا کہ وہ بکریاں چراتا تھا، غرض عیاض نے دل سے توبہ کی اور جب تک زندہ رہے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے رہے۔'' ۲۹؎

اسلام کی روح ریشم و کمخواب، حویلی ومحلات کی روح نہیں، وہ سادگی، جفاکشی، ایثار پسندی، اور سرفروشی کی روح ہے جسے حضرت عمرؓ امت مسلمہ میں دیکھنا چاہتے تھے، اسی سے متعلق یہ واقعہ بھی ہے جس میں ایک طرف ارباب حکومت وسلطنت کے لئے انمول سبق ہے تو دوسری طرف اسلام کی تعلیم مساوات کا اعلیٰ نمونہ ہے:

''حضرت سعد بن وقاصؓ نے کوفہ میں اپنے لیے ایک محل بنوایا تھا، جس میں ڈیوڑھی بھی تھی، حضرت عمرؓ نے اس خیال سے کہ اس سے اہل حاجت کو رکاوٹ ہوگا، محمد بن مسلمہ کو مامور کی کہ جا کر ڈیوڑھی میں آگ لگادیں، چنانچہ اس حکم کی پوری طرح تعمیل ہوئی، اور سعد بن وقاصؓ چپکے دیکھا کئے۔'' [۷۰]

شبلیؒ نے اس قسم کی باتوں کے بظاہر قابل اعتراض ہونے کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ لوگوں کے طرز معاشرت وذاتی افعال سے تعرض کرنا اصول آزادی کے خلاف ہے مگر اس کا انہوں نے جواب بھی دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''حضرت عمرؓ تمام ملک میں مساوات اور جمہوریت کی جو روح پھونکنی چاہتے تھے، وہ بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ وہ خود اور ان کے دست و بازو یعنی ارکان سلطنت اس رنگ میں ڈوبے نظر آئیں، عام آدمیوں کو اختیار ہے جو چاہیں کریں ان کے افعال کا اثر بھی انہی کی حد تک محدود رہے گا، لیکن جو لوگ سلطنت کے ارکان ہیں، ان کے طرز معاشرت کا ممتاز ہونا لوگوں کے دلوں میں اپنی حقارت کا خیال پیدا کرنا ہے، اور رفتہ رفتہ اس قسم کی باتوں سے سلطنت شخصی کی وہ تمام خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص آقا اور باقی تمام لوگ غلام ہیں۔'' [۷۱]

شبلیؒ نے اسے پولٹیکل مصالح اور عرب کے اصل مذاق مساوات وعدم ترجیح کے اصول پر اسی میں سلطنت کی کامیابی بتایا ہے، اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ یہ احکام عرب کی آبادیوں میں محدود تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''امیر معاویہ،شام میں بڑے سروسامان سے رہتے تھے،اور حضرت عمرؓ
ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے تھے،شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے ان
کے خدم وحشم کو دیکھ کے اس قدر کہا ''اکسـروانیۃ'' یعنی یہ نوشیروانی
جاہ وجلال کیسا؟ مگر جب انہوں نے جواب دیا کہ یہاں رومیوں سے
سابقہ رہتا ہے،اوران کی نظر میں بغیراس کے سلطنت کا رعب وداب نہیں
قائم رہ سکتا،تو حضرت عمرؓ نے پھر تعرض نہیں کیا۔'' ۲ے

حضرت عمرؓ کے عجیب وغریب کارناموں میں ایک یہ بھی ہے کہ تمدن کی ابتدائی حالت ہونے کے باوجود بہت سے شعبے جو مخلوط تھے الگ کر کے جداگانہ محکمے قائم کئے، ملک کو صوبے، اضلاع اور پرگنوں میں تقسیم کرنے کا کام اسلام میں حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے کیا، اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کے مناسب وموزوں حدود قائم کئے،صوبوں میں بڑے بڑے افسر اور عہدہ داروں کے نام لکھے جن سے ان کے فرائض کا تعین ہو گیا ہے،ان کی تنخواہیں، رشوت کے انسداد کے طریقے اور جرائم کے انسداد کے لئے کمیشن کے تقرر کا جو طریقہ تھا اس پر شبلیؒ لکھتے ہیں:

''عمال کی دیانت اور راست بازی کے قائم رکھنے کیلئے نہایت عمدہ اصول
یہ اختیار کیا تھا کہ تنخواہیں بیش قرار مقرر کی تھیں، یورپ نے مدتوں کے
تجربے کے بعد یہ اصول سیکھا ہے،اور ایشیائی سلطنتیں تو اب تک اس راز
کو نہیں سمجھیں،جس کی وجہ سے رشوت اور غبن،ایشیائی سلطنتوں کا خاصہ
ہو گیا ہے،حضرت عمرؓ کے زمانے میں اگرچہ معاشرت نہایت ارزاں
اور روپیہ گراں تھا،تاہم تنخواہیں علیٰ قدر مراتب عموماً بیش قرار تھیں،صوبہ
داروں کی تنخواہ پانچ پانچ ہزار تک ہوتی تھی،اور غنیمت کی تقسیم سے جو ملتا
تھا وہ الگ،چنانچہ امیر معاویہؓ کی تنخواہ ہزار دینار ماہوار یعنی پانچ ہزار
روپئے تھی۔'' ۳ے

حضرت عمر فاروقؓ کا ایک بے مثال اور لازوال کارنامہ جمع قرآن کا ہے،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مکمل قرآن مجید مختلف چیزوں پر لکھا ہوا تھا،سارے اجزا الگ الگ تھے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے مرض الوفات کے ساتھ ہی فتنے ابھرنے شروع ہوگئے ،اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان فتنوں نے شدت اختیار کر لی،حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان فتنوں کی سرکوبی کے لیے پوری طاقت و قوت صرف کردی، اور بہت سے معرکے اس دوران پیش آئے، جن میں سے ایک اہم معرکہ جنگ یمامہ کا ہے، جس میں بہت سے قراء شہید ہوئے جن کا اندازہ ۷۰ ر اور ایک قول کے مطابق ۷۰۰ تک لگایا گیا ہے۔اس صورت حال سے حضرت عمرؓ قرآن کی جانب سے بہت فکر مند ہوگئے، اور اس پریشانی کے عالم میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ ''اگر اس طرح حفاظ قرآن اٹھتے گئے تو قرآن جاتا رہے گا، اس لیے ابھی سے اس کی جمع وترتیب کی فکر کرنی چاہیے۔

حضرت ابوبکرؓ نے تھوڑے سے تردد کے بعد فاروق اعظم کے مسلسل اصرار کے نتیجے میں قرآن کی جمع وترتیب کی تجویز سے اتفاق کرلیا۔حضرت عمرؓ کا امت مسلمہ پر یہ ایک ایسا احسان ہے جس سے وہ قیامت تک سبکدوش نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ اپنے دور خلافت میں انہوں نے معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں وہ کسی فرزند اسلام کو قرآن سے نابلد نہیں دیکھ سکتے تھے:

> ''خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم جبری طور پر قائم کی، ایک شخص جس کا نام ابوسفیان تھا، چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اس کو سزا دے۔'' ۴۷

الفاروق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں شبلی ایک مورخ نہیں بلکہ ایک اچھے سوانح نگار کہ روپ میں نظر آتے ہیں۔سوانح عمری میں وہ ہر مقام پر خواہ تاریخ ہی کیوں نہ بیان کر رہے ہوں اپنے ہیرو کے ساتھ ساتھ گھومتے نظر آتے ہیں۔الفاروق کے ابتدائی حالات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے حالات آنے ضروری تھے۔شبلی کو محسوس ہوا کہ کہیں ان شخصیتوں کے سامنے ان کے ہیرو کا عکس پھیکا نہ نظر آنے لگے اس لئے وہ بڑی چابکدستی سے دامن بچا گئے۔اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ کی شخصیت بھی کچھ کم جاذب نہیں لیکن اس نازک موڑ پر بھی شبلی کی فنی کاریگری نے ساتھ دیا اور ہر قدم پر ان کا مرکز نظر ہیرو ہی رہا۔

واقعات کے انتخاب کا بھی شبلی کو خاص سلیقہ ہے۔بعض جگہ واقعات کی تکرار ہے لیکن موقع ومحل کے

لحاظ سے کوئی واقعہ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ جزئیات نگاری بھی ہر سوانح نگار کے بس کی بات نہیں ۔شبلی اپنے ہیرو کی شخصیت کی تکمیل کے لئے جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دارالصدقہ جاتے اور ایک ایک اونٹ کے پاس کھڑے ہو کر ان کے دانت گنتے اور ان کا حلیہ قلم بند کرتے'''' مقام جنگ سے قاصد آتا اور اہل فوج کے خطوط لاتا تو خود ان کے گھروں پر پہنچ آتے اور کہتے کہ فلاں تاریخ تک قاصد واپس جائے گا جواب لکھ کر رکھو کہ اس وقت تک روانہ ہو جائے ۔کاغذ، قلم دوات خود مہیا کر دیتے اور جس کے گھر میں کوئی حرف شناس نہ ہوتا خود چوکٹ کے پاس بیٹھ جاتے اور گھر والے جو لکھواتے لکھتے جاتے۔'' ۵ے

ہیرو سے جذباتی رشتہ ہونے کے باوجود شبلی کے قلم نے بشری کمزوریوں سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی اس کمزوری کا صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ وہ نکاح کا خطبہ اچھا نہیں دے سکتے تھے۔ ان کے مزاج میں سختی تھی جو بعد میں نرمی اور رحم دلی میں بدل گئی، لیکن مزاج میں اس تیزی وتندی کا اثر کافی مدت تک رہا۔اسی طرح سچے اور باعمل مسلمان ہونے کے باوجود انہیں اپنی آل واولاد خصوصاً ازواج سے رغبت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جس قدر عزت عورتوں کی کرنی چاہئے وہ نہیں کرتے تھے۔

شبلی جہاں اپنے ہیرو کی کمزوریاں تسلیم کرتے ہیں وہاں وہ مسلمانوں کے آباؤاجداد کی عظمت کے گیت بھی گاتے جاتے ہیں کہ یہ سلسلہ ناموارن اسلام کی تصنیف کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے، لیکن یہ گیت شاعر شبلی کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتے ، بلکہ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں کسی راوی کی زبانی کہتے ہیں مثلاً ایک جگہ حضرت عمرؓ کی عظمت اور بلند کردار کی مثال پیش کی ہے تو اسے ان کے غلام اسلم سے روایت کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کے لئے نکلے۔ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے، اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی۔اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے۔ان کے لئے خالی ہانڈی میں

پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے اور مدینہ میں آ کر
بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا میری پیٹھ
پر رکھ دو۔اسلم نے کہا، میں لئے چلتا ہوں۔فرمایا قیامت میں میرا بار تم
نہیں اٹھاؤ گے۔غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے
رکھ دیں۔اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی حضرت عمرؓ خود چولہا پھو
نکتے جاتے تھے۔کھانا تیار ہوا۔بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔حضرت عمرؓ
دیکھتے اور خوش ہوتے۔عورت نے کہا۔خدا تمہیں جزائے خیر دے۔سچ
یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمر۔'' ۶ے

الفاروق کی ان خصوصیات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''سیرت النبی'' کے بعد یہ شبلی کی بہترین تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے ہیرو کی خوبیوں اور خامیوں کو بلا تکلف بیان کیا ہے۔کمزوریوں کے لئے ''تاویلات'' کا سہارا انہیں لیا ہے۔شبلی کے اسلوب میں وہ طاقت ہے جس سے واقعات کا رخ با آسانی موڑ سکتے تھے، لیکن ایک سچے سوانح نگار کی طرح انہیں اپنے فرائض کا احساس رہا۔غالباً یہی اسباب تھے جنہوں نے کتاب کی مقبولیت میں چار چاند لگائے۔مہدی حسن افادی ''الفاروق'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غالباً یہ عمروں کی کمائی ہے۔بڑی کاوش و اہتمام سے سالہا سال کی امور
خانہ اور تدقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلے میں خلیفہ دوم (حضرت
عمرؓ) کی لائف پر یہ ضخیم کتاب تالیف کی گئی ہے۔مورخ نے محض تحقیق
واقعات کے لئے ممالک غیر یعنی ترکی و مصر وغیرہ کے مصائب سفر
برداشت کئے سینکڑوں قدیم و نایاب تاریخوں کے لئے ہزاروں ورق
الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصلی ماخذ کے چھان بین میں یورپ
کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔غرض کہ معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا
ہے وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات و مسائل میں جن کی
نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں
مل سکتا۔'' ۷ے

الفاروق میں شبلی کا فنی شعور درجہ کمال پر نظر آتا ہے، اور وہ ایک اہم اور مشکل تکنیک سے بڑی کامیابی

کے ساتھ عہد برآ ہوتے ہیں یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے ضمن میں کئی ثانوی کردار آتے ہیں، جو بذات خود اہم اور دلچسپ اور جاذب توجہ ہیں، اوراس درجہ زبردست ہیں کہ پڑھنے والے کی توجہ بڑی آسانی سے مرکزی کردار سے ہٹ کران کی طرف مرکوز ہوسکتی ہے۔خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عظیم ومکمل شخصیت ہی قاری کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے،لیکن شبلی کی صلاحیت اور فنکارانہ شعور بڑی چابکدستی سے اپنے چراغ کی لوکواس تیز درخشاں شمع کے سامنے روشن رکھتا ہے۔اسی طرح خالد بن ولید کی دلچسپ اور جرار شخصیت بھی کچھ کم جاذب توجہ نہیں ہے۔پھر تینوں صحابہ کرام صدیق اکبرؓ،حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شخصیتیں اپنی اپنی جگہ پر محبوب اور مسلم ہیں،لیکن ان سب کے درمیان شبلی کے ہیرو کا پرجلالی اور روشن چہرہ بدستور مسکراتا ہوااور نمایاں نظر آتا ہے۔

شبلی اپنے ہیرو کو بڑے نازک مرحلوں سے اس طرح نکال لے گئے ہیں کہ ان پر حرف نہ آنے پائے۔چنانچہ خالد بن ولید کی معزولی کا واقعہ کمال ہنرمندی اور مشاقی سے بیان کر کے اپنے ہیرو کواس مرحلے سے صحیح وسالم نکال لے جانا انہی کا کام تھا۔

اگر چہ الفاروق کا بڑا حصہ حضرت عمر کے تدبر اور ملکی انتظام کی جزئیاتی تفصیلات پر مشتمل ہے،لیکن شبلی نے ان کی ذاتی قابلیت ،سیرت ،مذاق شعروادب ،علمی رجحانات اور فطری سادگی کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ساتھ ہی اپنی دیانت داری اور فطری استدلال کی بناپر موضوع کی روح کو سمجھنے میں بڑے غور وفکر سے کام لیا ہے اوراسی روح کی بے نقابی نے 'الفاروق' کو بہترین سوانح عمری بنادیا ہے۔انہوں نے حضرت عمرؓ کو مجسم پیش کردیا ہے۔ان کی صفات اور عادات کو بتدریج پیش کر کے ان کے متعلق رائے اور فیصلہ قاری کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

## الغزالی:

شبلیؒ اپنے والد محترم کی وفات کے بعد نواب محسن الملک کے مشورے سے جولائی ۱۹۰۱ء میں نظام حیدرآباد کی ریاست میں سررشتۂ علوم وفنون میں بحیثیت ناظم کے ملازمت قبول کر لی وہ شروع ہی سے محسوس کر رہے تھے۔کہ یورپ نے اسلامی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے،تمام علوم وفنون کا قالب بدل دیا ہے، پھر

فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کر لی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں، معنیٰ و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک فلسفہ بن گئی ہے، تو شبلی چاہتے تھے کہ زمانہ کے مقتضا کے مطابق علم کلام کو فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں مرتب کیا جائے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلا جائے۔

چنانچہ وہ حیدر آباد کے قیام کے دوران علم الکلام پر کتابیں لکھنا چاہتے تھے، جس کو وہ مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور امت کا سرمایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اس کی مبسوط تاریخ چار جلدوں میں لکھنے کی کوشش کی۔ اور ان ہی الفاظ سے اس کتاب کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''علم کلام جو مسلمانوں کی خاص ایجادات میں سے ایک مہتم بالشان علم اور امت کا سرمایہ ناز ہے میں آج کل اس کی نہایت مبسوط تاریخ لکھ رہا ہوں اور اس کے چار حصے قرار دئے ہیں۔'' ۸ے

پہلی جلد میں علم کلام کی تاریخ، دوسری جلد میں اثبات عقائد اور ابطال فلسفہ پر بحث، تیسری جلد میں ائمہ کلام کی سوانح عمریاں اور چوتھی جلد میں جدید علم کلام پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پہلا حصہ لکھ رہے تھے کہ امام غزالیؒ کے متکلمانہ افکار و خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ جس طرح حکمرانوں میں مامون اور فقہاء میں امام ابوحنیفہؒ کو اپنا ہیرو بنایا تھا، اسی طرح متکلمین میں امام غزالیؒ کو اپنا ہیرو بنا لیا اور ان پر پوری ایک کتاب ہی تصنیف کر ڈالی۔

شبلی کی یہ کتاب مشہور مفکر اور متکلم حجۃ الاسلام امام محمد ابو حامد الغزالیؒ کی سوانح عمری ہے، اس کی تصنیف دسمبر ۱۹۰۱ء میں مکمل ہوئی اور اگست، ۱۹۰۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب بھی علامہ شبلیؒ کے عام دستور کے مطابق دو حصوں پر مشتمل ہے، اس کا پہلا حصہ تیس صفحات پر مشتمل ہے، جس کے ذیلی عنوانات درج ذیل ہیں:

امام صاحب کی ولادت، غزالی وجہ تسمیہ، امام صاحب کی تعلیم کا بند و بست، ابتدائی تعلیم، تعلیم کا طریقہ، امام صاحب کی یادداشتوں کا لٹ جانا، امام صاحب پر ایک قزاق کے طعنہ کا اثر، امام صاحب کا تکمیل تحصیل کی غرض سے نیشاپور کا سفر، امام الحرمین کی شاگردی، نیشاپور کی علمی حالت، امام الحرمین کا مختصر حال، سلطان وقت کے دربار میں امام الحرمین کی عزت، امام الحرمین کے شاگردوں کی تعداد چار سو تھی، جن میں تین

شخص بڑے ممتاز تھے، امام غزالی کا نائب مدرس مقرر ہونا، امام الحرمین کی وفات اوران کا ماتم، امام غزالی کا نیشاپور سے نکلنا، اس وقت کی ملکی حالت، خاندان سلجوقیہ، ملک شاہ، ملک شاہ کی وسعت سلطنت اورامن و امان، نظام الملک، نظام الملک کے زمانہ میں مصارف تعلیم کی تعداد، امام غزالی کا نظام الملک کے دربار میں پہنچنا اورعلماء سے مناظرہ، امام صاحب کا ۳۴ برس کی عمر میں نظامیہ کا مدرس اعظم مقرر ہونا، مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کس رتبہ کی چیز تھی، دارالخلافہ میں امام صاحب کا اقتدار واثر، امام صاحب کا ایک بڑی ملکی مہم حل کرنا، خلیفہ مستظہر باللہ کی فرمائش سے ایک کتاب کا تصنیف کرنا، امام صاحب کے وعظوں کا مجموعہ، تعلقات کا ترک اورعزلت و سیاحت، مختلف فرقوں سے مل کر امام صاحب کے مذہبی خیالات کا انقلاب، امام صاحب کے خیالات خودان کی زبان سے، علم کلام کا ناکافی ہونا، فلسفہ، باطنیہ تصوف، امام صاحب کا حالت بیخودی میں بغداد سے نکلنا، دمشق کا قیام اورمراقبہ ومجاہدہ، امام صاحب کے پیرشیخ فارمدی، شیخ فارمدی سے امام صاحب نے کس زمانہ میں بیعت کی ہوگی، بیت المقدس میں پہنچنا، حج وزیارت، سفر کے بعض دلچسپ حالات، مقام خلیل میں تین باتوں کا عہد کیا، اسی سفر میں احیاء العلوم تصنیف کی، دوبارہ درس وتدریس، نظامیہ نیشاپور میں تدریس، نظامیہ سے کنارہ کشی، امام صاحب کے حاسدین، امام صاحب کی مخالفت، سلطان سنجر کا امام صاحب کوطلب کرنا، امام صاحب کا خط، امام صاحب کا سنجر کے دربار میں جانا، سنجر پر امام صاحب کی تقریر کا اثر، امام صاحب کا نظامیہ بغداد کے درس کے لئے طلب ہونا، وزیراعظم کا خط، دربار خلافت سے امام صاحب کا طلب کیا جانا، امام صاحب کا انکاراورمعذرت، امام صاحب کا فن حدیث کی تکمیل کرنا، اخیرعمر کی تصنیف، وفات، امام صاحب کے شاگرد۔ جس سے امام صاحب کی زندگی کے متعلق بہت تفصیل سے نہیں مگر خاصا اہم اورضروری معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

شبلی کی اس سوانحی تصنیف میں امام صاحب کے حالات زندگی فنی طور پر بہت مختصر نظر آتے ہیں، شاید اسی وجہ سے بعض ادیبوں کے خیال میں شبلی اس میں اچھے سوانح نگار کی حیثیت سے نظر نہیں آتے ہیں۔ جیسا کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی کتاب ''شبلی پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس میں امام صاحب کے حالات زندگی پر کل تیس صفحے ہیں، ظاہر ہے
> کہ اس حیثیت سے مولانا اس میں اچھے سوانح نگار کی حیثیت سے نظر نہیں

آتے ہیں، اوراس میں وہ خود بھی محض سوانح نگار بننا نہیں چاہتے تھے، اس
میں تو ان کا مقصد علم کلام میں امام صاحب کے مہتم بالشان مسائل کو پیش
کرنا تھا'' ''اس کے لکھنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ مولانا کے معاصر علماء کو علوم
وفنون جدیدہ سے مطلق واقفیت نہیں تھی، اس لیے علوم جدیدہ سے متعلق
ان کو عجیب عجیب بدگمانیاں تھیں، مولانا ان بدگمانیوں کو بھی دور کرنا چاہتے
تھے، جو بڑی حد تک دور ہوئیں۔'' ۷۹

اوراس کتاب کی تصنیف کا مقصد خود علامہ شبلیؒ کی اس عبارت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جسے انہوں نے
اپنے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''پہلا حصہ بقدر معتد بہ لکھا جا چکا تھا کہ بوجوہ چند رک گیا، اور تیسرا حصہ
شروع ہوگیا، اس حصہ میں امام غزالیؒ کی سوانح عمری شروع ہوئی تو
بڑھتے بڑھتے ایک کتاب بن گئی، چونکہ پوری کتاب کی تیاری کو عرصہ
درکار تھا، مناسب معلوم ہوا کہ بلاانتظار باقی یہ حصہ الگ کردیا
جاجائے، امام صاحب کے حالات میں ان کے اصول عقائد اور طرز
استدلال کی تفصیل بھی ہے، اس طرح علم کلام کے اکثر مہتم بالشان مسائل
بھی اس کتاب میں آگئے ہیں۔'' ۸۰

فن کے اعتبار سے اختصار کی ایک وجہ تو اس اقتباس سے معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے علم کلام کے مہتم
بالشان مسائل پر روشنی ڈالنے کے لئے ہی اس کتاب کی تصنیف پر قلم اٹھایا ہے، اور دوسری وجہ فراہمی مواد کی
قلت بھی ہوسکتی ہے کیوں کہ اس سے پہلے غالباً امام صاحب کی سوانح عمری اردو میں ہی نہیں بلکہ دوسری
زبانوں میں بھی نہیں لکھی گئی، جس کا اندازہ علامہ شبلیؒ کے ان سطور سے ہوتا ہے:

''امام غزالیؒ کی سوانح عمری میں کوئی مستقل کتاب تو غالباً لکھی نہیں گئی
لیکن رجال تراجم کی کتابوں میں عموماً ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے
ساتھ مذکور ہیں ان میں سے متبین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن
الاشعری، اور طبقات الشافعیہ، خاصۃً ذکر کے قابل ہیں۔ پہلی کتاب
علامہ ابن عساکر دمشقی مشہور محدث کی تصنیف ہے۔ یہ اصل میں امام

اشعری کے حالات میں ہے، لیکن اشاعرہ میں جو لوگ مشاہیر تھے ان کا
بھی تذکرہ ہے، اس تقریب سے امام غزالی کے حالات بھی لکھے ہیں اور
چونکہ عبدالغافر فارسی کے حوالہ سے لکھے ہیں جو خود امام غزالی کے ہم عصر
تھے اس لئے جس قدر لکھا ہے حرف حرف سند کے قابل ہے'' ''دوسری
کتاب علامہ ابن عساکر السبکی کی تصنیف ہے جو مشہور محدث تھے یہ
کتاب اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ مجموعی حیثیت سے رجال کی کوئی
کتاب اس کی ہمسر نہیں کر سکتی، امام غزالی کا حال جس قدر اس کتاب
میں ہے، کسی کتاب میں اس سے زائد کیا اس کے برابر بھی نہیں مل
سکتا، اس لئے میں نے سوانح عمری کے متعلق زیادہ تر انہی دونوں کتابوں
پر مدار رکھا، باقی امام صاحب کے اصول اور مسائل، تو اس کے لئے خود
امام صاحب کی تصانیف کافی تھیں جس کا بہت بڑا ذخیرہ میرے پاس
موجود تھا۔'' ۱۸۱

امام غزالی کی پیدائش اور تعلیم کے سلسلے میں شبلی لکھتے ہیں:

''محمد نام، حجتہ الاسلام لقب، غزالی عرف، سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن
محمد بن محمد بن احمد۔ خراسان کے اضلاع میں ایک ضلع کا نام طوس ہے،
اس میں دو شہر ہیں، طاہران اور توقان۔ امام صاحب ۴۵۰ھ میں پیدا
ہوئے، ان کے باپ رشتہ فروش تھے، اور اس مناسبت سے ان کا خاندان
غزالی کہلاتا تھا۔'' ۱۸۲

امام صاحب کی ابتدائی تعلیم، جائے تعلیم، معلمین اولین، اس وقت کے طریقۂ تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے لئے سفر کے متعلق علامہ شبلی اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام صاحب نے فقہ کی ابتدائی کتابیں احمد بن محمد راذ کانی سے پڑھیں،
یہ بزرگ امام صاحب کے شہر ہی میں مقیم تھے اور یہیں درس دیتے تھے،
اس کے بعد جرجان کا قصد کیا، اور امام ابونصر اسمٰعیلی کی خدمت میں
تحصیل شروع کی، اس زمانہ میں درس کا یہ قاعدہ تھا کہ استاد مطالب علمیہ

پر جو تقریر کرتا تھا شاگرد اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے، اور نہایت احتیاط
سے محفوظ رکھتے تھے، ان یادداشتوں کو تعلیقات کہتے ہیں۔ ۸۳؎

اسی بیچ دوران سفر امام صاحب کے ساتھ ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا جس نے امام صاحب کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی، اس واقعہ کو علامہ شبلیؒ نے یوں تحریر کیا ہے:

''امام صاحب نے بھی تعلیقات کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، چندروز کے بعد وطن کو واپس آئے، اتفاق سے راہ میں ڈاکہ پڑا اور امام صاحب کے پاس جو کچھ سامان تھا سب لٹ گیا، اس میں وہ تعلیقات بھی تھیں جو امام ابونصر نے لکھوائی تھیں، امام صاحب کو اس کے لٹنے کا نہایت صدمہ تھا، چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنے اسباب اور سامان میں سے صرف اس مجموعہ کو مانگتا ہوں، کیونکہ میں نے انہی کے سننے اور یاد کرنے کے لئے یہ سفر کیا تھا، وہ ہنس پڑا اور کہا کہ تم نے خاک سیکھا؟ جب کہ تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے، یہ کہہ کر اس نے وہ کاغذ واپس دے دیے، اور امام صاحب پر اس کے طعنہ آمیز فقرے نے ہاتف غیبی کی آواز کا اثر کیا، چنانچہ وطن پہنچ کر وہ یادداشتیں زبانی یاد کرنی شروع کیں، یہاں تک کہ پورے تین برس صرف کردیے اور ان مسائل کے حافظ بن گئے۔'' ۸۴؎

اس کے بعد امام صاحب نے مزید علم میں پختگی اور وثوق حاصل کرنے کے لئے علوم وفنون کے دو بڑے مراکز نیشاپور اور بغداد کا قصد کیا، اور وہاں سے اپنے استاد ''امام الحرمین'' کی وفات کے بعد ہی واپس ہوئے، نظام الملک کے دربار میں حاضری ہوئی اور آپ کا پرزور استقبال کیا گیا، مناظروں میں آپ کی شرکت، نظامیہ میں آپ کی تقرری، خاندان سلجوق اور آل عباس میں آپ کا مرتبہ وغیرہ پر شبلی نے بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالتے ہوئے آپ کے ان آخری لمحات کا ذکر کیا ہے جب امام صاحب بغداد سے نکل کر دمشق پہنچے اور مجاہدہ وریاضت میں مشغول ہوگئے اور اسی عالم میں ۱۴/ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران اس دنیا سے رخصت ہوکر اپنے داعی اجل کو لبیک کہا، اور وہیں مدفون ہوئے۔ علامہ شبلی آپ کی وفات کے

متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

''ابن جوزی نے ان کے مرنے کا حال ان کے بھائی احمد غزالی کی زبان سے اس طرح روایت کیا ہے'': ''پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا'' آقا کا حکم سر آنکھوں پر۔'' یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیے، لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا۔'' ۸۵

جیسا کہ اوپر گزر چکا کہ ''الغزالی'' کا دوسرا حصہ امام صاحب کی تصنیفات اور آپ کی علمی سرگرمیوں پر مفصل بحث ہے، امام غزالیؒ کی تصنیفات کا جائزہ لینے سے پہلے علامہ شبلیؒ تمہید کے طور پر لکھتے ہیں:

''تصنیفات کے لحاظ سے امام صاحب کی حالت نہایت حیرت انگیز ہے، انہوں نے کل ۵۴/۵۵ سال کی عمر پائی، تقریباً ۲۰ برس کی عمر سے تصنیف کا مشغلہ شروع ہوا۔ دس گیارہ برس صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں گزرے، درس وتدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا، اور کبھی کسی زمانے میں ان کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی، فقر وتصوف کے مشغلے جدا، دور دور سے جو فتاوے آتے تھے ان کا جواب لکھنا الگ، بایں ہمہ سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں اور گونا گوں مضامین سے پر ہیں، اور جو تصنیف ہے اپنے باب میں بے نظیر۔'' ۸۶

امام صاحب کو یورپ نے خاص اہمیت اور امتیاز وفوقیت دی، ان کی تصنیفات پر یورپ میں زمانے تک چرچا رہا، اور بہت سے نامور مصنفین نے ان کی تصانیف پر شروحات وحواشی لکھے، اور امام صاحب کے فلسفہ کی تاریخ پر لکھی گئی کتابیں مستند قرار دی گئیں۔ شبلی کو اس بات کا افسوس تھا، کہ مسلمان فلسفہ اور علم الکلام سے کوئی ذہنی نسبت نہیں رکھتے اور عقلیات کے مسائل سے دور بھاگتے ہیں، علامہ شبلیؒ اپنے دعوے کی وضاحت کے لئے دلیل پیش کرتے ہوئے ''امام صاحب کی تصانیف اور یورپ'' پر لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات ہے کہ امام صاحب کی تصنیفات کے ساتھ جو اعتنا یورپ نے کیا، خود مسلمانوں نے نہیں کیا بے شبہ مسلمانوں نے امام صاحب کی

اکثر تصنیفات محفوظ رکھیں اور ان پر شروح وحواشی لکھے، لیکن یہ التفات اور قدردانی صرف تصنیفات کے ساتھ محدود رہا جو فقہ، اصول فقہ اور تصوف و اخلاق کے متعلق تھیں، عقلیات میں جو ان کی معرکہ آرا تصنیفات ہیں اور جہاں آ کر ان کا اصلی جوہر کھلتا ہے، ان کو کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا، بلکہ اس قسم کی کتابوں کو ہمارے علماء ان کی طرف منسوب بھی نہیں ہونے دیتے، برخلاف اس کے یورپ نے ان ہی کتابوں کو بڑے اہتمام سے محفوظ رکھا، جن میں امام صاحب نے فلسفہ اور شریعت کے اصول میں باہم تطبیق دی تھی یا جن میں عقلیات کے مسائل کو اپنے خاص پیرایہ میں ادا کیا تھا۔'' ۸۷؎

امام صاحب کی مشہور تصنیف ''احیاء العلوم'' جو تمام علمی حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے، جس کے بارے میں شیخ ابومحمد راذ کانی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو احیاء العلوم سے میں سب کو زندہ کر دوں گا، تصوف وسلوک میں جو لوگ امام صاحب کے ہمسر تھے ان کی اس تصنیف کو الہامی سمجھتے تھے، شیخ علی نے پچاس مرتبہ اول سے اخیر تک احیاء العلوم کو ختم کیا ہے اور ہر ختم پر فقراء اور طلباء کی عام دعوت کی۔ اس کتاب کی عظمت اور قدر و قیمت کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ شبلیؒ توکل وقناعت کے صرف باطل ہی نہیں بلکہ گمراہ کن اور اس کے نتیجہ میں تباہ کن پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ امام صاحب نے اس موضوع پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے:

''چونکہ یہ مسئلہ نہایت نازک اور دقیق تھا، اور چونکہ اس کی غلط فہمی نے بہت برا اثر پیدا کیا تھا، امام صاحب نے اس پر نہایت مفصل اور مدلل بحث کی ہے، اعمال المتوکلین کے لفظ سے جو عنوان باندھا ہے اس کی ابتداء اس جملے سے کرتے ہیں، اعلم ان العلم........فی الشرع۔ ترجمہ: جاننا چاہئے کہ علم ایک کیفیت پیدا کرتا ہے اور کیفیت سے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ توکل کے معنی ہیں کہ اکتساب معاش کے لیے نہ ہاتھ پاؤں ہلائے جائیں، نہ کوئی تدبیر سوچی جائے، بلکہ آدمی اسی طرح بیکار پڑا رہے جس طرح چیتھڑا زمین پر پڑا رہتا ہے........لیکن

یہ جاہلوں کا خیال ہے، کیونکہ ایسا کرنا شریعت میں حرام ہے۔'' ۸۸؎

امام غزالیؒ کو اصلاح عقائد کی بڑی فکر تھی، اور انہوں نے اس پر پوری توجہ دیتے ہوئے اس کو طویل بحث کا موضوع بنایا اور اس سے متعلق بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ امام صاحب کو اس بات کی بے انتہا تلاش تھی کہ اخلاقی تنزلی کے اسباب و وجوہ کیا ہیں اور اس کا اصل مصدر کیا ہے، چونکہ زندگی میں انہوں نے بڑے نشیب و فراز دیکھے تھے، اور مختلف المزاج شخصیتوں سے ملے تھے، ان کی ملاقات سلاطین، وزراء، امراء، علماء اور صوفیہ سے ہو چکی تھی اور انہیں ہر عنوان سے انہوں نے جانچا اور پرکھا تھا اور ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو ان کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھا، اس لیے ان کے سامنے حقیقت حال عیاں تھیں، چنانچہ علامہ شبلیؒ اس صورت حال کو امام صاحب ہی کے الفاظ میں لکھتے ہیں:

''رعایا اس وجہ سے ابتر ہوگئی کہ سلاطین کی حالت بگڑ گئی اور سلاطین کی حالات اس وجہ سے بگڑی کہ علما کی حالت بگڑ گئی، اور علماء کی خرابی اس وجہ سے ہے کہ جاہ و مال کی محبت نے ان کے دلوں کو چھا لیا ہے۔'' ۸۹؎

امام صاحب پوری زندگی جس خیال سے دوچار رہے علامہ شبلی اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی شخص اگر امام صاحب کے تمام حالات اور خیالات کو غور کی نگاہ سے دیکھے تو اس کو صاف نظر آئے گا کہ امام صاحب کو سب سے زیادہ جس چیز کا رونا ہے، وہ علماء کی حالت ہے۔ یہ آگ ان کے دل میں اس قدر بھری ہوئی ہے کہ ذرا سی تحریک سے فوراً بھڑک اٹھتی ہے۔ کسی قسم کا ذکر ہو، کوئی بحث ہو، کوئی تذکرہ ہو، یہ پُر درد ترانہ خواہ مخواہ ان کی زبان پر آ جاتا ہے۔ اور احیاء العلوم تو سراپا اسی نوحہ سے لبریز ہے۔ غرور، جاہ، ریا وغیرہ عیوب نفسانی پر جو مضامین لکھتے ہیں، سب میں تصریح کی ہے کہ عیوب سب سے زیادہ علماء میں ہیں۔'' ۹۰؎

الغزالی کا آخری باب ''امام صاحب کی مخالفت'' کے عنوان سے قائم ہے، اس باب میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ امام صاحب کی مقبولیت کے اگرچہ بہت سے اسباب تھے، جن کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی میں ہی

ان کو حجۃ الاسلام کا لقب ملا، جو آج تک قائم ہے، لیکن مخالفت کے بھی کچھ کم اسباب نہ تھے۔ مخالفین میں کچھ تو وہ تھے جن کی مخالفت کا سبب ان کا بغض وعناد تھا، لیکن ان میں محدث مرزی جیسے لوگ بھی تھے جن کا پایہ بہت بلند تھا۔

امام غزالی کی مخالفت کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے فلسفہ کو دین میں ملانا چاہا اور فلسفہ کی پرزور حمایت کی، غزالی نے بوعلی سینا کے خیالات کو قبول کیا جس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ عقائد اسلام کو فلسفہ کے قالب میں ڈھال دے۔

دوسرا سبب مخالفت احیاء العلوم میں نہایت ضعیف اور موضوع حدیثوں کی شمولیت تھی۔ مخالفین میں ایک بڑی شخصیت ابوالولید طرطوشی کی ہے جنہوں نے امام صاحب کے ساتھ رہ کر ان کے خیالات ومعتقدات ان کی ہی زبانی سنے اور اخذ کئے تھے، اس سے متعلق ان کے خیالات قابل اعتنا ہیں، جو درج ذیل ہیں:

> ''میں نے غزالی کو دیکھا ہے، بے شبہ وہ نہایت ذہین، فاضل اور واقفِ فن ہیں، ایک مدت تک وہ علوم کے درس وتدریس میں مشغول رہے، لیکن آخیر میں سب چھوڑ چھاڑ کر صوفیوں میں جا ملے اور فلسفہ کے خیالات اور منصور حلاج کے معمے مذہب میں مخلوط کر دیے، فقہا اور متکلمین کو برا کہنا شروع کیا اور قریب تھا کہ مذہب کے دائرہ سے نکل جائیں، احیاء العلوم لکھی تو چونکہ تصوف میں پوری مہارت نہیں تھی اس لیے منہ کے بل گرے اور تمام کتاب میں موضوع حدیثیں بھر دیں۔'' 91

امام ابن جوزی نے احیاء العلوم کی غلطیوں پر ایک مکمل کتاب لکھ ڈالی ہے جس کا نام ''اعلام الاحیا باغلاط الاحیا'' رکھا، ان اختلافات واعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

> ''امام صاحب پر جو نکتہ چینیاں اور اعتراضات کیے گئے اکثر بے جا اور بے بنیاد تھے، لیکن اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک اشخاص پرستی میں مبتلا نہ تھے، بلکہ آزادی رائے کا جوہر ان میں باقی تھا، امام صاحب کا فضل وکمال تمام عالم میں مسلم ہو چکا تھا، خود سلاطین وقت ان کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے، تاہم آزادیٔ رائے نے

لوگوں کواس بات پر مجبور کیا کہ ان کی رائے میں امام صاحب نے جو
غلطیاں کی تھیں بے تکلف ظاہر کردیں ۔اس واقعہ سے یہ نہیں سیکھنا
چاہئے کہ صحیح واقفیت کے بغیر کسی چیز کی نسبت جو خیالات قائم کئے جاتے
ہیں وہ صحیح نہیں ہوتے ،محدث ابن الصلاح ،قاضی عیاض مازری، ابن
جوزی کس رتبے کے لوگ ہیں لیکن چونکہ فلسفہ ومنطق نہیں جانتے تھے،
اس لئے کس قدر غلط رائیں قائم کیں اور امام صاحب پر کیسے بے جا
الزامات لگائے ، ہمارے زمانے کے علماء کا بھی یہی حال ہے، چونکہ ان کو
علوم وفنون جدیدہ سے مطلق واقفیت نہیں،اس لئے علوم جدیدہ کے متعلق
ان کو عجیب عجیب بدگمانیاں ہیں۔'' ۹۲

## سوانح مولانا روم:

مولانا شبلی کی اہم تصنیف میں ''سوانح مولانا روم'' سلسلہ کلامیہ کی چوتھی کڑی ہے۔ یہ کتاب مولانا جلال الدین رومی کی سوانح عمری ہے۔ جسے شبلی نے زمانہ قیام حیدرآباد میں ۱۹۰۴ء میں مکمل کی تھی۔اور یہ پہلی مرتبہ ۱۹۰۶ء میں الندوہ میں منظر عام پر آئی۔اس میں شبلی نے مولانا روم کی زندگی کے حالات کو مفصل طور پر قلمبند کیا ہے۔سوانح مولانا روم کی وجہ تسمیہ کے متعلق شبلی خود رقم طراز ہیں کہ:

''مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر وتصوف ہے،اور اس
لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی
سوانح عمری لکھنا،لوگوں کو موجبِ تعجب ہوگا۔لیکن ہمارے نزدیک اصل
علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس
کے حقائق ومعارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشین
ہوجائیں۔مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے ،مشکل
سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔اس لئے ان کو زمرہ متکلمین سے خارج کرنا
سخت ناانصافی ہے ۔'' ۹۳

شبلی نے جب سلسلہ کلامیہ میں کتابیں لکھنے کا آغاز کیا تو علم الکلام، الکلام اور الغزالی کے شائع ہونے کے بعد وہ سوانح مولانا روم کی طرف متوجہ ہوئے۔ حالانکہ سوانح مولانا روم لکھنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ مولانا روم کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی کارناموں سے دنیا کو متعارف کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا روم کو حکیم کی حیثیت سے اور ان کی مثنوی کا عقائد وکلام کی حیثیت سے مفصل جائزہ لیا ہے۔

سوانح مولانا روم میں شبلی کا طرز تحریر نہایت پر کیف اور شگفتہ ہے۔ ان کا انداز پختہ کارانہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود سادہ، دلکش اور پر اثر ہے۔ اور یہی سادگی وپرکاری ان کے اسلوب کی اہم خصوصیت ہے۔ علامہ شبلی کی دوسری سوانحی تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مولانا روم کی سوانح اور دوسرے حصہ میں مثنوی معنوی پر تقریظ وتبصرہ ہے، الغزالی کی طرح سوانح مولانا روم کا بھی پہلا حصہ مختصر اور دوسرا حصہ علامہ کی وسعت نظر اور کدوکاوش کا نمونہ ہے۔

پہلے حصے کا آغاز مولانا روم کی ابتدائی زندگی کے حالات سے کیا ہے۔ شجرہ نسب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا روم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے تھے اور سلطان محمد خوارزم شاہ ان کا نانا تھا، ان کے والد مولانا بہاء الدین پایہ کے بزرگ اور فضل وکمال میں یکتائے روزگار تھے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا روم ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاء الدین سے حاصل کی۔ شیخ بہاء الدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پایہ کے فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوش تربیت میں دیا۔ وہ مولانا کے اتالیق بھی تھے اور استاد بھی، مولانا نے اکثر علوم وفنون ان ہی سے حاصل کیے۔۔۔۔۶۲۹ ہجری میں جب ان کی عمر ۲۵ برس کی تھی تکمیل فن کے لیے شام کا قصد کیا۔۔۔۔مولانا نے سات برس تک دمشق میں رہ کر علوم کی تحصیل کی، اور اس وقت مولانا کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔'' ۹۴

علامہ شبلی نے مولانا روم کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلے دور میں ان پر علوم ظاہری اور دوسرے دور میں علوم باطنی کا رنگ غالب رہا، پہلے دور کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''مولانا پر اب تک ظاہری ہی علوم کا رنگ غالب تھا۔ علوم دینیہ کا درس

دیتے تھے، وعظ کہتے تھے، مثنوی لکھتے تھے، سماع وغیرہ سے قطعاً احتراز
کرتے تھے۔" ۹۵

اس کے علاوہ مولانا روم کے زندگی میں کچھ نمایاں اوراہم پہلو ایسے تھے جن پرشبلی نے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً مولانا روم کی شمس تبریز سے ملاقات کے واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"ایک دن مولانا گھر میں تشریف رکھتے تھے، تلامذہ آس پاس بیٹھے تھے
، چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، اتفاقاً شمس تبریز کسی طرف سے
آنکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے، مولانا کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا کہ یہ
(کتابوں کی طرف اشارہ کر کے ) کیا ہے، مولانا نے کہا یہ وہ چیز ہے
جس کو تم نہیں جانتے، یہ کہنا تھا کہ دفعتہً تمام کتابوں میں آگ لگ گئی
مولانا نے کہا یہ کیا ہے، شمس نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے،
شمس تو یہ کہکر چل دیے مولانا کا یہ حال ہوا کہ گھربار، مال اولاد، سب
چھوڑ چھاڑ نکل کھڑے ہوئے، اور ملک بملک خاک چھانتے پھرے،
لیکن شمس کا کہیں پتہ نہ لگا۔" ۹۶

اس دور میں شمس تبریز سے ان کی ملاقات ہوئی اس ملاقات کے متعلق انھوں نے کئی روایتیں اور واقعات لکھے ہیں، شمس تبریز کا بھی مختصر حال قلم بند کیا ہے، ان کی ملاقات سے مولانا روم تصوف وسلوک اور معرفت کی طرف نہ صرف مائل ہوئے بلکہ اس میں غرق ہوگئے۔ یہیں سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اس کی تمام تفصیلات علامہ شبلی نے قلم بند کی ہیں، شمس تبریز سے انھیں جو والہانہ شیفتگی پیدا ہوگئی تھی اور معرفت کا ان پر جو نشہ طاری ہوگیا تھا اس کا ذکر بھی علامہ شبلی نے اسی اسلوب میں کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا روم کے تلامذہ اوران کی آل اولاد کا تذکرہ ہے ان کے سلسلہ باطنیہ، معاصرین کے ذکر کے ساتھ ان کے اخلاق وعادات، زہد وقناعت، تحمل وتواضع، توکل الی اللہ وغیرہ اوصاف اوراس کے واقعات قدرے تفصیل سے قلم بند کئے گئے ہیں جس سے مولانا روم کی عظمت وبلند پائیگی پورے طور پر عیاں ہوتی ہے۔

اس تصنیف میں شبلی نے مولانا روم کی خوبیوں کو بھی موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے اخلاق

وعادات کا ذکر کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں کہ مولانا روم پر تصوف کا رنگ بہت گہرا تھا اور اس قدر گہرا کہ ان کی پوری زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔تصوف کے باعث ان کی ذہنی ،فکری ،روحانی اور نفسیاتی کیفیت مکمل طور پر بدل گئی۔اس ضمن میں شبلی فرماتے ہیں:

''مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے۔ان کی زندگی عالمانہ جاہ وجلال کی شان رکھتی تھی۔ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلباء بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔مناظرہ اور مجادلہ جو علماء کا عام طریقہ تھا مولانا اس میں اوروں سے چند قدم آگے تھے،سلاطین اور امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا،لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔'' ۹۷

اسی طرح مولانا روم کے زہد وقناعت کے متعلق رقم فرما ہیں کہ:

''مزاج میں انتہا درجہ کا زہد وقناعت تھی،تمام سلاطین وامراء،نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے،لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے،جو چیز آتی اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے۔کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اصرار کرتے تھے تو کچھ رکھ لیتے۔جس دنگھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ہوتا بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔'' ۹۸

مولانا روم کے تحمل وتواضع کے متعلق شبلی لکھتے ہیں۔

''ایک دفعہ بازار میں جارہے تھے۔لڑکوں نے دیکھا تو ہاتھ چومنے کے لیے بڑھے۔آپ آپ کھڑے ہوگئے۔لڑکے ہر طرف سے آتے اور ہاتھ چومتے جاتے۔مولانا بھی ان کی دلداری کے لئے ان کے ہاتھ چومتے۔ایک لڑکا کسی کام میں مشغول تھا۔اس نے کہا مولانا !ذرا ٹھہر جایئے میں کام سے فارغ ہولوں۔مولانا اس وقت تک وہیں کھڑے رہے کہ لڑکا فارغ ہو کر آیا اور دست بوسی کی عزت حاصل

کی۔'' ۹۹

اسی بیان میں آگے لکھتے ہیں کہ:

ایک دفعہ دو شخص سرِ راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے
تھے، ان میں سے ایک نے کہا او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا۔ اتفاق
سے مولانا کا ادھر گزر ہوا۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ ''بھائی جو کچھ
کہنا ہے مجھ کو کہہ لو، مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔ دونوں
مولانا کے پانوں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔'' ۱۰۰

ان اقتباسات کے مطالعے سے مولانا روم کی شخصیت کی واضح تصویر آنکھوں کے سامنے منعکس ہوتی ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا روم کی ذہنی و روحانی تعمیر و تکمیل میں تصوف کا جو کردار رہا ہے اسے بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔

شبلی مولانا روم کی وفات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پانچ جمادی الثانی ۶۷۲ ہجری (۱۲۷۳ء) میں وفات پائی اور قونیہ کی خاک کا پیوند ہوئے۔ غرض اس حصہ میں ان کی زندگی کا ایک مختصر مگر جامع مرقع قلم بند کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز فاخرہ:

''بڑی کاوش سے سیرت کے نقوش واضح کیے ہیں۔ ابتدائی حالات میں
نام و نسب، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد، وفات وغیرہ کا ذکر بڑے دلچسپ
انداز میں کیا ہے۔'' ۱۰۱

سوانح مولانا روم کے دوسرے حصے میں مولانا روم کی تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ جس میں فیہ مافیہ، دیوان شمس تبریز اور مثنوی معنوی اہم ہیں۔ ''فیہ مافیہ'' ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو ان کی زبان سے صادر ہوا کرتے تھے اور ان کے صاحبزادے سلطان ولد وقتاً فوقتاً اسے قلمبند کرتے جاتے تھے۔ فیہ مافیہ کے علاوہ مولانا روم کی سب سے اہم تصنیف ان کی غزلیات کا مجموعہ دیوان شمس ہے۔ رومی نے اس والہانہ عشق و محبت کی وجہ سے جو انہیں شمس تبریز سے تھی اپنے دیوان کا نام ''دیوان شمس'' رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مثنوی معنوی کا ذکر کیا ہے۔

دراصل مولانا روم کی شہرت کی بنیاد اسی مثنوی پر ہے۔ یہی کتاب ہے جس نے رومی کے نام کو آج

تک زندہ رکھا ہے۔اور بقول شبلی اس مثنوی کی شہرت ومقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے۔مثنوی معنوی کے اس منفرد مطالعہ وجائزہ کی داد حبیب الرحمٰن شیروانی نے ان الفاظ میں دی ہے:

''مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا اس کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے لیکن (جہاں تک معلوم ہے) صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے، یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم الکلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے۔'' ۱۰۲

مثنوی کے ذکر میں اس کے سبب تصنیف، شہرت ومقبولیت اور اس کے اسباب، اس کی ترتیب، مثنوی اور حدیقہ کے مشترک مضامین اور اس کی متعدد خصوصیات کا ذکر ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے وہ اس کا طرز استدلال اور طریقہ افہام ہے، استدلال کے تین طریقے ہیں، قیام، استقراء، تمثیل، چونکہ ارسطو نے تینوں میں قیاس کو ترجیح دی تھی اس لئے اس کی تقلید سے حکمائے اسلام میں بھی اس طریقہ کو زیادہ تر رواج ہوا۔۔۔مولانا روم نے زیادہ تر اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبایع کے افہام وتفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے، استدلالی تمثیل کے لئے تخیل کی بڑی ضرورت ہے جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے اس بنا پر مثنوی کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب ہے وہ یہی قوت تخیل ہے۔'' ۱۰۳

اس کے بعد مثنوی کے کلامی مباحث پر اظہار خیال کیا ہے، مثنوی کی شہرت عام اور اس کی کلامی حیثیت واضح کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''مثنوی نے عالم شہرت میں جو امتیاز حاصل کیا ہے آج تک کسی مثنوی کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر مقبول ہونے اور ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھے جانے کے بعد بھی لوگ اس کو جس حیثیت سے جانتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ تصوف اور طریقت کی

کتاب ہے، یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ وہ صرف تصوف نہیں بلکہ عقائد
اور علم کلام کی بھی عمدہ ترین تصنیف ہے، موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی
نے قائم کی اور امام رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچا دیا اس
وقت سے آج تک سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکیں، یہ سارا دفتر
ہمارے سامنے ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل عقائد جس خوبی سے
مثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہے۔'' ۱۰۴

شبلی کا خیال ہے کہ کلام وعقائد کے تمام اہم بنیادی موضوعات کا ذکر مثنوی میں موجود ہے چنانچہ انھوں نے الٰہیات، ذات باری، صفات باری، نبوت اور اس کی حقیقت، وحی، معجزہ، روح، معاد، جبر وقدر وغیرہ کا عنوان قائم کر کے مثنوی میں مولانا روم نے ان سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی وضاحت کی ہے، کتاب کا یہ حصہ بہت اہم اور علامہ شبلی کے تخلیقی اجتہادات کا نمونہ ہے۔ مثنوی معنوی کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک یہ مقبولیت نہیں ملی۔ اس مثنوی کی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں حقائق ومعارف کو قصوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فارسی میں تصوف کا بہترین اور مکمل ترین مجموعہ ہے۔ اور محض تصوف ہی نہیں بلکہ علم کلام اور عقائد کی بھی بہترین تصوف ہے۔

اس تصنیف میں شبلی نے جا بجا دلچسپ قصے بیان کئے ہیں۔ مثلاً:

''مولانا حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، سامنے کچھ کتابیں رکھی ہوئی
تھیں۔ شمس نے پوچھا کہ یہ کتابیں ہیں۔ مولانا نے کہا یہ قیل وقال ہے،
تم کو اس سے کیا غرض۔ شمس نے کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔
مولانا کو نہایت رنج ہوا اور کہا کہ میاں درویش! تم نے ایسی چیزیں ضائع
کر دیں جواب کسی طرح نہیں مل سکتیں۔ ان کتابوں میں ایسے نادر نکتے
تھے کہ ان کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ شمس نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام
کتابیں نکال کر کنارہ پر رکھ دیں۔ لطف یہ کہ کتابیں ویسی خشک کی خشک
تھیں، نمی کا نام نہ تھا۔ مولانا پر سخت حیرت طاری ہوئی۔ شمس نے کہا یہ
عالم حال کی باتیں ہیں، تم ان کو کیا جانو۔ اس کے بعد مولانا ان کے
ارادت مندوں میں داخل ہو گئے۔'' ۱۰۵

اور ایک قصہ ملاحظہ ہو۔

''۶۷۲ھ میں قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا اور متصل ۴۰ دن تک قائم رہا۔ تمام لوگ سراسیمہ وحیران تھے۔آخر مولانا کے پاس آئے کہ یہ بلائے آسمانی ہے۔مولانا نے فرمایا کہ زمین بھوکی ہے،لقمہ تر چاہتی ہے اور انشاالله کامیاب ہوگی۔'' ۱۰۶

لہذا اس تصنیف کے ذریعے انھوں نے نہ صرف مولانا روم کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا بلکہ رومی کے فلسفیانہ ذہن کو عرفان وحکمت کے پردے میں پیش کر کے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

سوانح مولانا روم میں فکری فنی اور سوانحی محاسن بے شمار ہیں اگر چہ شبلی کے مطابق اس تصنیف کے لئے خاطر خواہ مواد دستیاب نہ تھا۔انھوں نے محض دو کتابوں کو ماخذ بنایا ہے۔اور یہ کتابیں چونکہ قدیم طرز پر لکھی گئی ہیں لہذا اس میں اہم اور کارآمد باتوں کا ذکر کم ملتا ہے۔مواد کی کمی کے علاوہ اس کی ایک اور خامی یہ ہے کہ قدیم سوانح نگاروں نے جہاں مولانا روم کو مافوق البشر ہستی بنا کر پیش کرنے کی سعی کی وہیں شبلی نے انھیں ایک حکیم اور ماہر علم کلام کی صورت میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔شبلی نے بلا لحاظِ ترتیب واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ مثلاً ابتداء میں روم کی پیدائش کا ذکر کرنے کے فوراً بعد اٹھارہویں سال کی حالات زندگی کا بیان کرتے ہیں۔ اور پھر مولانا کی چالیس سال کی عمر کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔اور پھر چند واقعات کا بیان کر کے وفات کا تذکرہ کیا ہے۔سوانحی اعتبار سے یہ سوانح عمری شبلی کی محنت وکاوشوں کا عمدہ ثبوت ہے۔بقول ڈاکٹر نیر جہاں:

''سوانح مولانا روم اپنی بعض خامیوں کے باوجود سوانحی اعتبار سے شبلی کی محنت اور سلیقے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔انھیں مولانا کی شخصیت کے سلسلے میں جو کچھ بھی مواد ملا اور جیسا کچھ بھی ملا اس پر محنت کی ہے اور جہاں کہیں انھیں خامیوں کا احساس ہوا ہے اس کا اقرار بانگ دہل کیا ہے اور خلافِ عقل اور بعید از قیاس روایتوں کو قبول کرنے سے صاف طور پر انکار کر دیا ہے۔بعض کوتاہیوں کے باوجود شبلی نے مولانا روم کے نام ونسب ،

تعلیم وتربیت، استاتذہ، مدارس، شادی، اولاد اور وفات، تصوف سے لگاؤ، ارباب صحبت، معاصرین اور اخلاق و عادات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ صاحب سوانح کا پیکر سامنے آجاتا ہے۔'' ۱۰۷

الطاف فاطمہ کے بقول:

''سوانح مولانا روم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر میں سوانح کا ہیرو اس درجہ محبوب اور محترم نہ تھا جتنا اس کا کارنامہ وہ اس ضمن میں یہ امر قطعی نظر انداز کر گئے کہ شخصیت ہی کارنامے کو حسن و عظمت عطا کرتی ہے اور کارناموں کی اہمیت شخصیت ہی کی مرہون منت ہے۔'' ۱۰۸

اس سلسلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی کہتے ہیں:

''اس میں باوجود ذاتی حالات کی مجموعی ضخامت کے ۱/۵ (۳۲ صفحے) ہونے کے بہ نسبت زیادہ اطمینان بخش ہیں، اس کے علاوہ شبلی کا سوانحی شعور بھی اس میں زیادہ ترقی یافتہ معلومہوتا ہے۔'' ۱۰۹

اس کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالواسع لکھتے ہیں کہ:

''اس کتاب میں مولانا کا سوانحی شعور ترقی پذیر نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی دوسری سوانح عمریوں سے اسے مہمیز کیا جاسکتا ہے۔'' ۱۱۰

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے سوانح مولانا روم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''مولانا روم سے متعلق اب بعض جدید ماخذ سامنے آگئے ہیں جس سے اور بہتر طور پر مولانا روم کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب تک سوانح مولانا روم جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی جاسکی، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ہندوستان سے ایران تک مقبول ومتداول ہے۔ مشہور ایرانی مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے ۱۳۳۲ھ میں اسے فارسی میں ترجمہ کر کے شرکت چاپ رنگین تہران سے شائع کیا اور یہ ایران میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ۔۔۔۔۔ مولانا روم ایک ایسی جاذب اور پر کشش شخصیت کے مالک تھے جو اب تک باقی ہے اور آیندہ

بھی باقی رہے گی ،اس لئے جب بھی مولانا جلال الدین رومی کا مطالعہ
ہوگا،سوانح مولانا روم سے صرف نظر نہ کیا جا سکے گا۔'' ۱۱۱

## سیرۃ النبی:

اردو میں سوانح کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک انتہائی اہم اور ضخیم کتاب علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء) اور سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) کی مشترکہ تصنیف ''سیرۃ النبی'' ہے۔ جو چھ ضخیم جلدوں اور ایک مختصر (ساتویں) پر مشتمل ہے۔اس کی ابتدائی دو جلدیں علامہ شبلی نعمانی نے لکھی ہیں اور باقی پانچ جلدیں ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کے بعد لکھیں۔

سیرۃ النبی کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں (شبلی کی وفات کے کم وبیش چار سال بعد) دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں، تیسری جلد ۱۹۲۴ء میں، چوتھی جلد ۱۹۳۲ء میں، پانچویں جلد ۱۹۳۵ء میں، چھٹی جلد ۱۹۳۸ء میں اور ساتویں جلد طویل وقفہ کے بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔چھٹی اور ساتویں جلد کی طباعت کے درمیان بیالیس سال کا طویل وقفہ حائل ہوا۔اور اس طرح یہ جلد سید سلیمان ندوی کی وفات کے ستائیس برس بعد طبع ہوئی۔

اردو کتب سوانح میں سیرۃ النبی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔اس کے بارے میں منشی محمد امین زبیری کے نام ایک خط میں خود شبلی نعمانی نے یہ لکھا ہے کہ:

''اگر میں مر نہ گیا،اور میری ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاءاللہ دنیا کو
ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک بھی نہیں کی جا
سکے گی۔'' ۱۱۲

بدقسمتی سے موت نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ خود اس کتاب کو مکمل کر سکتے ۔لیکن ابتدائی دو جلدیں انہوں نے جس محنت، دقت نظر،حسن استدلال اور ادبی شان سے لکھیں،اس کی مثال نظر نہیں آتی۔

سید سلیمان ندوی نے شاگردی کا حق خوب ادا کیا،اپنے استاد محترم کی عمر بھر کی محنت کو ضائع ہونے سے بچالیا اور اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے استاد کے عظیم الشان،نامکمل منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''سیرت النبی کے موضوع پر ایک جامع اور ضخیم کتاب لکھنے کا احساس

علامہ شبلی کو اس وقت ہوا جب ۱۹۰۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے سیرت میں ایک کتاب لکھی، کتاب بلاشبہ محنت سے لکھی اور اکثر حوالے کتب احادیث سے دیئے لیکن اس کے باوجود کتاب بڑی زہرناک تھی، انگریزی تعلیم یافتہ اس کے تحقیقی انداز سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔اس تاثر کا اظہار سب سے پہلے ایک ایسے شخص نے کیا جو اس دور میں جدید تعلیم کا سب سے مایہ ناز فرزند گردانا گیا۔یعنی مولانا محمد علی جوہر مرحوم۔'' ۱۱۳

سید سلیمان لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۰۶ء میں بڑودہ میں ایک ملاقات کے دوران ہوئی۔ شبلی کو اس طرف توجہ دلائی اور کہا: آپ سیرت نبوی پر ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا اہتمام کیوں نہیں کرتے جس میں دشمنان اسلام کے،اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملوں کا جواب دیا جائے،اس ملاقات اور سیرۃ النبی کی تالیف کا باقاعدہ اعلان کرنے کے درمیان تقریباً چھ سال کا وقفہ ہے۔علامہ نے جنوری ۱۹۱۲ء میں سیرۃ النبی کی تالیف کے عزم کا اعلان کیا۔

علامہ نے اپنے اس عزم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''دور جدید میں سیرت پر کوئی جامع کتاب لکھنے کے لئے باقاعدہ ایک محکمہ تصنیف و تالیف کی ضرورت تھی جس میں نہ صرف عربی دان بلکہ مغربی زبانیں جاننے والے فضلاء شامل ہوتے، جو عربی مصادر کے ساتھ ساتھ اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں مستشرقین کی کتابوں میں سے ضروری حصے اردو زبان میں منتقل کر سکتے۔جب یہ دشواریاں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں تو جنوری ۱۹۱۲ء میں مولانا نے سیرت النبی کی تالیف کے عزم کا اعلان کر دیا۔یہ اعلان رسالہ ''الندوہ'' میں شائع ہوا اور بعد ازاں ''مقالات شبلی'' کا جزو بنا ہے۔اس میں انہوں نے لکھا ''سیرۃ نبوی کی ضرورت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ قوم میں جدید تعلیم وسعت سے پھیلتی جاتی ہے اور یہی جدید تعلیم یافتہ گروہ ایک دن قوم کی قسمت کا مالک ہوگا۔یہ گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اگر جاننا

چاہتا ہے تو اردو میں کوئی مستند کتاب نہیں ملتی اس لئے اسے چارو ناچار
انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن میں یا تعصب کی
رنگ آمیزیاں ہیں یا ناواقفیت کی وجہ سے ہر موقع پر غلطیاں ہیں
۔۔۔میں ایک مدت سے ان باتوں کا احساس کر رہا تھا لیکن اس بناء پر قلم
اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم
ہے۔۔۔قوم کی طرف سے ایک مدت سے تقاضہ ہے کہ میں سب ان کام
چھوڑ کر سیرت نبوی کی تالیف میں مصروف ہو جاؤں ۔خود میں بھی اپنی
پہلی رائے سے رجوع کر چکا ہوں اور اس شدید ضرورت کو تسلیم کرتا
ہوں۔'' ۱۱۴

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ''علامہ نے سیرت النبی کی تالیف کا آغاز بمبئی میں کیا۔ان کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ۱۳ جون ۱۹۱۲ء سے باقاعدہ کام شروع کیا۔علامہ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء تک مسودہ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بیان تک پہنچ چکا تھا۔اکتوبر ۱۹۱۳ء میں پہلی جلد کا مسودہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔اسی مہینے سید حسین بلگرامی کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے،وہاں سے منشی محمد امین زبیری کے نام خط لکھا،جس میں یہ وضاحت کی کہ:

''کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالات زندگی ہیں،تیار ہو گیا ہے۔
اگرچہ اس میں نہایت کدو کاوش اور تمام کتب حدیث و رجال کی چھان
بین کرنی پڑی ۔تاہم اصلی مرحلے آگے ہیں ۔کتاب پانچ جلدوں میں
ہوگی۔جو حصہ تیار ہے وہ پانچ سو صفحات میں ہے،پوری کتاب کو اس سے
چار گنا کر لیجئے''۔ ۱۱۵

سید سلیمان ندوی کے بقول:

جون ۱۹۱۴ء تک وہ مقدمہ بھی مکمل کر چکے تھے جو فن مغازی و سیر تاریخ اور
اسلامی فن درایت کے اصول پر مشتمل ہے''۔ ۱۱۶

۲۹ اگست ۱۹۱۴ء میں علامہ کے بھائی محمد اسحاق کی وفات نے علامہ کو بالکل ہی نڈھال کر دیا،بیمار تو وہ

پہلے ہی سے تھے۔خود علامہ نے مولانا حمید الدین فراہی کے نام ۱۲اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ایک خط میں بڑی حسرت سے لکھا کہ سیرت کے پورا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی ۔وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی ،مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کو تار دے کر بلایا تاکہ انہیں سیرۃ النبی کا پورا منصوبہ سمجھا سکیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی تار پہنچنے سے پہلے ہی استاد کی خدمت میں حاضر ہو گئے ،اس وقت علامہ شبلی کی حالت بہت بگڑ چکی تھی ،قوت گویائی تقریباً ختم ہو گئی تھی ۔مگر اس حالت میں بھی ان کے دماغ میں صرف ایک ہی سودا تھا اور وہ یہ کہ سیرت مکمل ہو۔استاد اور شاگرد کی یہ ملاقات بڑی رقت آمیز تھی ۔سید سلیمان ندوی اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

> ''میں سرہانے کھڑا تھا ،میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔مولانا شبلی نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا ،اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا پھر زبان سے دوبارہ فرمایا ،اب کیا !اب کیا !لوگوں نے پانی میں جواہر ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا؛ سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو'' ''میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا،ضرور،ضرور۔'' ۱۷

سید سلیمان ندوی نے بستر مرگ پر آخری سانس لیتے ہوئے اپنے استاد سے جو وعدہ کیا تھا ،اسے انتہا درجے کے احساس ذمہ داری کے ساتھ پورا کیا۔مولانا شبلی اپنی امانت جس حالت میں چھوڑ گئے تھے ،سید سلیمان نے اس میں خیانت نہیں کی ۔ہاں اگر کہیں حواشی یا حوالے چھوٹ گئے تھے تو وہ انہوں نے ڈھونڈ کر لکھے ۔جہاں کہیں اضافے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں قوسین کے ذریعے واضح کر دیا کہ کون سی تحریر استاد کی ہے اور کون سی شاگرد کی ۔یہ اضافے سیرت النبی کی پہلی جلد میں کم ہیں اور دوسری جلد میں زیادہ ،اس لئے بقول شیخ محمد اکرام ''دوسری جلد کو صرف مولانا شبلی کی نہیں بلکہ مولانا اور سید سلیمان کی مشترکہ تصنیف ہی سمجھا جا سکتا ہے'' (یادگار شبلی ص ۴۲۸) تاہم اس کا اہم حصہ (سوانحی) مولانا شبلی کے اپنے قلم سے ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے سے سید سلیمان ندوی کو ذہنی طور

پر ''سیرت النبی'' کی تکمیل کے لئے تیار کررہے تھے۔سید صاحب کے نام مولانا کے خطوط سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سیرت کے مختلف اجزاء تحریر کرنے کے لئے ان کی رہنمائی کررہے تھے بلکہ بعض متنازعہ فیہ مسائل پرغوروفکر کرنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی تربیت بھی کررہے تھے۔

سیرۃ النبی کی پہلی جلد میں دو مقدمات ہیں ۔ پہلا مقدمہ فن سوانح نگاری کی ضرورت واہمیت ،آغاز وارتقاء،روایت ودرایت کے اصول اور معروف تصانیف پر روشنی ڈالتا ہے ۔مصنف نے پہلے سوانح کی علمی حیثیت کو واضح کیا ہے۔پھر قدیم اہل علم نے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو سرمایہ مہیا کیا ہے،اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت درج کی ہے۔اس سلسلے میں فن سوانح کی ابتداء کے ذکر کے بعد اس فن کا مغازی اور تاریخ سے تعلق واضح کیا گیا ہے۔پھر چند مشہور سیرت نگاروں (عاصم بن عمر قتادہ انصاری،امام زہری،موسیٰ بن عقبہ،محمد بن اسحاق،ابن ہشام،واقدی اور ابن سعد ) اور مورخوں (امام بخاری،طبری،ابن اثیر،ابن خلدون اور ابوالفدا ) کا تعارف کرانے کے بعد پہلے قدماء کی اور پھر مابعد کی کتب سوانح کا ذکر کیا گیا ہے۔ روایات کی چھان بین کے لئے روایت اور درایت کے محدثانہ اصولوں سے بحث کی گئی ہے جو مصنف کے نزدیک اسلامی فن تاریخ کے بنیادی اصول ہے۔اس کے بعد کتب احادیث اور کتب سیرت کی روایات کے رد وقبول اور پایہ استناد کی بحث کی ہے۔آخر میں مغربی مصنفین کی کتب سیرت پر مختصر تبصرہ اور ان کی غلط بیانیوں کی نشان دہی اور تجزیہ کرکے ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی مغربی مصنف سیرت رسول اللہ صلی علیہ وسلم پر کتاب لکھ ہی نہیں سکتا۔آخری تین صفحات میں اپنی تصنیف کے اصولوں اور اس کے مجموعی منصوبے کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

دوسرے مقدمہ میں عرب کی قدیم سیاسی،معاشرتی،تہذیبی،تمدنی اور مذہبی تاریخ ہے جس میں عرب کی وجہ تسمیہ،اس کا جغرافیہ،قدیم تاریخ کے ماخذ،اقوال اور قبائل،حکومتوں،مذاہب اور رہن سہن کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس مقدمہ میں خانہ کعبہ کی تعمیر اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح ہونے کا تذکرہ بھی ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ علی کی رائے میں:

''پہلے مقدمہ کی سارے اسلامی ادب میں شاید ہی کوئی مثال مل

سکے۔'' ۱۱۸

شاہ معین الدین احمد ندوی کے نزدیک:

''یہ مقدمہ اپنے معلومات ومباحث کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف
کی حیثیت رکھتا ہے۔'' ۱۱۹

اور شیخ محمد اکرام کے خیال میں:

''اس مقدمے کی تمام بحث عالمانہ، مدلل اور بڑے غور وفکر پر مبنی
ہے۔'' ۱۲۰

ان دونوں مقدمات کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے نسب کا تذکرہ ہے۔ پھر قریش میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباواجداد (بالخصوص قصی، ہاشم، عبدالمطلب اور عبداللہ) کا مختصر احوال ہے یہیں سر ولیم میور کے اس اعتراض کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی علیہ وسلم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے نہ تھے۔ ظہور قدسی کے عنوان سے آپ کی ولادت باسعادت کا ذکر جس انداز سے کیا ہے۔ وہ حصہ یقیناً اردو ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ، ولادت، اسم مبارک، رضاعت حلیمہ، سعدیہ کے ہاں پرورش، رضاعی والد، بہن اور بھائی، والدہ کے ہمراہ مدینہ کا سفر، والدہ کی وفات، دادا عبدالمطلب کی کفالت، ان کی وفات پر چچا ابو طالب کی کفالت، سفر شام، حرب، فجار میں شرکت، تعمیر کعبہ، شغل تجارت، تزویج خدیجہؓ، تجارتی سفر، مراسم شرک سے اجتناب، موحدین سے ملاقات اور احباب خاص کا احوال درج ہے۔ اس کے بعد ''آفتاب رسالت کا طلوع'' کے عنوان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و نبوت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی، غار حرا میں عبادات، رویائے صادقہ، پہلی وحی، تبلیغ اسلام، اولین مسلمان، قریش کو دعوت دین اور ان کی طرف سے مخالفت، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، تعذیب مسلمین، ہجرت حبشہ، نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر، واقعہ غرانیق، شعبِ ابی طالب میں محصوری، حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات، سفر طائف، تبلیغ کے لئے مختلف قبائل سے ملاقاتیں، کفار کی ایذا رسائی، یثرب میں اسلام کی داغ بیل، بیعت عقبیٰ اولیٰ اور بیعت عقبیٰ ثانی، بارہ نقیبوں کا تقرر، ہجرت نبوی، مدینہ میں آمد،

مسجد نبوی اوراز واج مطہرات کے حجروں کی تعمیر،اذان کی ابتداء سلسلہ مواخاۃ، مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ وغیرہ کے تاریخی حالات سلسلہ وار درج ہیں ۔اس کے بعد تحویل کعبہ کی وجوہات اورغزوہ بدر کے تفصیلی حالات، پھر غزوہ سویق ،غزوہ احد اور دیگر غزوہ وسرایا کا احوال درج ہے ۔اسی دوران یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اوران سے جنگوں کا تفصیلی ذکر ہے ۔اس کے بعد سن وار غزوۃ مریسیع ،واقعہ افک اور غزوہ احزاب کا بیان ہے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینبؓ کا نکاح ،صلح حدیبیہ، بیعت رضوان ،مختلف سلاطین کو دعوت اسلام ،خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبول اسلام ، فتح خیبر ،ادائے عمرہ ،غذوہ موتہ، فتح مکہ ،غزوہ حنین ،محاصرہ طائف ،واقعہ ایلا ،غذوہ تبوک اور حج اکبر کا ذکر نے کے بعد سلسلہ،غزوات پر دوبارہ نظر ڈالی گئی ہے اور تفصیل کے ساتھ اسلام کے اصول جنگ پر بحث کی گئی ہے ۔اس جلد میں صحیح واقعات کے اندراج کے ساتھ مغربی اور مشرقی مصنفین کی غلط بیانیوں کی تردید بھی کی گئی ہے ۔

''سیرۃ النبی'' کی دوسری جلد ۴۴۰ صفحات نبوت کی تین سالہ پرامن زندگی کی تاریخ ہے، یعنی اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بقیہ تین سالہ زندگی کے واقعات ہیں ۔ ابتداء میں قیام امن اور اشاعت اسلام کی کوششوں کا تذکرہ ہے ۔ پھر وفود عرب کی آمد اور قبول اسلام ، مدینہ میں تاسیس حکومت الہٰی ، مذہبی ،تعلیمی و تبلیغی انتظامات ،شریعت کی تاسیس و تکمیل ،اسلامی عقائد وعبادات و معاملات ( نکاح و طلاق ،حدود و تغیرات ، وراثت، حلال وحرام وغیرہ ) حجتہ الوداع ،خطبتہ الوداع ، وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ،تجہیز و تکفین ،ترکہ نبوت ، شمائل و معمولات ،حلیہ اقدس ،مہر نبوت ، گفتگو ، لباس ،غذا ،طریقہ طعام ،مزاج وطبیعت ،معمولات خواب و بیداری ،عبادات ،معمولات خطبہ وسفر و جہاد وعیادت و ملاقات ،مجالس نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ،خطبات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ،عبادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ،اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ،عزم واستقلال ،حسن خلق ،حسن معاملہ ،عدل وانصاف ، وجود وسخا ،ایثار و بے نفسی ،مہمان نوازی ، گداگری اور سوال سے نفرت ،صدقہ سے پرہیز ،قبول تحائف وہدایا ،عدم قبول احسان ،عدم تشدد ،رہبانیت سے اجتناب ،عیب جوئی اور مداحی کی مذمت ، سادگی و بے تکلفی ،امارت پسندی سے گریز ،مساوات ،شرم وحیا ،اپنے ہاتھ سے کام کرنا ،دوسروں کے کام آنا ، شجاعت ،راست گفتاری ،زہد وقناعت ،عفو وحلم ،دشمنوں سے حسن سلوک ، کفار اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ برتاؤ ،غریبوں ،غلاموں ،عورتوں اور بچوں کے ساتھ شفقت ومہر ومحبت کا سلوک ،حیوانات پر رحم ،رقیق القلبی

غم خواری، لطف طبع اور اولاد سے محبت وغیرہ، ازواج مطہرات (حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ، ام المساکین، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش، حضرت جویریہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت صفیہؓ ) کے حالات، شکل وشباہت، اخلاق وعادات، دینی خدمات اور وفات، اولاد (حضرت قاسمؓ، حضرت ابراہیمؓ ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہ الزہرہؓ ) کے احوال اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن معاشرت وحسن سلوک کا زندہ جاوید نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

> ''ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں یا میدان جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اس طرح پیش کیا ہے کہ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ صداقت اور اخلاق عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' [121]

اس جلد میں سید سلیمان ندوی نے خاصے اضافے کیے ہیں اور (جلد دوم کے ) دیباچے میں ان کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی، لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار مدت کے حیض بیض کے بعد میں نے طے کر لیا کہ ان کو لکھنا ہی چاہیے۔ چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی۔ اس کا عنوان ''یادداشتِ اخیر'' تھا۔ اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا

> تھا، مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا، جس کو فرشتہ غیب نے ان کے دست وقلم سے میری تسلی کے لیے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔۔۔اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا۔ بہت سے عنوانات سادہ تھے، بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آئندہ اضافہ کے لیے نا تمام بصورتِ بیاض چھوڑ دیا تھا۔ جامع نے ان کو لکھ کر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا۔ بہت سے ضروری حواشی بھی جا بجا بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے، اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں تا کہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلف نہ ہونے پائیں۔'' ۱۲۲

جلد دوم میں سید سلیمان ندوی نے اصل متن میں جو اضافے کیے ہیں، وہ کتاب میں ''قیام امن''، ''تبلیغ اسلام''، ''تاسیس حکومت الٰہی'' کے عنوانات کے تحت شامل ہیں، علاوہ ازیں مذہبی انتظامات، تکمیلِ شریعت، عقائد، عبادات، معاملات اور حلال وحرام کے مباحث میں بھی سید صاحب نے معتدبہ اضافے کیے ہیں۔ سال آخر (۱۱ھ) سال وفات، متروکات اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ میں سید صاحب نے کسی خاص اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن خطابتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عبادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابواب مکمل طور پر اور معمولات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مجالس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابواب کافی حد تک سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ ہیں۔ اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل باب میں استاد وشاگرد، دونوں کا اشتراک ہے۔ البتہ آخری تینوں ابواب یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج واولاد میں شاگرد نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

سیرت النبی'' کی تیسری جلد ۸۸۸ صفحات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب، نبوت، حقیقت نبوت اور فضائل ودلائل نبوت پر مشتمل ہے۔ شاہ معین الدین احمد کی رائے میں:

> ''جہاں تک خالص سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، وہ ان دونوں حصوں پہلی دو جلدوں پر ختم ہو جاتی ہے مگر اس سیرت کی تالیف کا

مقصد محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا، اس لیے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں۔ان میں سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے۔اگر چہ معجزات اور خوارق عادات تمام مذاہب میں مشترکہ ہیں مگر عقل پرستوں کی عقل کی کسوٹی پرسب سے زیادہ وہی باہر ہیں، اس لیے تیسری جلد خاص دلائل و معجزات پر ہے''۔ ۱۲۳؎

کتاب کی ابتداء میں نفسِ معجزہ کی حقیقت، قرآن مجید، فلسفہ قدیم و جدید اور علمِ کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکانِ وقوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی معجزہ کوئی خلاف عقل چیز نہیں ہے۔اس جلد کے عنوانات یہ ہیں۔

دلائل معجزات کی حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفہ قدیمہ و علم کلام، دلائل و معجزات فلسفہ جدیدہ، شہادت، معجزات، یقین معجزات، غائب معجزات آیات و دلائل اور قرآن مجید، آیات و دلائل نبوی کی تفصیل، نزول ملائکہ، عالم رویا، مشاہدات و مسموعات عالم بیداری (اسرایا معراج)، قرآن مجید اور معراج (معراج کے اسرار، اعلانات، احکام، بشارات اور انعامات)، شق صدر یا شرح صدر، آیات و دلائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قران مجید میں، معجزہ قرآن، دیگر آیات و دلائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید میں، آیات و دلائل نبویہ بروایات صحیحہ (علامات نبوت قبل بعثت، اشیاء پر اثر، شفائے امراض، استجابات دعا، اشیاء میں اضافہ، پانی جاری ہونا، اخبار غیب یا پیشن گوئی) معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غیر مستند روایات، مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت، بشارات، خصائص محمدی صلی اللہ علیہ وسلم، خصائص ذاتی اور خصائص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مصنف کے نزدیک معجزہ اس خارق عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لئے صادر ہو'' ۱۲۴؎

مصنف نے امام رازی، امام ابن تیمیہ، مولانا روم اور امام غزالی کے دلائل نقل کر کے معجزات کی

حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔''دلائل ومعجزات اور عقلیات جدیدہ'' والا باب مولانا عبدالباری کے ندوی کا لکھا ہوا ہے اوراس میں معجزہ کے بارے میں عقلائے مغرب کے خیالات پیش کیے گئے ہیں اور جدید تحقیقات کی روشنی میں نتائج نکالے گئے ہیں ۔اس بارے میں مولانا عبدالباری ندوی نے امکان معجزات ،شہادت معجزات، یقین معجزات اور غایت معجزات کے عنوانات قائم کر کے بحث کی ہے۔امکان معجزات کے ضمن میں ہیوم کی کتاب ''فہم انسانی'' کے باب معجزات کے دلائل سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے اور جابجا جان اسٹورٹ مل کی ''نظام منطق'' اور پروفیسر ہک سلے کی ''ہیوم'' Human Understanding باب معجزات کے حوالے دینے کے بعد، سائنس کے جدید انکشافات کی مدد سے معجزات کے امکانات پر بحث کی گئی ہے۔شہادات معجزات اور باقی عنوانات پر بحث کے دوران بھی مشہور مغربی فلسفیوں کی کتابوں کے حوالے دے کر معجزات کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔اگلے باب میں ،قرآن مجید میں موجود ان آیات ومعجزات کا تذکرہ کیا ہے جو انبیاء کے حالات کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں اور مصنف بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے نسبتاً زیادہ اور حضرت نوح علیہ السلام ،حضرت لوط علیہ السلام ،صالح علیہ السلام ،ہود علیہ السلام ،شعیب، زکریا،اور یونس کے نسبتاً کم معجزات کا قرآن میں ذکر آیا ہے۔اسی باب میں قرآن مجید اور نبوت کی ظاہری اور باطنی علامات پرمبنی بحث کی گئی ہے،معجزات کی اقسام بھی گنوائی گئی ہیں اور ان کے بارے میں مومنوں اور کافروں کے ردعمل سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات پر گفتگو کی گئی ہے بالخصوص معجزہ شق القمر اور غزوہ بدر میں قریش کی ہلاکت کی پیشن گوئی پھر سحر اور معجزہ میں فرق بتایا گیا ہے اور آخر میں ہدایت کی صداقت کی نشاندہی ٹھہرایا گیا ہے۔اگلے باب میں آیات ودلائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بحث ہے۔مصنف نے خصائص النبوۃ اور معجزات میں تمیز کی ہے۔اس کے نزدیک خصائص النبوۃ وہ فوق البشری واقعات ہیں جو کم وبیش ہر پیغمبر سے اس کے حالات زمانہ کے مطابق مختلف صورتوں میں صادر ہوئے۔اس باب میں مصنف نے خصائص النبوۃ ،آیات ودلائل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے،صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت شدہ آیات ودلائل ،غیر مستند روایتیں اور ان پر تنقید، کتب سابقہ کی بشارتیں اور خصائص محمدی صلی اللہ علی وسلم جیسے ذیلی عنوانات قائم کر کے بھرپور بحث کی ہے۔خصائص النبوۃ میں مکالمہ الٰہی ،نزول ملائکہ، وحی اور اس کی مختلف شکلوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور پھر معاجِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر طویل بحث

ہے،جس میں قرآن واحادیث، واقعہ معراج،اس کے اسرار،اعلانات،احکام، بشارتوں اورانعامات کا تذکرہ ہے۔پھرشقِ صدر یا شرح صدر کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پھر واضح کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے اور بعدازاں قرآن مجید میں موجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل ومعجزات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔قرآن مجید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرار دے کر اس کے حق میں دلائل دیئے گئے ہیں۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امی نبی ہونے ،ذات خداوندی کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ ہونے ،جنوں کے ایمان لانے ،چاند کے دوٹکڑے ہونے اور روم کے ایران پر غالب آنے کی پیشن گوئیوں کا ذکر ہے۔قرآن مجید میں موجود دیگر آیات ودلائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں طیراً ابابیل کی نشانی،شہاب ثاقب کی کثرت،شرح صدر،مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر،قریش پر قحط سالی کا عذاب،ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر معجزانہ نشانیاں،غزوہ بدر میں فرشتوں کی آمد اور میدان جنگ میں پانی کا برسنا اور دیگر غزوات میں امداد الٰہی کی مثالیں دی گئی ہیں۔اس کے بعد احادیث کی صحیح روایات میں سے آیات ودلائل نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم تلاش کیے گئے ہیں۔چنانچہ ایک ایک کر کے وہ تمام معجزات درج کئے گئے ہیں، جو مستند کتب احادیث میں درج ہیں۔مثلاً ستون کا رونا، منبر کا ہلنا، چٹان کا پارہ پارہ ہونا، پہاڑ کا ہلنا،اشارے سے بتوں کا گرنا، درختوں کا چلنا، بے دودھ کی بکری کا دودھ دینا، شفائے امراض (آشوب چشم کا دور ہونا،ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہونا،تلوار کے زخم کا اچھا ہونا، نابینا کا بینا ہونا، گونگے کا بولنا، بیمار کا تندرست ہونا،استجابتِ چشم کا دور ہونا،ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہونا،تلوار کے زخم کا اچھا ہونا، نابینا کا بینا ہونا، گونگے کا بولنا، بیمار کا تندرست ہونا،استجابتِ دعا،(قریش پر عذاب آنے اور دور ہونے کی دعا،روسائے قریش کے حق میں بددعا،حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کی دعا،سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھسنے کی دعا، مدینہ کی آب وہوا کی درستی کی دعا،خشک سالی میں پانی برسنے کی دعا اور صحابہ کرام کے حق میں دعا وغیرہ۔اشیاء میں اضافہ (تھوڑے کھانے کا زیادہ ہونا،انگلیوں سے پانی جاری ہونا،غیبی اطلاعات،اہل کتاب کے سوالوں کے جوابات،آنے والے واقعات کی پیشن گوئیاں کرنا وغیرہ۔اس کے بعد معجزات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غیر مستند روایات کی نشان دہی کی گئی ہے، جو کتب دلائل میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔پھر وہ بشارات درج کی گئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات،انجیل

اور دیگر آسمانی صحائف میں موجود ہیں اور ان کی تصدیق کے لیے قرآن مجید کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ آخر میں خصائص محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق ہیں۔ اس جلد میں مندرجہ بالا موضوعات پر اتنی عالمانہ اور جامع بحث کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا۔ بعض موضوعات پر، جو دقیق تھے مصنف نے مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی عبدالباری ندوی کی مدد بھی لی ہے۔

''سیرت النبی'' کی چوتھی جلد ۸۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام کے بنیادی عقائد یعنی نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا اور جنت و دوزخ پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازمات و خصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی و روحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دشواریاں حائل تھی اور بالآخر اسلام نے جو انقلاب برپا کیا، اس کی شرح و بسط کے ساتھ تفصیل کی گئی ہے۔

سید سلیمان ندوی اس جلد کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''کہ مولانا شبلی نے اس جلد کا کام اپنی زندگی میں شروع کیا تھا اور عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات پر پچیس تیس صفحات بھی لکھ لیے تھے لیکن ان کی بے وقت موت سے یہ کام ادھورا رہ گیا'' (سیرت النبی جلد چہارم دیباچہ)۔ سید صاحب نے اپنے استاد کے مسودے میں کثرت سے اضافہ و ترمیم کر کے اسے ایک نیا رنگ عطا کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت چار ستونوں پر قائم ہے۔ (۱) عقائد (۲)، عبادات، (۳) اخلاق، (۴) معاملات۔ عقائد کا بیان اتنا پھیل گیا کہ باقی تینوں موضوعات کے لیے الگ جلدیں وقف کرنا پڑیں۔ چوتھی جلد اب صرف اسلام کے بنیادی عقائد کے لیے وقف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، رسولوں پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتب الٰہی پر ایمان اور آخرت کی زندگی پر ایمان۔ آخرت کی زندگی کے ضمن میں برزخ اور قیامت، جزا اور سزا، جنت اور دوزخ اور قضا و قدر کی بحث ہے اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی کہتے ہیں کہ:

''ان تمام نازک اور دقیق مسائل کو جن کا محض عقل و مادی حواس کے
ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا
ہے کہ قلب کی تشفی کے لیے بالکل کافی ہے۔'' ۱۲۵

''سیرت النبی'' کی پانچویں جلد ۴۵۶ صفحات ''عبادات'' کے موضوع پر ہے۔اس میں سب سے پہلے اعمال صالحہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اس کی تین اقسام (عبادات، اخلاق اور معاملات) میں سے اہم ترین نیک عمل، عبادت کی تشریح کی گئی ہے۔مصنف نے اسلامی عبادت کا موازنہ دوسری اقوام و ملل اور مذاہب کی عبادات سے کر کے اس کی خصوصیات گنوائی ہیں۔پھر جسمانی عبادات میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی فضیلتوں، حکمتوں اور مصلحتوں کا بیان ہے۔نماز اسلامی عبادات میں پہلا رکن ہے اور یہ وہ عبادت ہے جو کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔نماز کی حقیقت، روحانی غرض و غایت اور آداب و شرائط بیان کرنے کے بعد ان حکمتوں کی وضاحت کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے دین کے اس ستون میں پوشیدہ رکھی ہیں۔مصنف نے بتایا ہے کہ نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے۔پھر نماز کے اخلاق، صفائی، پابندی وقت، صبح خیزی، خوف خدا، ہوشیاری و بیداری، مرکزی اطاعت اور مساوات وغیرہ سرفہرست ہیں۔اسی طرح دیگر عبادات یعنی زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کے مباحث ہیں، جن کی حقیقت، گذشتہ تاریخ، اہمیت، آغاز وارتقاء و تکمیل وغیرہ کے بارے میں بڑی حکیمانہ باتیں بیان ہوئی ہیں۔جسمانی عبادات کے بعد قلبی عبادات کی بحث ہے جو مصنف کے نزدیک اول الذکر کی روح کا درجہ رکھتی ہے۔قلبی عبادت کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیات سے ہے اور ان میں تقوی، اخلاص، توکل اور صبر و شکر کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ان فرائض میں تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غرض و غایت ہے جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔پھر اخلاص کی باری آتی ہے جس کے معنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے۔اس کے بعد توکل کا درجہ ہے جو مومنوں کی کامیابی کا ایک اہم ہتھیار ہے۔پھر صبر ہے جس کے معنی اپنے نفس کو اضطراب سے روکنا اور اپنی جگہ پر ثابت قدم رہنا ہے۔بعد ازاں شکر ہے یعنی دل میں قدر شناسی کا جذبہ، جو اسلام کے نزدیک ایک اعلیٰ صفت ہے۔ان سب کی ایسی دلنشین اور مؤثر تشریح کی گئی ہے کہ اسلامی عبادات، تطہیر قلب اور تزکیہ نفس کا بہترین وسیلہ بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے، جو

عبادات کے باب میں ہیں اور جن پر عمل کر کے بندہ اپنے آقا سے تعلق جوڑ سکتا ہے۔

''سیرت النبی'' کی چھٹی جلد ۸۲۴ صفحات کا موضوع ''اخلاق'' ہے یعنی یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل وتشریح ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کو سکھائی گئیں۔ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت حاصل ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اسے اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں، چناچہ اخلاق کی صحیح اہمیت واضح کرنے کے لیے اس کے ہر پہلو پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے خیال میں ملت کی تعمیر کا اہم جزو اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔ حقیقت میں سارا نظام کائنات اور سارا شرف انسانی اخلاق کے گرد گھومتا ہے اسی لیے دنیا کے تمام مذاہب نے اخلاق کو نمایاں اہمیت دی ہے۔ اخلاق کا تعلق حقوق العباد سے ہونے کی وجہ سے اس کا درجہ حقوق اللہ سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسلام اخلاق حسنہ کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور وہ اللہ کے فرائض پر انسانوں کے باہمی تعلقات ومعاملات کو فوقیت دیتا ہے تا کہ وہ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی بنیں۔ اسلام کے ارکان پنجگانہ کا بھی اخلاق سے گہرا تعلق ہے اور ان کا حقیقی مقصد بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اس لحاظ سے ''سیرت النبی'' کی یہ جلد بے حد اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں فلسفہ اخلاق پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ پہلے اسلامی اخلاق کے امتیازی اوصاف گنوائے گئے ہیں، پھر دنیا بھر کے اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز واضح کیا گیا ہے اور اس کے بعد اسلام کے اخلاقی نظام کا موازنہ دیگر مذاہب مثلاً یہودیت اور عیسائیت کے نظام اخلاق سے کر کے ان کی کمزوریوں اور اسلام کی خوبیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اخلاق کی نمایاں خصوصیات، بے غرضی، حسن نیت، رضائے الٰہی، اعتدال، عدل واحسان، عفو ودرگزر اور برائی کے بدلے میں نیکی کرنا وغیرہ بتائی گئی ہیں جن کے بعد تعلیم اخلاق کے اسالیب، اخلاق تعلیمات کی اقسام، حقوق وفرائض، فضائل اخلاق اور رذائل اخلاق کے مباحث ہیں۔ حقوق وفرائض کے ضمن میں اسلام کی طرف سے والدین، اولاد، ازواج، اہل قرابت، ہمسایوں، یتیموں، بیواؤں، حاجت مندوں، بیماروں، غلاموں، مہمانوں، عام مسلمانوں حتیٰ کہ جانوروں تک کے حقوق واضح کیے گئے ہیں۔ فضائل اخلاق میں صدق، سخاوت، عفت وپاکبازی، امانت ودیانت، شرم وحیا، رحم، عدل وانصاف، احسان، عفو ودرگزر، حلم وبردباری، تواضع وخاکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال ومیانہ روی، خودداری وعزت

نفس،شجاعت ودلیری،استقامت،حق گوئی اوراستغناوغیرہ اوررذائل اخلاق میں جھوٹ،وعدہ خلافی خیانت، دغابازی،غداری،چغل خوری،بہتان طرازی،غیبت،بدگمانی،خوشامد،بخل،حرص وطمع،چوری،بے ایمانی، رشوت،سودخوری،شراب نوشی،بغض وکینہ،ظلم وتشدد،ریا،فخر وغرور،خود بینی وخودنمائی،فضول خرچی،حسداورفحش گوئی شامل ہیں۔ان سب پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔آخر میں اسلامی آداب معاشرت کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں طہارات کے آداب،کھانے پینے کے آداب،مجلس کے آداب،ملاقات کے آداب،گفتگو کے آداب، باہر نکلنےاور چلنے پھرنے کے آداب،سفر کے آداب،سونے جاگنے کے آداب،لباس کے آداب،،خوشی اورغمی کے آداب اور بچے کچے باقی سب آداب شامل ہیں۔سیدسلیمان ندوی کہتے ہیں کہ:

''اسلام دین فطرت ہے،اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے۔'' ۱۲۶

اخلاق وآداب کا یہ سارا سلسلہ اس صداقت کی گواہی دیتا ہے کہ اسلام نے تہذیب وشائستگی کی اعلیٰ اقدار کی پاسداری کی ہے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی سعی کی ہے جو بلند ترین اخلاقی اوصاف کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

اس جلد میں کہیں کہیں فقہی مسائل بھی درآئے ہیں مگر چونکہ کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو تھا،اس لیےان کی جزئیات اورتفصیلات میں الجھنے سے گریز کیا گیا ہے۔سیدسلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''فضائل ورزائل کے آداب کے بعض موضوعات مولانا عبدالسلام کے لکھے ہوئے ہیں،جنہیں مصنف نے گھٹا بڑھا کر شامل کتاب کرلیا ہے۔''

۱۲۷

''سیرت النبی'' کی چھٹی جلد کی اشاعت کے بعد سیدسلیمان ندوی نے ساتویں جلد کی تیاری شروع کی،جس کا انہوں نے''معارف'' کے۱۹۴۰ء کے ایک شمارے میں درج ذیل لفظوں میں اعلان کیا:

''چھٹی جلد کے بعد ساتویں جلد کا مرحلہ ہے اور سب کومعلوم ہے کہ اس جلد کا موضوع ''معاملات'' ہوگا۔معاملات سے مقصود اسلام کے وہ مسائل ہیں جن کی حیثیت قانون کی سی ہے۔ان میں سب سے پہلی چیز خودسلطنت اور آداب سلطنت ہیں۔پھر اسلام کے ہر قسم کے قوانین،

معاشرتی ،تمدنی ،اجتماعی ،اقتصادی کی تشریح کا کام ہے ۔یہ ہمارے
مباحث کا نیا راستہ ہوگا اوراسی لئے اس کو طے کرنے کی مشکلیں بھی نظر
کے سامنے ہیں۔'' ۱۲۸

بہرکیف ''سیرت النبی'' جلد ہفتم کے نام سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا اوراس کی اشاعت کا شرف بھی دارالمصنفین کے موجودہ ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو حاصل ہوا جیسا کہ سید ابوالحسن علی ندوی نے اس جلد کے پیش لفظ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

'' عرصہ سے ''سیرت النبی'' کے مے خانے کے میخوار اور سید صاحب
(سلیمان) کی تحریرات وتحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ
معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق
مضامین ومباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات
میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورطبع سے آراستہ ہوجاتے
تو ان کو پڑھ کر ''سیرت النبی'' کی چھ جلدوں کے قارئین وعشاق اپنی
پیاس بجھاتے اوراپنے قلب ونظر کو روشن کرتے ۔خدا کا شکر کہ جناب
سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں
کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا اور انہوں نے ان
مضامین کو یکجا کر کے ''سیرت النبی'' جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں
جمع کردیا۔ یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلے میں )ضخامت میں
بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی
ہے اوراس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے ،وسیع مطالعے کا
نچوڑ اورفکر ونظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں
نہیں ملیں گے۔'' ۱۲۹

بہرکیف ''سیرت النبی'' جلد ہفتم ۲۱۴ صفحات ''معاملات'' سے متعلق ہے۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں،جن کا تعلق ان تمام

حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے۔ جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔ آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے لیکن ہمارے قدیم فقہا نے اس کے لیے ''سیر'' کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد۔ اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے جیسے الاحکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور الاحکام السلطانیہ قاضی ابویعلیٰ حنبلی المتوفی ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ وخراج وزکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں اور اسی لیے بعض بزرگوں ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلام المتوفی ۲۳۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحث کتبِ عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دئے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضروری اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔'' ۱۳۰؎

دور حاضر میں ان مسائل و معاملات کے لیے نئی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، چنانچہ سید سلیمان ندوی نے بھی موجودہ جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں ردوبدل کر کے انہیں نئے عنوانات کے تحت موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اب ہماری نئی اصطلاح میں ''معاملات'' سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیریوں کی

جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی
کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زائد
افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہواوران کے ضابطوں
اور قانونوں کی تفصیل ہو۔ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے
ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین
قسمیں ہوسکتی ہیں۔معاشریات،اقتصادیات،اور سیاسیات اوران تینوں
کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اورانہی تینوں مباحث
کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے۔معاشریات میں نکاح وطلاق
وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگئی۔اقتصادیات میں تمام مالی وتجارتی
کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اوراس کے
متعلقات مذکور ہوں گے۔'' ۱۳۱

اگر چہ ان احکام کی اساس قرآن مجید، کتب احادیث اور کتب فقہ میں موجود ہے، لیکن ان کو جمع کرنا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے دور کے مسائل کی تشریح اس رنگ میں کی جائے کہ مذاق حال تسکین پاسکے اوران مسائل کا حل سابقہ نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ:

''ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی
راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس
لیے کہ سیاسیات واقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور
ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں اور
ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کرلے جانا بہت ہی مشکل نظر
آتا ہے۔مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ
صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں
امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا
کرنا، ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔یہی سبب ہے کہ اس جلد کے

لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہاسال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا
قدم آگے کو بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹالینا پڑا۔'' ۱۳۲

''سیرت النبی''، جلد ہفتم اگر چہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس میں تمام اصولی مسائل سمٹ آئے ہیں۔ سید صاحب نے ''معاملات'' کی تعریف، اقسام اور تاریخ بیان کرنے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے ''میزان'' کی جو جامع تعریف کی ہے، وہ ان کی قرآن فہمی پر دال ہے اور ان کا یہ کہنا کہ:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی
سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ
ہے۔'' ۱۳۳

ان کے فکری توازن کا پتا دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دین اور سیاست کو الگ الگ تصور نہیں کرتے۔ اس کتاب میں اسلام ''اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت''، ''عہد نبوی میں نظام حکومت''، ''سلطنت اور دین کا تعلق''، ''امت مسلمہ کی بعثت''، ''قوت عاملہ یا قوت آمرہ'' اور ''حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے'' کے عنوانات کے تحت اسلام کے سیاسی نظام کے اصول ومبادی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ جب تک زمین پر قانون الٰہی یعنی شریعت کو نافذ نہیں کیا جائے گا، انسانیت کو عدل و انصاف میسر نہیں آئے گا۔ قرآن نے اسے ''میزان'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ:

''میزان سے مقصود کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں بلکہ فطرت اور عدل
وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات تل رہا ہے اور
سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات
میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان
میں اونچ نیچ نہ آئے۔'' ۱۳۴

سید صاحب نے واضح کیا ہے کہ:

''اسلام کے قانون میں جتنے حدود وتعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے
فتنہ وفساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات ومعاشرت کے اصول اور
مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل وانصاف اور امن و

اطمینان کا قیام ہے،اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں ،اب سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع وفریب کا استیصال ہے۔'' ۱۳۵؎

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد میاں صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سید سلیمان ندوی نے اسلام کے عقائد اور تعلیمات کو جتنی وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے اردو زبان میں اب تک کوئی نہ کر سکا۔تحریر کی روانی اور دل کشی کے ساتھ انہوں نے تحقیق کے تقاضوں کو بھی کسی مرحلے پر نظر انداز نہیں کیا ۔'' ۱۳۶؎

''سیرت النبی'' کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے،اگر ان سب کے حوالے جمع کیے جائیں تو بذات خود ایک چھوٹی سی کتاب بن سکتی ہے،اس لیے کہ مصنفین شبلی اور سید سلیمان ندوی نے امکانی حد تک کوئی اہم کتاب نہیں چھوڑی۔سیرت النبی کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہے ۔قرآن مجید ،بخاری شریف ،مسلم شریف ،ترمذی ،ابوداؤد ،ابن ماجہ ،صحاح ستہ ،مؤطاامام مالک،عمدۃ القاری،فتح الباری،شرح مسلم،مختصر سنن ابو داؤد ،مستدرک حاکم ،مسند امام احمد بن حنبل ، مسند دارمی، سیرت ابن ہشام ،شرح مواہب ، کتاب الشمائل ،سیرت گازورنی ،خصائص الکبریٰ ،تاریخ طبری، تاریخ کامل ،تاریخ مکہ (ازدقی ) سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ڈاکٹر اسپرنگر )،لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم (ولیم میور )،اسلام پر چند خیالات ،لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مارگولیوتھ )،تاریخ جغرافیہ عرب،تمدن عرب ، بائیبل ،ڈکشنری آف بائیبل وغیرہ وغیرہ۔ان کتابوں کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا شبلی اور ان کے بعد سلیمان ندوی نے''سیرت النبی'' لکھنے کے لیے کتنی عرق ریزی کی ہے۔یہ کام ایک دو افراد کا نہیں بلکہ پورے ادارے کا تھا،لیکن اس خیال سے کہ نہ جانے کوئی اور شخص اس کام کے لیے آگے بڑھے یا نہ بڑھے،مولانا شبلی نے خود اس کا بیڑا اٹھا لیا۔انہیں اپنے موضوع کی وسعت وہمہ گیری اور کام کی نزاکت واحتیاط کا بخوبی احساس تھا اور انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ان سے پہلے کسی اور سوانح نگار نے اتنے بڑے پلان کے مطابق کام نہیں کیا تھا،اسی لیے انہوں نے پوری تیاری کر کے اس مبارک کام کی ابتداء کی ۔مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کو ایک خط میں اپنے سوانح پلان سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت النبی میں آ جائیں ،یعنی تمام مہمات، پر ریویو ،قرآن مجید پر پوری نظر،غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں گا۔'' ۱۳۷؎

عربی کتابوں کے علاوہ ان کے سامنے یورپین تصانیف کا دفتر تھا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں شرمناک الزامات کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ کتابیں انگریزی ،فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں لکھی گئی تھیں اور شبلی ان میں کسی بھی زبان پر قادر نہ تھے،اس لیے ان کی مشکلات چند در چند تھیں ،مگر وہ اس سے گھبرائے نہیں ۔انہوں نے مغربی زبان دانوں کی مدد سے اس سارے مواد تک رسائی حاصل کی جو ان کی تصنیف کے لیے ضروری تھا۔ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو زیر تصنیف ہے ،میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے،اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے ،تا کہ ان کے تائیدی بیان ،حسب موقع ، حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطیاں اور بد دیانتیاں کی ہیں ،نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی بردہ دری کی جائے۔'' ۱۳۸؎

مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی نے ''سیرت النبی'' کی تالیف کے وقت سیرت کے واقعات کے متعلق قرآن مجید کے بیانات کو باقی روایات پر مقدم رکھا ہے، کیوں کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔قرآن مجید کے بعد انہوں نے مستند کتب احادیث میں سے سیرت کی روایات صحیحہ تلاش کی ہیں اور ان کے مقابلے میں کتب سیر وتاریخ کی روایات کو ثانوی حیثیت دی ہے ۔ان کے خیال میں جو واقعات بخاری ومسلم وغیرہ میں موجود ہیں،ان کے مقابلے میں سیرت وتاریخ کی روایات کی کوئی ضرورت نہیں ۔وہ کہتے ہیں کہ:

> ''ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہو ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈ تے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے ان کو درج ہونا چاہئے اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایات نہیں ملتی تو وہ کم

درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت
تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آ جاتے ہیں، اس لیے اگر عام
استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ
کی روایتیں مل جاتی ہیں۔'' ۱۳۹

مولانا شبلی کی کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اکثر تفصیلی واقعات حدیث کی ثقہ کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپین سیرت نگاروں کے افکار باطلہ کی تردید بھی کی ہے۔ یہ مصنف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، خاندان، مذہب، اخلاق اور کردار کے بارے میں جو جو شبہات پیدا کرتے ہیں، مولانا شبلی نعمانی نے انہیں صحیح روایات کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیگر الزامات کے علاوہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت ازدواج، عورتوں سے غیر معمولی رغبت، مذہب کی جبری اشاعت،، غلام بنانے کی اجازت اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے دنیاداروں کی سی حکمت عملی اختیار کرنے کی تہمتیں لگاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول سے زیادہ بادشاہ بنا کر پیش کرتے ہیں، جن کا خاصہ لشکر کشی، قتل، انتقام اور خون ریزی تھا۔ مولانا شبلی نے ان سب کا الزامات کی قلعی کھولی ہے اور ان مستشرقین کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا حقیقی روپ دکھایا ہے۔ مثلاً عورتوں سے رغبت اور کثرت ازدواج کے الزامات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۵۳ برس تک حضرت خدیجہؓ کے سوا، جو
شادی کے دن ۴۰ برس کی تھیں۔ کسی سے شادی نہیں کی۔ یہ شباب کا نہیں
بلکہ انحطاط کا زمانہ ہے، اس لیے اگر مقصود ہوائے نفس ہوتی تو اس زمانے
میں شادیاں کی ہوتیں۔ جو شادیاں کیں، اکثر پولیٹیکل تھیں، یعنی ان کے
ذریعے بڑے بڑے عرب قبائل میں اتحاد پیدا ہوا اور ان میں اسلام
پھیلا۔'' ۱۴۰

اسی طرح سر ولیم میور کے اس اعتراض کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت اسماعیل کے خاندان میں سے نہ تھے، یا مارگولیوتھ کی اس کوشش کی کہ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان متبذل ثابت کیا جائے اور ان کے دادا عبدالمطلب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لاپروا ظاہر کیا جائے یا مارگولیوتھ کی اس غلط

بیانی کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھایا اس کے اس جھوٹ کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے ،اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا،لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا،مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا،اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔

اس طرح کی خرافات اور غلط بیانیوں کے باوجود اگر کسی یورپین مورخ یا سیرت نگار نے کوئی بات صحیح لکھی ہے تو شبلی اور سید سلیمان ندوی نے اس کی تائید بھی کی ہے اور اگر کوئی قرین قیاس واقعہ بیان کیا ہے تو اسے نقل بھی کیا ہے۔مثلاً ''سیرت النبی'' جلد اول میں بعثت سے پہلے غار حرا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی،غور وفکر اور عبادت وریاضت کے بارے میں انہوں نے کارلائل کی ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' کا یہ اقتباس درج کیا ہے، جو تمام تر قیاس پر مبنی ہونے کے باوجود حقیقت سے بعید نہیں ہے:

> ''سفر وحضر میں ہر جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے۔میں کیا ہوں؟ یہ غیر متناہی عالم کیا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا کوہِ حرا کی چٹانیں،کوہِ طور کی سربفلک چوٹیاں،کھنڈر اور میدان،کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں،ہر گز نہیں،بلکہ گنبدِ گردوں،گردشِ لیل ونہار،چمکتے ہوئے ستارے،برستے ہوئے بادل،کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔'' [۱۴۱]

اسی طرح مارگولیوتھ کی کتاب ''لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' سے شبلی نے ایک اقتباس نقل کرتے وقت لکھا ہے کہ:

> ''ایک یورپین مؤرخ جس کے قلم نے پیغمبر اسلام کی مدح کے لیے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیوتھ) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا،بنیاد ڈال چکے تھے۔آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ صلی اللہ
علیہ وسلم نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ
قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔'' ۱۴۲؎

شبلی نے جہاں مستشرقین کی غلط کاریوں پر گرفت کی ہے، وہاں عربی سیرت نگاروں، مؤرخوں اور اور ارباب روایت کے غلط، مشکوک یا بے بنیاد بیانات کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے۔

بہر کیف شبلی نے ''سیرت النبی'' کی دونوں جلدوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی صفات اور بشری خصوصیات اتنی تفصیل سے پیش کی ہیں خصوصا جلد دوم میں کہ اس کتاب کو اردو کے سوانحی ادب کی مکمل اور مفصل کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی، خلوت و جلوت کی جزئیات، عادات و خصائل، شکل و مشائل، سیرت و کردار، غرض کہ ایک ایک بات کی اتنی تفصیلات موجود ہیں، کہ اس سے زیادہ کسی کے بارے شاید ہی مہیا ہو سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رفقاء، اعزا و اقارب، ازواج اور اولاد کی زندگیاں تاریخ کے اجالے میں اتنی واضح اور روشن ہیں کہ ان کے درمیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، گوشت پوست کے ایک زندہ عظیم انسان نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ:

''جہاں تک ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے، ان کی بشری
کمزوریوں (نعوذ باللہ) کو تو مطلقاً چھپانے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ان کی
بھی صحیح اور مکمل تصویریں اس مرقعے میں موجود ہیں۔'' ۱۴۳؎

شبلی کے نزدیک ''سیرت النبی'' کی تالیف کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس سے نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے اور اس کا سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو۔ اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک یقیناً تمام فضائل اخلاق کا مجموعہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی کو جامعیتِ کبریٰ کا درجہ حاصل ہے جبکہ حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور حضرت نوح علیہ السلام فضائل اخلاق کی کسی صنف کے نمونے تھے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام ضرورتِ دینی و دنیوی میں اور تمام تمدنی، انفرادی اور اجتماعی

مسائل میں ذریعۂ تربیت بن سکتی ہے۔

چنانچہ شبلی کہتے ہیں کہ:

''صرف ہم مسلمانوں کو نہیں ، بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے جس کا نامِ مبارک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں بلکہ ایک علمی ضرورت ہے ،ایک اخلاقی ضرورت ہے ،ایک تمدنی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضرورتِ دینی و دنیوی ہے۔'' ۱۴۴

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ''سیرت النبیؐ'' کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

بیشتر نقادوں نے ''سیرت النبیؐ'' کو اپنے موضوع پر سب سے زیادہ مکمل اور جامع تصنیف قرار دیا ہے، بلکہ بعض نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اس کا جواب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔'' ۱۴۵

ڈاکٹر سید شاہ علی نے طوالت و اختصار کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''سوا مذہبی جذبے کے ، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور دلائل و معجزات کے ساتھ ساتھ ان کی ساری اسلامی عبادات ،عقائد وغیرہ کے احاطے کا متقاضی ہے ،کوئی اصولِ سوانح نگاری ان متعدد ضخیم جلدوں کا مجاز نہیں ہوسکتا ۔۔۔عظیم سے عظیم تر حیات کا بیان بھی ایک مختصر چوکھٹے میں آ سکتا ہے، درآں حالے کہ لکھنے والے کا سوانحی جذبہ کے علاوہ کوئی اخلاقی یا کوئی اور مقصد نہ ہو۔'' ۱۴۶

ڈاکٹر سید عبداللہ نے سیرت النبی کی توصیف کے ساتھ ساتھ اس کی چند کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعویٰ کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ ہے ۔شبلی نے مؤرخین یورپ کے اعتراضات سے دب کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلے میں ضرورت سے کچھ بہت زیادہ معذرت کا

لہجہ اختیار کیا ہے۔اسی طرح غلامی اور تعداد ازدواج کے مسئلے کے تجزیے
میں بہت کچھ دبے دبے نظر آتے ہیں اور ہر چند کہ وہ پیغمبر کی سوانح عمری
لکھ رہے ہیں، بار بار مغربی نقادوں کی اس رائے سے مرعوب ہو کر چلتے
ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل عام بشریت کے مطابق
تھا ،حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام بشر نہ تھے ،خاص بشر
تھے۔'' ۱۴۷

بہر کیف علامہ شبلی کے بعض علمی تسامحات کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کا اسلوب عالمانہ، محققانہ اور پختہ ہے۔ان کی تحریر میں بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ دل کشی بھی ہے۔انہوں نے تاریخ و سیرت جیسے سنجیدہ موضوع کو بھی ادب کی چاشنی سے ہم کنار کر دیا ہے۔بلا شبہ اس کتاب نے اردو زبان کو ایک خوب صورت اور منفرد اسلوب عطا کیا ہے۔

سید صاحب اور شبلی کی تحریروں میں ڈاکٹر خالد نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے۔کہتے ہیں:

''شبلی کے مقابلے میں سید صاحب کا اسلوب اتنا ہی مختلف ہے جتنی ان
کی شخصیت۔شبلی خود بھی رنگین مزاج، تیز طبع ،متحرک ،گرم جوش جذبات
اور نفاست پسند تھے،اور ان کی تحریر بھی رنگین ، چست ،تحریک آمیز اور
حرارت خیز تھی۔اس کے برعکس سید صاحب خود بھی سنجیدہ، بردبار، معتدل
مزاج اور ٹھنڈے انسان تھے اور سنجیدگی ، بردباری ،اعتدال اور علمیت کی
یہی صفات ان کے اسلوب کا خاصہ ہے۔'' ۱۴۸

اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''سیرت النبی کے وہ حصّے جو سید سلیمان نے تحریر کئے ہیں ان میں سیرت
سے زیادہ تشریح احکام دین کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔سید صاحب سوانح
پر کم اور مسائل کی تعبیر و استخراج پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں،اسی لیے
شبلی والے حصے میں اگر آنحضرت اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لفظی شبیہہ آ گئی
ہے تو سید صاحب والے حصے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور
دینی احکام کی روح سمٹ آئی ہے۔یہ کتاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

زندگی اور پیغام پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔'' ۱۴۹

اختر وقار عظیم کے بقول:

''آج تک سیرت البنی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محققانہ عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں لکھی گئی۔'' ۱۵۰

**نوٹ:**

**یہاں اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ راقم الحروف نے تسلسل کے خیال سے سیرۃ النبی کی ساتوں جلدوں کا جائزہ ایک ہی مقام پر کر دیا ہے اگر چہ شبلی نے دو ہی جلدیں لکھیں بقیہ پانچ جلدیں سید سلیمان ندوی نے لکھیں۔**

# حوالہ جات


۱۔عبدالطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ا

۲۔عبدالطیف اعظمی، مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ۷

۳۔شبلی نعمانی، مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۸۲

۴۔شبلی نعمانی، المامون، ص ۸

۵۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ دوم، ص، ۱۷۳

۶۔شبلی نعمانی، المامون تمہید، حصہ دوم، ص، ۱۴۸

۷۔شبلی نعمانی، المامون تمہید، حصہ دوم، ص، ۱۴۶

۸۔شبلی نعمانی، المامون، ص ۱۴۶

۹۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ دوم، ص، ۱۷۴

۱۰۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ دوم، ص، ۲۰۰۔۱۹۹

۱۱۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ دوم، ص ۲۰۳

۱۲۔شبلی نعمانی، لمامون، حصہ دوم، ص ۶۰

۱۳۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص ۴۳

۱۴۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۱۹

۱۵۔شبلی نعمانی، لمامون، حصہ اول، ص، ۲۱

۱۶۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۲۳

۱۷۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۱۰۷

۱۸۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۱۰۷

۱۹۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۱۲۱

۲۰۔شبلی نعمانی، المامون، حصہ اول، ص، ۱۲۲

۲۱۔شبلی نعمانی، المامون، ص ۱۲۲

۲۲۔شبلی نعمانی، المامون، ۱۲۵-۱۲۴

۲۳۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن،شبلی پر ایک نظر،ص،۲۶

۲۴۔شبلی نعمانی،دیباچہ المامون،حصہ اول،ص:۸

۲۵۔شبلی نعمانی،دیباچہ سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۹-۸

۲۶۔شبلی نعمانی،دیباچہ سیرۃ النعمان حصہ اول،ص ۸

۲۷۔شبلی نعمانی،دیباچہ سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۹-۸

۲۸۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۵۴

۲۹۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۵۴

۳۰۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص،۱۵۳-۱۵۲

۳۱۔شبلی نعمانی سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۳۷

۳۲۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۴۲

۳۳۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۵۵

۳۴۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۴۳

۳۵۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ اول،ص:۲۳

۳۶۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۲۴-۲۳

۳۷۔شبلی نعمانی،سیرت النعمان،ص ۴۵۔۴۴

۳۸۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ اول،ص،۴۶

۳۹۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۴۶

۴۰۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۴۷

۴۱۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۵۰۔۵۱

۴۲۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ اول،ص،۶۹

۴۳۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان حصہ،اول،ص،۳۷-۲۷

۴۴۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،حصہ دوم،ص،۱۰۲

۴۵۔ڈاکٹر سید محمد عبداللہ،سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء،ص،۱۶۵-۱۶۴

۴۶۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص،۱۲۴

۴۷۔شبلی نعمانی،سیرۃ النعمان،ص،۸

۴۸۔شبلی نعمانی، سیرۃ النعمان،ص،۸-۹
۴۹۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص،۱۷
۵۰۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،ص،۲۳۶
۵۱۔اختر وقار عظیم،شبلی بحیثیت مورخ،ص۱۱۲
۵۲۔اختر وقار عظیم شبلی بحیثیت مؤرخ،ص،۱۱۲
۵۳۔سید سلیمان ندوی حیات شبلی،ص،۱۹۹
۵۴۔ڈاکٹر صفیہ بی،شبلی بحیثیت سوانح نگار،ص۹۱
۵۵۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص،۲۶
۵۶۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص،۲۸
۵۷۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص۳۲۔۳۰
۵۸۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم،ص،۳۵
۵۹۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ۱۷۷
۶۰۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ اول،ص،۳۸
۶۱۔رسالہ'' کاروان ادب اسلامی، اکتوبر دسمبر ۱۹۹۶ء،ص،۳۳۴
۶۲۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی، ایک تنقیدی مطالعہ،ص،۱۶۳
۶۳۔ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری،ص،۱۹۴۔۱۹۵
۶۴۔شبلی نعمانی، الفاروق، حصہ دوم،ص۱۶،۱۴،۱۳
۶۵۔شبلی نعمانی، الفاروق، حصہ دوم،ص،۱۶،۱۴،۱۳
۶۶۔شبلی نعمانی، الفاروق، حصہ دوم،ص۳۱
۶۷۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص۳۲
۶۸۔شبلی نعمانی، الفاروق،ص۳۰
۶۹۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم،ص،۳۳
۷۰۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم،ص،۳۳
۷۱۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم،ص،۳۷
۷۲۔شبلی نعمانی، الفاروق حصہ دوم،ص،۳۸

۷۳۔شبلی نعمانی،الفاروق حصہ دوم،ص،۳۸
۷۴۔شبلی نعمانی،الفاروق،حصہ دوم،ص،۱۱۸
۷۵۔شبلی نعمانی،الفاروق،حصہ دوم ص۱۹۰
۷۶۔شبلی نعمانی،الفاروق،دوم ص۲۰۲۔۲۰۳
۷۷۔مہندی حسن افادی،افادات مہندی،ص ۴۵
۷۸۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۷
۷۹۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن،شبلی پر ایک نظر،ص،۶۱
۸۰۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۷
۸۱۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۸
۸۲۔شبلی نعمانی،الغزالی ص ۱
۸۳۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۱۰
۸۴۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۱۱-۱۰
۸۵۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۲۸
۸۶۔شبلی نعمانی،الغزالی حصہ دوم،ص ۳۱
۸۷۔شبلی نعمانی،الغزالی حصہ دوم،ص ۳۱
۸۸۔شبلی نعمانی،لغزالی حصہ دوم،ص ۵۹
۸۹۔شبلی نعمانی،الغزالی ص ۸۸
۹۰۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص ۹۰۔۸۹
۹۱۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص،۱۶۳
۹۲۔شبلی نعمانی،الغزالی،ص ۱۶۳۔۱۶۴
۹۳۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۱۰
۹۴۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،۷۔۶
۹۵۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۶
۹۶۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۹
۹۷۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم ص ۳۴

۹۸۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص،۳۶

۹۹۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۳۷

۱۰۰۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم ص ۳۹

۱۰۱۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۸۱

۱۰۲۔حبیب الرحمٰن شیروانی،مقالات شیروانی ص ۱۵۴

۱۰۳۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،۸۴

۱۰۴۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۱۰۴

۱۰۵۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۱۰

۱۰۶۔شبلی نعمانی،سوانح مولانا روم،ص ۲۳

۱۰۷۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص ۱۵۔۲۱۶

۱۰۸۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۳۸

۱۰۹۔ڈاکٹر سید شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری،ص ۱۹۷

۱۱۰۔ڈاکٹر عبدالواسع،بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء،ص ۲۵

۱۱۱۔ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی،رسالہ ''الایام'' دسمبر ۲۰۱۰،ص ۴۶۔۱۴۵

۱۱۲۔شیخ محمد اکرام،یادگار شبلی ص ۴۳۶

۱۱۳۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی ص ۲۰۳۔۲۰۴

۱۱۴۔شبلی نعمانی،مقالات شبلی ص ۳۲

۱۱۵۔شبلی نعمانی،مقالات شبلی،ص ۳۱۳

۱۱۶۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی ص ۱۵۷۔۱۶۷

۱۱۷۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،ص ۲۲۷۔۲۳۷

۱۱۸۔ڈاکٹر سید شاہ علی،اردو میں سوانح نگاری ص ۲۰۴

۱۱۹۔معارف عظم گڑھ،سلیمان نمبر ص ۱۸۰

۱۲۰۔شیخ محمد اکرام،یادگار شبلی ص ۴۲۹

۱۲۱۔معارف اعظم گڑھ،سلیمان نمبر ص ۱۸۱

۱۲۲۔شبلی نعمانی،سیرت النبی جلد دوم ص ۴ دیباچہ

۱۲۳۔معارف اعظم گڑھ،سلیمان نمبر ص ۱۸۱
۱۲۴۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد سوم ص ۶۰
۱۲۵۔معارف اعظم گڑھ،سلیمان نمبر ص ۱۸۲
۱۲۶۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ششم ص ۴۸۷
۱۲۷۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ششم ص ۹
۱۲۸۔شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان ص ۴۷۳-۴۷۴
۱۲۹۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ص ۶-۵
۱۳۰۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، جلد ہفتم ص ۲
۱۳۱۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ص ۴-۵
۱۳۲۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ص ۵-۶
۱۳۳۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ۲۳
۱۳۴۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ص ۹
۱۳۵۔سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم ص ۱۶
۱۳۶۔ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، چند اہم کتب سوانح ص ۳۰۶
۱۳۷۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۰۲
۱۳۸۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی ص ۲۰۱
۱۳۹۔شبلی نعمانی، سیرت النبی جلد اول ص ۱۰۰-۱۰۱
۱۴۰۔شبلی نعمانی، سیرت النبی جلد اول ص ۱۰۱
۱۴۱۔شبلی نعمانی، سیرت النبی اول ص ۲۰۱،۲۰۲
۱۴۲۔شبلی نعمانی، سیرت النبی دوم ص ۹
۱۴۳۔ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۴
۱۴۴۔شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول، ص ۶
۱۴۵۔البصیر شبلی نمبر ص ۴
۱۴۶۔ڈاکٹر سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری ص ۲۰۰
۱۴۷۔فکر و نظر ص ۱۳۱۸

۱۴۸۔ڈاکٹر میاں محمد صدیقی، بحوالہ چند اہم کتب سوانح ص ۳۰۵
۱۴۹۔ڈاکٹر میاں محمد صدیقی، چند اہم کتب سوانح ص ۳۰۵
۱۵۰۔اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مورخ ص ۳۹

# باب پنجم

## ﴿......سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری......﴾

اردو زبان وادب میں سید سلیمان ندوی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔انشاء وادب، تحقیق وتنقید سے متعلق ان کی تصنیفات ہمارے لئے آج بھی مشعل راہ ہیں۔اس کے ساتھ دین ومذہب کی ترویج وارتقاء میں انہوں نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ان کی شہرت ایک عالم باعمل کی حیثیت سے بھی اور ایک مدلل مقرر کی حیثیت سے بھی ہے۔ملک اور بیرون ملک انہوں نے دین ومذہب، ادب اور انشاء سے متعلق مفصل، مدلل اور دلکش تقریریں کی ہیں۔ان کے خطبات شائع ہو چکے ہیں۔یہ امر واقعہ ہے کہ سید سلیمان ندوی کی تحریر وتقریر اپنی علمی شان اور انشاء پردازی کے لحاظ سے بے عدیلی ہیں ان کی تحقیقی نظر، تنقیدی نگاہ اور تبحر علمی کا اعتراف ہر کسی نے کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سید سلیمان ندوی جس سر چشمہ سے اکتساب فیض کیا تھا وہ ذات گرامی شبلی نعمانی کی ہے۔

سید سلیما ندوی شبلی کے عزیز شاگردوں میں ایک تھے ویسے تو شبلی کے زیر سایہ بہت لوگوں نے تربیت پائی لیکن جو شفقت ومحبت سید سلیمانی ندوی کو ملی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔شبلی اور سید صاحب کے تعلقات بہت گہرے تھے، وہ شبلی ہی تھے جنھوں نے سید صاحب کو ندوہ میں داخل کرانے کی رائے دی اور بعد میں سید سلیمان ندوی کو الندوہ کا نائب مدیر بنایا۔جس سے سید صاحب کے صحافتی رجحان میں مدد ملی اس کے بعد شبلی کے اثرات ان پر مرتب ہونے لگے جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے:

''خاک سار نے استاد مرحوم کی صحبت و تربیت میں آٹھ برس

(۱۹۰۵ء۔۱۹۱۲ء) تک مسلسل گزارے اور دو برس اس طرح کہ جسم کہیں رہا مگر روح ہمیشہ ان کے ساتھ رہی یہ دس برس درحقیقت ان کی بتیس برس کی علمی وقومی زندگی کے سب سے مصروف ایام تھے، بلکہ انہی کو ان کے ستاون برس کی زندگی کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔'' ۱

اس سے شبلی اور سید صاحب کے گہرے تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی کی تربیت کی وجہ سے سید صاحب کو تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا ہوا اور سید صاحب کی تمام تصانیف پر شبلی کے اثرات بہت دور تک قائم ہوئے۔ سید صاحب صرف ایک سوانح نگار ہی نہ تھے بلکہ وہ ناقد، ادیب، شاعر، اور سب سے بڑھ کر ان کی پہچان ایک مذہبی شخصیت کی شکل میں کی جاتی ہے۔ سید صاحب میں سوانح کا ذوق پیدا کرنے میں شبلی کا اہم کردار رہا ہے اور سید صاحب کی سوانح نگاری پر شبلی کی سوانح نگاری کے اثرات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ استاد اور شاگرد میں جو اتحاد فکر اور ارتباط قلبی تھا، اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی۔ اپنے استاد سے سید سلیمان ندوی کو کتنا قلبی تعلق تھا اس کا اظہار ان تمام تحریروں سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے استاد کے تعلق سے لکھی ہیں۔ اپنی وفات کے وقت شبلی نے سید صاحب کو جو وصیت کی اس سے بھی شاگرد کی عقیدت اور استاد کے اعتماد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اس بابت میں رقم کیا ہے:

''لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے آنکھیں کھول کر حیرت سے میری طرف دیکھا، اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا پھر زبان سے دوبارہ فرمایا، اب کیا! اب کیا! لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آ گئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو۔'' ۲

شبلی نعمانی کے لائق وفائق شاگرد نے بربنائے عقیدت واحترام جو انہیں اپنے استاد سے تھا، اپنی تمام علمی مصروفیات کو ترک کر کے سیرت النبی کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اپنی مصروفیات اور علمی مشاغل کو سیرت النبی کی تکمیل کے لئے انہوں نے اس طرح پس پشت ڈالا کہ جو چیز جہاں تھی وہیں رہ گئی اور

اس کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگایا جب تک سیرت النبی مکمل نہیں ہو گئی۔اس بات کا اندازہ ان کی بعض تصنیفات کے دیباچے میں سید صاحب نے رقم کیا ہے۔

''طالب علمی کے زمانہ میں، میں نے اس کا سلسلہ شروع کیا اور جنوری ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں اس پر ایک مضمون لکھا،فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا،ابھی تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا کہ حضرت الاستاد نے وفات پائی اور دم نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ کر سب سے پہلے سیرت النبی کی تکمیل کی جائے۔اس بنا پر جہاں تک ''حیات مالک'' کی مسافت طے ہو چکی تھی۔قلم کا مسافر وہیں پہنچ کر رک گیا اور اب آئندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل معلوم ہوتی ہے۔اس لئے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اس کو وقف ناظرین کیا جاتا ہے۔'' [۳]

مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا اور یہ تحریر سید صاحب نے اگست ۱۹۱۷ء میں قلم بند کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین برسوں کے بعد بھی سید صاحب سیرت النبی کی تکمیل کے علاوہ کسی دوسری کتاب کی تصنیف وتالیف کی بات بھی نہیں سوچ رہے تھے۔اس طرح مولانا شبلی نعمانی کی تاریخ وفات کو اگر حد تصور کریں تو سید سلیمان ندوی کی سوانحی نگارشات دو حصوں میں منقسم ہوں گی پہلا حصہ ان نگارشات پر مشتمل ہوگا جن کی تصنیف کا آغاز سید صاحب نے اپنے استاد کی وفات سے قبل کیا تھا اور اس کی تصنیف میں ان کے استاد کے مشورے اور رہنمائی شامل تھی اور دوسرا حصہ ان نگارشات کا ہوگا جو سید صاحب نے اپنے استاد کی وفات کے بعد تصنیف کیا اور ان میں ان کے استاد کے مشورے اور رہنمائی شامل نہ تھی۔سیرت النبی کے باقی ماندہ جلدوں کی تکمیل کی تو استاد نے وصیت کر دی تھی مگر حیات مالک اور سیرت عائشہ میں بھی ان کے مشورے اور رائیں شامل ہیں۔حیات مالک میں مولانا شبلی کے مشورے کی شمولیت کا اندازہ اوپر کے اقتباس سے ہو جاتا ہے۔سیرت عائشہ میں ان کی رائیں شامل رہی ہیں،اس کا اظہار سید صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں صاف صاف لفظوں میں کر دیا ہے:

''نو برس گزر گئے جو مجھ کو سیرت عائشہ کا اول اول خیال آیا اس وقت میں

الندوہ کا سب ایڈیٹر تھا اور یہ میرے تعلیمی زمانہ کا آخری سال تھا۔۱۰ اپریل ۱۹۰۶ء میں ایک عریضہ کے ذریعہ سے اپنے خیالات استاد مرحوم کی خدمت میں عرض کئے۔انہوں نے ہمت بندھائی اور کتابوں کے نام بتائے۔چنانچہ دو برس کے بعد اب تک وہ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ مطابق اپریل ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شائع بھی کیا گیا۔پھر سوء اتفاق سے یہ خیال کچھ سرد سا پڑ گیا۔لیکن احباب کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا۔'' ۴

اور انہوں نے اپنے ذہن کے ان خاکوں کو بھی عملی جامہ پہنایا جو کبھی کبھار ان کے ذہن میں اپنے استاد کی وفات سے قبل مرتب ہوئے تھے اور انہوں نے اس ضمن میں ایک مضمون سیرت عائشہ سے متعلق ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں شائع کیا تھا۔اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے اس کو مفصل کتاب کی شکل دینے کی فرمائش کی مگر سید صاحب بعض وجوہ سے اس کی طرف رجوع نہ ہوئے۔سیرت عائشہ کے دیباچے میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید صاحب نے رقم کیا ہے:

''مولوی عزیز مرزا مرحوم سے جب ملاقات ہوتی،سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا تقاضا کرتے اور میں مسکرا کر خاموش ہو رہتا۔حضرت الاستاد بھی بار بار اس کی تکمیل کی ہدایت فرماتے رہے۔میرے احباب میں سید عبدالحکیم صاحب ایک بزرگ ہیں،ان کا کوئی خط ''سیرت عائشہ'' کے تقاضے سے خالی نہیں آیا۔آخر میں نے اپنے سکوت سے ان کو خاموش کر دیا۔لیکن میرے دوستوں میں ایک صاحب نہایت مستقل مزاج اور صابر نکلے،منشی محمد امین صاحب مہتمم صیغۂ تاریخ بھوپال،پورے آٹھ مہینے تک میرے انکار و تعلل سے بھی مایوس نہ ہوئے۔آخر ۲۷ رجب ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا۔'' ۵

لیکن اس کتاب کی تکمیل و اشاعت ۱۹۱۷ء میں ہوئی اور وہ بھی ''تاج ہند،ہر ہائنس والیہ عالیہ بھوپال کی اعانت اور فرمائش پر۔اس سلسلے میں بھی سید صاحب نے واضح لفظوں میں تحریر فرمایا ہے:

''سیرت عائشہ کا آغاز گو مصنف نے اپنے صرف اپنے شوق سے کیا تھا،

لیکن الحمداللہ کہ اس کا انجام اس کے آغاز سے بہتر ہوا۔ان اوراق میں
جس مخدومہ جہاں رضی اللہ عنہا کے حالات لکھے گئے ہیں ،اس کے
مقدس شریک زندگی کی سیرت مبارک، ہر ہائنس والیہ عالیہ بھوپال کی
اعانت سے ہماری زبان میں تصنیف ہورہی ہے ۔ایسی حالت میں
ضروری تھا کہ حرم نبوت کی سیرت پاک کی تصنیف کا ایما بھی ادھر ہی ہوتا
ہے۔'' ۶

اسی بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس تصنیف کی تکمیل کا باعث درحقیقت حضور ممدوحہ ہی کا ارشاد ہے۔
پہلے مولانائے مرحوم کے ذریعہ سے ان کی وفات کے چند روز بعد
۲۹ نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مجھ کو باریابی کا شرف حاصل ہوا تو مشافہتاً سرکار
عالیہ نے اس کی تکمیل کا حوصلہ دیا۔ برسوں کی محنت اور زحمت کشی کے بعد
الحمداللہ کہ ایک علمی خدمات کے انجام کے ساتھ تعمیل ارشاد کی مسرت بھی
حاصل کر رہا ہوں۔'' ۷

بہر کیف سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے سید صاحب کا پایہ بلند ہے۔حیات مالک اور سیرت عائشہ جیسی شخصیت پر اپنا زورِ طبع اور فنی کاوش کا اظہار مکمل کر سکے'' خیام'' کی تصنیف کے دوران سوانح کے تمام جزئیات کو جس احتیاط سے سید صاحب نے پیش کیا ہے اسے اپنے موضوع پر حرف آخر کہا جا سکتا ہے۔سید سلیمان ندوی کو سوانح نگاری کا فنی شعور بھی تھا اور مضمون کو برتنے کا فنی سلیقہ بھی ،اس کی شہادت ان کی تحریر کردہ سوانح عمریوں میں بخوبی ملتا ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت وسوانح نگاری کے بارے میں عبیداللہ کوٹی ندوی یوں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے سیرت وسوانح کے موضوع پر جو کتابیں ترتیب دیں ان کی
حیثیت خاتم سلیمانی میں ہشت پہلو نگینے کی ہے۔جس میں کئی کئی فن بیک
وقت اپنا رنگ دکھاتے نظر آتے ہیں۔'' ۸

## سیرت عائشہ:

سیرت عائشہ ۱۹۱۷ء میں منظر عام پر آئی۔اس کی تصنیف کا خیال تو مصنف کو زمانہ طالب علمی میں آیا تھا اور انھوں نے اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی سے اس بارے میں مشورہ بھی کیا اور مضمون لکھا۔لوگوں کے تقاضے ہوتے رہے مگر ان کے قلم میں جنبش نہیں ہوتی تھی۔آخر کار والیہ بھوپال کی تقاضے سے کتاب لکھی۔اس کا سبب حضرت عائشہ کے حالات کی نا دستیابی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں معلوم ہوتا ہے۔اس سوانح عمری کی تصنیف کی اہمیت اور ماخذ کے سلسلے میں سید سلیمان نے بعض اشارے کئے ہیں،جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔سید صاحب نے رقم کیا ہے:

> ''اردو زبان کی نشاۃ جدید نے ہماری زبان میں جن تصنیفات کا ذخیرہ فراہم کیا ہے،ان سے رجال اسلام کے کارنامے ایک حد تک منظر عام پر آگئے ہیں،لیکن مخدرات اسلام کے کارہائے نمایاں اب تک پردہ خفا میں مستور ہیں۔سیرت عائشہؓ پہلی کوشش ہے جس کے ذریعہ اس صنف کے کارناموں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔'' ۹؎

ایک اور جگہ سید صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

> ''ارباب نظر جانتے ہیں کہ کتب احادیث خصوصاً بخاری میں حالات اس قدر متفرق اور منتشر ہیں کہ ان کو ڈھونڈ کر یکجا کرنا چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چننا ہے۔'' ۱۰؎

کتب احادیث سے جس قدر معلومات فراہم ہوئیں ان کو بنیاد بنا کر سید صاحب نے سیرت عائشہ کی تصنیف کی ہے۔ظاہر ہے اس سوانح عمری کی تکمیل میں سید صاحب کو بڑی دشواریوں سے گزرنا پڑا ہے۔اس سوانح عمری کی تصنیف سید صاحب نے صرف اپنی عقیدت کے اظہار کے لئے نہیں کیا ہے۔اپنے معاشرے میں پھیلی گمراہیوں کے ازالہ کی صورت اس میں دیکھی ہے۔چنانچہ سید صاحب نے لکھا ہے:

> ''آج مسلمانوں کے اس دور انحطاط میں،ان کے انحطاط کا بہ حصہ رسدی آدھا سبب ''عورت'' ہے۔وہم پرستی،قبر پرستی،جاہلانہ مراسم،غم وشادی کے موقعوں پر مسرفانہ مصارف اور جاہلیت کے دوسرے آثار، صرف اس لیے ہمارے گھروں میں زندہ ہیں کہ آج مسلمان بیبیوں کے

قالب میں تعلیمات اسلامی کی روح مردہ ہوگئی ہے۔شاید اس کا سبب
یہ ہو کہ ان کے سامنے ''مسلمان عورت'' کی زندگی کا کوئی مکمل نمونہ نہیں۔
آج ہم ان کے سامنے اس خاتون کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جو نبوت
عظمیٰ کی نو سالہ مشارکت زندگی کی بنا پر خواتین خیرو القرون کے حرم میں
کم وبیش چالیس برس تک شمع ہدایت رہی۔'' ۱۱

اس میں شک نہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی زندگی تمام مسلمانوں کے لئے شمع ہدایت ہے۔ دوسری امہات المومنین سے ان کو فضیلت اس وجہ سے ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آسائش وآرام کا خیال تو رکھتی ہی تھیں، بعض معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشیر اور رفیق بھی تھیں۔اس لحاظ سے سید سلیمان ندوی نے ان کی زندگی کو مسلمانوں کے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کے لئے منتخب کیا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر الطاف فاطمہ کا خیال ہے:

''یہ سوانح عمری نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ امت مسلمہ کی قابل
صد احترام ماں کی پہلی سوانح عمری ہے جس میں ایک عورت کی زندگی
اور فطرت کے بوقلموں اور گوناگوں پہلو پیش کئے گئے ہیں۔اور عورت
ایک بیٹی بیوی بہن سوتیلی ماں عالمہ فاضلہ مجاہدہ قابل احترام اور ہر دلعزیز
ہستی کے روپ میں نظر آتی ہے۔'' ۱۲

اس سوانح عمری کے ماخذات کتب احادیث ہیں، جن میں سیرت عائشہ ؓ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ان کے علم وفضل، مذاق، شعر وسخن، فقہ وحدیث میں ان کے علم میں ان کی احتیاط، جزرسی اور نکتہ سنجی کو مختلف واقعات کی مدد سے اس طرح پیش کیا ہے کہ حضرت عائشہ کی زندگی اپنی گوناگوں جہتوں کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔حضرت عائشہؓ کو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بچپن میں ہی اس لئے اہمیت حاصل ہوگئی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوگیا تھا۔اس لئے ان کے بچپن کے واقعات عام طور سے مختلف تذکروں اور احادیث میں درج ہیں، لیکن مصنف کا کمال ہے کہ اس نے بچپن کی زندگی کو ان واقعات وواردات کو بھی پیش کیا ہے جو ان کے کھیل کود، معصوم طفلانہ مشاغل اور کھلونے سے متعلق ہیں۔اس لئے اپنی زندگی کی اس عمر میں حضرت عائشہؓ ایک معصوم چھوٹی بچی نظر آتی

ہیں۔بچپن کے حالات میں ایک جگہ سید صاحب نے رقم کیا ہے:

''حضرت عائشہؓ کم سن بچی تھیں،کبھی کبھی بچپن کے تقاضے سے ماں کی خلاف مرضی کوئی بات کر بیٹھتی تو ماں سزا دیتی تھیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دیکھتے تو رنج ہوتا۔اس بنا پر سیدہ ام رومان ؓ سے تاکید فرمادی تھی کہ ذرا میری خاطر اس کو ستانا نہیں۔ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ سیدہ عائشہؓ کواڑ سے لگ کر رو رہی ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام رومان رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم نے میری بات کا لحاظ نہیں کیا۔انھوں نے عرض کیا:''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!یہ میری بات باپ سے جا کر لگا آتی ہے۔''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جو کچھ بھی کرے،لیکن اس کو ستاؤ نہیں۔'' ۱۳؎

اسی طرح سید صاحب نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام ونسب وخاندان،ولادت وطفولیت، ازدواجی زندگی،ہجرت،رخصتی اور دوسرے موضوعات رسوم جاہلیت کا ابدال،تعلیم وتربیت،خانہ داری، سوکنوں کے ساتھ برتاؤ،سوتیلی اولاد کے ساتھ سلوک،واقعہ افک اوراس سلسلے میں سرولیم کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ،نزول تیمّم تحریم،ایلا اورتخیر،بیوگی،عام حالات،عہد صدیقی،داغ بے پدری،عہد فاروقی، مسلمان عورت کے فرائض،جنگ جمیل،وفات،حلیہ،لباس،اخلاق وعادات،قناعت پسندی،شوہر کی اطاعت،غیبت اور بدگوئی سے احتراز،خودداری،دلیری،فیاضی،غلاموں پر شفقت،پردہ کا اہتمام،مناقب، فضل وکمال،علم واجتہاد،قرآن مجید،ان کی تفسیری روایتیں،ان سے موسوم ہونے والی حدیثیں،فقہ وقیاس،علم کلام وعقائد،علم اسرارالدین،ادب،خطابت وشاعری،تعلیم افتااورارشاد،طبقہ اناث پران کےاحسانات،عالم نسواں میں ان کا درجہ وغیرہ کے سلسلے میں ملنے والے واقعات وواردات کوشواہد وبراہین کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس حیثیت سے یہ کتاب حضرت عائشہؓ کی زندگی پر دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔ام المومنین حضرت عائشہؓ کی زندگی کے اکثر گوشوں کی نقاب کشائی ہوئی ہےاور جب واقعات وواردات کا جائزہ مکمل ہوتا ہے تو وہ ایک مثالی عورت کے روپ میں نظر آتی ہیں۔سید صاحب نے چھوٹے چھوٹے واقعات

وواردات کواس خوبی سے یکجا کیا ہے کہ زندگی گوناگوں روشن ہوجاتی ہے۔سید صاحب کا خیال تھا کہ:

''ایک مسلمان عورت کے لئے سیرت عائشہ میں اس کی زندگی کے تمام
تغیرات، انقلابات اور مصائب، شادی، رخصت، سسرال، شوہر، سوکن،
لاولدی، بیوگی، غربت، خانہ داری، رشک حسد، غرض اس کے ہر موقع اور
ہر حالت کے لیے تقلید کے قابل نمونے موجود ہیں پھر علمی، عملی، اخلاقی ہر
قسم کے گوہر گرانمایہ ہے یہ پاک زندگی مالامال ہے۔اس لئے سیرت
عائشہؓ اس کے لئے ایک آئینہ خانہ ہے جس میں صاف طور پر یہ نظر آئے گا
کہ ایک مسلمان عورت کی زندگی کی حقیقی تصویر کیا ہے۔'' ۱۴

اس سوانح عمری کا وافر مطالعہ کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ سید صاحب اپنے اس خیال میں حق بہ جانب ہیں۔حضرت عائشہؓ کی عظمت و بزرگی سے قطعہ نظر کر کے ان کی زندگی میں ایک مسلمان عورت کے لئے وہ سب کچھ موجود ہے جو اس کو جاننا اور سمجھنا چاہیئے۔اگر کوئی مسلمان عورت حضرت عائشہ کی زندگی کو اپنے پیش نظر رکھے تو اس کو دین و دنیا کے معاملات کو نپٹانے میں کسی طرح کی دشواری نہیں ہوگی۔اس کے علاوہ اس کی آخرت الگ سنور جائے گی۔

حضرت عائشہؓ ایک عورت تھیں، ان کی فطرت و عادت بھی اپنی جنس سے الگ نہیں تھیں۔اکثر ان کو دوسری امہات المونین سے شکایتیں پیدا ہوجاتی تھیں۔اگر چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برابر محبت وسلوک کی تعلیم دیتے تھے اور ایک دوسرے کی خطاؤں کو درگزر کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے، مگر اس کے باوجود ان میں شکر رنجی پیدا ہوجاتی تھی اور کبھی کبھی تلخیوں میں بھی بدل جاتی تھی۔بعد میں جلد ہی صفائی دل بھی ہوجاتی تھی۔سید صاحب نے ان واقعات وواردات کو بھی اسی سوانح عمری میں پیش کیا ہے مگر اس کا ذکر اس انداز میں نہیں کیا ہے کہ امہات المونین کی شان کے خلاف ہو۔اکثر لوگ ایسے موقع پر اعتدال نہیں برت پاتے۔ڈپٹی نزیر احمد نے اس ضمن میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ان باتوں نے اس سوانح عمری کو اسناد کا درجہ دلایا ہے اور بحثیت سوانح نگاری یہ ایک کامیاب سوانح عمری ہے۔اس سوانح عمری سے متعلق ڈاکٹر عبدالواسع کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''اگر چہ اس سوانح عمری کا موضوع مذہبی رنگ کا حامل تھا لیکن حضرت

عائشہؓ کوفوق البشر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ کردار کے
ارتقاء میں عضو یائی تکمیل کا لحاظ رکھا گیا ہے اور موقع اور محل سے واقعات
واردات کا انتخاب کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کی پوری
شخصیت زندہ ہو کر کتاب کے اوراق میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔
فن کاری کا کمال یہ ہے کہ ام المونین کی عظمت پر کہیں حرف نہیں آتا۔
حضرت عائشہ کی مثالی زندگی پر یہ کتاب مثالی ہوگئی ہے۔اس کتاب کے
بہت مقبول ہونے کی یہی وجہ ہے۔'' ۱۵؎

اس سوانح عمری کی کامیابی کا اندازہ ڈاکٹر الطاف فاطمہ کے ان جملوں سے بھی ہوتا ہے:

''سیرت عائشہؓ کے مطالعہ کے بعد اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید سلیمان
ندوی نہ صرف فن سوانح نگاری سے بخوبی واقف ہیں بلکہ اس کا احترام بھی
حتی الامکان کرتے ہیں۔اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ان کی نظر میں
حضرت عائشہؓ کا جو مقام اور رتبہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ
بہت کم سوانح نگار اس امتحان میں پورے اترتے ہیں۔اس درجہ واجب
الاحترام ماں کی تمام بشری خصوصیات یہاں تک کہ کمزوریاں بھی غیر
جانب داری اور دیانت داری سے پیش کردی ہیں۔'' ۱۶؎

اس سے قبل کہ میں اس سوانح عمری کا جائزہ مکمل کروں ضروری سمجھتا ہوں کہ چند اقتباسات اس سے درج کردوں تا کہ اور جو باتیں اس کی خوبیوں سے متعلق کہی گئی ہیں ان کی تصدیق ہو سکے۔یہ اقتباسات خاص منصوبہ بند طریقہ پر اخذ نہیں کئے گئے ہیں بلکہ جہاں جہاں سے چند واقعات کو پیش نظر رکھ کر ان کا انتخاب کیا گیا ہے،۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ کا نکاح سنہ مقرر کرنے کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی نے احادیث وفقہ کی کتابوں کا بالاستعاب مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد کیا ہے:

''ممکن تھا کہ حضرت خدیجہؓ کا انتقال کی تاریخ سے نکاح کی تاریخ مقرر کی
جاتی لیکن خود حضرت خدیجہ کی تاریخ انتقال بھی متفق الیہ نہیں ہے۔ایک
روایت ہے کہ سن ہجرت سے پانچ برس پہلے انتقال ہوا۔دوسری روایت
ہے کہ چار برس پہلے ہوا اور بعض روایات میں ہے کہ تین برس پہلے ہوا۔

ان اختلافات کے موقع پر خود حضرت عائشہ کا قول زیادہ معتبر ہوسکتا تھا
لیکن لطف یہ ہے کہ بخاری اور مسند میں خود ان سے دو روایتیں ہیں ایک
میں ہے کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے تین برس بعد نکاح ہوا اور دوسری
میں ہے کہ اسی سال کا یہ واقعہ ہے، جمہور محققین کا فیصلہ یہ ہے اور روایات
کا بڑا اور مستند حصہ اسی کا مؤید ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے نبوت کے دسویں
سال ہجرت سے تقریباً تین برس پہلے رمضان المبارک میں انتقال کیا،
اور اسی کے ایک مہینہ کے بعد شوال میں سیدہ عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا نکاح ہوا۔'' ۱۷

امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ کو کیا فوقیت حاصل تھی اس کا اندازہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے جواباً فرمایا تھا۔ سیرت عائشہؓ میں بہت ہی براہ راست انداز میں نقل کیا گیا ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہؓ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور یہ
تمام صحابہ کو معلوم تھا۔ چناچہ لوگ قصداً اسی روز ہدیے اور تحفے بھیجتے تھے
جس روز سیدہ عائشہؓ کے ہاں قیام باری ہوتی اور ازواج مطہرات رضی
اللہ عنہما کے ہاں قیام کی باری ہوتی اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہما کو اس
کا ملال ہوتا، لیکن کوئی ٹوکنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ آخر سب نے مل کر سیدہ
فاطمہؓ کو آمادہ کیا۔ وہ پیام لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لخت جگر! جس کو میں
چاہوں، اس کو تم نہیں چاہوگی؟'' سیدہ عالم کے لئے اتنا ہی کافی تھا، وہ
واپس چلی آئیں۔ ازواج نے پھر بھیجنا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ آخر
لوگوں نے سیدہ ام سلمہؓ کو بیچ میں ڈالا۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متین خاتون
تھیں۔ انھوں نے موقع پا کر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ درخواست پیش
کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ام سلمہؓ! مجھ کو عائشہ رضی اللہ عنہا
کے معاملے میں ذوق نہ کرو، کیوں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو علاوہ کسی اور

بیوی کے لحاف میں مجھ پر وحی نازل نہیں ہوئی۔'' ۱۸؎

شوہر کی محبت کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عام عورتوں سے مختلف نہ تھیں اس نکتہ کو سید صاحب نے کتنی خوبصورتی سے مندرجہ ذیل واقعہ کے ذریعہ پیش کیا ہے:

سیدہ عائشہؓ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف شدید محبت تھی بلکہ شغف وعشق تھا۔اس محبت کا کوئی اور دعویٰ کرتا تو ان کو ملال ہوتا تھا۔ چناچہ باہم ازواج مطہراتؓ میں اس کا بڑا خیال تھا، تفصیل آگے آتی ہے۔کبھی راتوں کو سیدہ عائشہؓ بیدار ہوتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلو میں نہ پاتیں تو بے قرار ہو جاتیں۔ایک دفعہ شب کو آنکھ کھلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا۔اس وقت راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔ادھر ادھر ٹٹولنے لگیں۔آخر ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک ملا، دیکھا تو آپ سر بہ سجود مناجات الٰہی میں مصروف ہیں۔ایک دفعہ اور یہی واقعہ پیش آیا تو شک سے خیال کیا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسری بیوی کے ہاں تشریف لے گئے ہیں، اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسبیح وتحلیل میں مصروف ہیں۔اپنے قصور پر نادم ہوئیں اور بے اختیار زبان سے نکل گیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان!۔میں کس خیال میں کھوگئی ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس عالم میں ہیں۔'' ۱۹؎

واقعہ افک مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنی مطلق کی معرکہ آرائی میں تھیں، جب اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہورہے تھے تو حضرت عائشہؓ قافلہ میں پیچھے چھوٹ گئیں، پڑاؤ پر چادر اوڑھ کر پڑ رہیں کہ جب لوگ محمل میں نہ پائیں گے تو خود لینے آئیں گے، صفوانؓ بن معطل ایک صحابی قافلہ کے پیچھے پیچھے گری پڑی چیزوں کا انتظام کرتے ہوئے آرہے تھے، انھوں نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تو اناللہ پڑھا، پھر اپنے اونٹ کی مہار تھی، اور محمل پر سوار تھیں، اس طرح وہ قافلہ سے آملیں، یہ معمولی واقعہ تھا، مگر حضرت سید صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں سیتا پر اور بنی اسرائیل میں حضرت مریم علیہ

السلام پر جو کچھ گزری، اسلام میں اسی کا اعادہ ہوا، یعنی منافقوں نے حضرت عائشہ ؓ کی پاکدامنی پر الزام رکھ دیا، عبداللہ ابن ابی، حسان بن ثابتؓ شاعر اور مسطح بن اثاثہ نے اس سازش میں جو حصہ لیا، اس کا ذکر کرنے کے بعد وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نازک نہیں، یہ وہ شیشہ ہے جو پتھر پھینکنے سے نہیں، بلکہ پتھر پھینکنے کے ارادہ سے بھی چور چور ہو جاتا ہے، غلط بات بھی جب کسی آبرودار اور نیک آدمی کی نسبت کوئی شریر کہہ بیٹھتا ہے تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے، یا غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتا ہے، اب تک ناصرہ اسلام کی مریم ان واقعات سے بے خبر تھی۔'' ۲۰

اور جب ان کو معلوم ہوا تو سید صاحب نے پوری تفصیل لکھی ہے کہ کسی طرح غش کھا کر گر پڑیں، والدین نے سنبھالا، شدت کا بخار اور لرزہ آ گیا، دن رات آنکھوں سے آنسو تھمتا نہ تھا، نہ آنکھوں میں نیند کا سرمہ لگتا تھا، باپ لطف و محبت سے سمجھاتے کہ کہیں روتے روتے تمہارا کلیجہ نہ پھٹ جائے، ماں دلا سا دیتی تھیں کہ جو بیوی اپنی شوہر کی چہیتی ہوتی ہے اس کو اسی قسم کے صدمے اٹھانے پڑتے ہیں، ایک بار غیرت سے ارادہ کیا کہ کنویں میں گر کر جان دے دیں، صفوانؓ کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو غصہ میں تلوار لے کر حسان کی تلاش میں نکلے۔ حضرت علیؓ نے مسجد میں آ کر حرم نبوت کی پاکی اور طہارت پر تقریر کی اور منافقوں کی خباثت کو مطعون کیا، معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اوس اور خزرج کے دو قبیلوں میں لڑنے کے لیے تلواریں نکل پڑیں۔ واقعہ افک سے متعلق حضرت عائشہؓ کا رویہ نہایت مدبرانہ مبنی بر صداقت تھا۔ اس لئے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرم ہونے کی شرط میں توبہ کرنے کی تلقین کی تو انہوں نے اسی کا جواب نہایت دانش مندی سے دیا۔ لکھا ہے:

> ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے پاس آئے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا؛ عائشہؓ! اگر تم مجرم ہو تو توبہ کرو، خدا قبول کرے گا، ورنہ خدا تمہاری طہارت اور پاکی کی گواہی دے گا۔ والدین کو اشارہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیں، لیکن ان سے کچھ کہتے نہ بنا۔ یہ دیکھ کر سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میرے آنسو دفعتاً خشک ہو گئے، ایک قطرہ

بھی آنکھوں میں نہ تھا، دل نے اپنی براءت کے یقین کی بناپر اطمینان
محسوس کیا۔ پھر جواب میں اس طرح گویا ہوئیں :اگر میں اقرار کرلوں،
حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں بالکل بے گناہ ہوں، تو اس الزام کے صحیح
ہونے میں شک کس کو شک رہ جائے گا۔ اگر انکار کروں تو لوگ کب باور
کریں، میرا حال تو اس وقت یوسف علیہ سلام کے باپ ( کہتی ہیں کہ
سوچنے پر بھی سیدنا یعقوب علیہ السلام کا نام یاد نہ آیا ) کا سایہ ہے جنہوں
نے کہا تھا فصبر جمیل ۔'' ۲۱

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی علیہ وسلم پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی تو مسکراتے ہوئے سر اٹھایا، پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلک رہے تھے، اور سورہ نور کی وہ آیتیں تلاوت کر رہے تھے جن سے حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کا یقین دلایا گیا تھا، اس کے بعد قانون ازالہ حیثیت کے مطابق تین مجرموں کو اسی کوڑے کی سزا دی گئی، حضرت حسانؓ نے اپنے جرم کے کفارہ میں حضرت عائشہؓ کی منقبت میں چند شعر کہے، ان میں ایک کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکدامن ہیں، باوقار ہیں، مشتبہ نہیں ہیں، وہ بھولی بھالی عورت کے بدن کا گوشت نہیں کھاتی ہیں، یعنی غیبت نہیں کرتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے یہ سن کر کہا: یہ سچ ہے، مگر تم ایسے نہیں ہو، یہ واقعہ تہمت میں شرکت کی طرف تھا۔

اس واقعہ کو جس غلط انداز میں مستشرقین پیش کرتے ہیں، اس پر بھی سید صاحب نے بحث کی ہے، اور ان کی افتراء پردازی اور جہالت کا پول کھول کر رکھ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے لائف آف محمد میں واقعہ افک کے بیان میں عجیب وغریب تاریخی اور ادبی غلطیاں کی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ جنگ جمل کا ہے، جو اسلام کی تاریخ کا ایک المناک سانحہ بھی ہے، چودہ سال کے بعد بھی اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت یہی کہتی ہے کہ یہ جنگ نہ ہوتی، لیکن تاریخ کا جو فیصلہ ہو چکا وہ کسی حال میں بدلا نہیں جا سکتا، واقعہ تو صرف یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کی سزا چاہتی تھیں، لیکن اس کی انتہا جنگ جمل تک پہنچ گئی، اس زمانہ کے صحابہ کرامؓ کو بھی دکھ تھا کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا تھا۔ ایک طرف ام المؤمنین وحرم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری طرف نبی کا داماد۔ مگر جنگ

ہوکر رہی۔سید صاحب نے اس جنگ کی تفصیل تو تاریخ طبری ہی سے لی ہے،لیکن اس کو اس طرح قلمبند کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔سید سلیمان ندوی کی خوبی یہ ہے کہ اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے وقار کو قائم رکھا ہے۔اور اپنے ناظرین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ جنگ بالکل اتفاقی تھی ،اور متعددین جرم کے سوا دونوں فریق بےقصور تھے۔اس جنگ کے بعد حضرت عائشہؓ اپنی ندامت کا اظہار جس طرح کرتی رہیں،اور اس کو جس طرح سید صاحب نے قلم بند کیا ہے، اس سے ان کی عزت اور عظمت کے ساتھ ان کا وزن اور وقار اور بڑھ جاتا ہے۔سید صاحب نے اس جنگ میں حضرت عائشہؓ کی شرکت کو ایک اجتہادی غلطی قرار دیا ہے،جس کے متعلق وہ بعد میں خود سوچتی رہیں کہ انہوں نے اس کے ذریعہ اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ کہاں تک مناسب تھا۔اس کے لیے ان کو عمر بھر افسوس رہا۔سید سلیمان ندوی بھی لکھتے ہیں:

''ابن سعد میں ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں:''اے کاش! میں درخت ہوتی، اے کاش !میں پتھر ہوتی ،اے کاش !میں روڑ ہوتی ،اے کاش !میں نیست و نابود ہوتی۔'' ۲۲

سید سلیمان ندوی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اسلام میں عورتوں کا جو بلند رتبہ متعین کیا گیا ہے، یا انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کا ذکر کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے جس محنت اور دیدہ وری سے حضرت عائشہؓ کے دینی اور علمی فضل وکمال کی تفصیلات لکھی ہیں،اس کے مطالعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں حضرت عائشہؓ کا رتبہ بلند و بالا ہو جاتا ہے بلکہ کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''کتاب وسنت اور فقہ واحکام میں ان کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ سیدنا عمر فاروق ،علی مرتضٰی ،عبداللہ بن مسعود وسیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے ساتھ بےتکلف ان کا نام لیا جا سکتا ہے۔'' ۲۳

سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کو قرآن مجید کی ایک ایک آیت کی طرز قرأت، موقع استدلال اور طریقہ استنباط پر عبور کامل ہو گیا تھا۔سید صاحب لکھتے ہیں کہ وہ ہر مسئلہ کے جواب کے لیے

پہلے عموماً قرآن پاک کی طرف رجوع کرتی تھیں، عقائد فقہ اور احکام کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور سوانح کو بھی جو ان کے سامنے کی چیزیں تھیں، اور جن کا تعلق تاریخ وخبر سے ہے وہ قرآن ہی کے حوالہ سے پیش کرتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کو اپنی فطری ذہانت، قوت حفظ، قوت استنباط، فہم اور ذکا سے حدیث کی روایتیں بیان کرنے میں جو اہمیت اور فضیلت حاصل ہوئی، اس کا ذکر سید صاحب نے تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد اس قدر زیادہ کہ نہ صرف ازواج مطہرات بلکہ مردوں میں چار پانچ کے سوا کوئی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا، ان سے دو ہزار دو سو دس روایتیں منسوب ہیں۔ کثرت روایت کی تعداد کے لحاظ سے ان کا نمبر حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت انسؓ کے بعد ہے۔'' ۲۴

لیکن سید صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ''محض روایت کی کثرت ان کی فضیلت کا باعث نہیں، اصل چیز وقت رسی اور نکتہ فہمی ہے۔ قلیل الروایت میں زیادہ تر صرف روایت کش سمجھے جاتے ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ سے کوئی فقہی اجتہاد اور قرآن وسنت سے کوئی غیر منصوص مسئلہ کا استنباط ثابت نہیں اس مخصوص فضیلت میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ صرف عبداللہ بن عباسؓ شریک ہیں جو روایت کی کثرت کے ساتھ تفقہ، اجتہاد، فکر اور قوت استنباط میں بھی ممتاز تھے۔''
>
> ۲۵

سید صاحب یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ جن احکام اور واقعات کو نقل کرتی ہیں، اکثر ان کے علل واسباب بھی بیان کرتی ہیں اور خاص حکم جن مصلحتوں پر مبنی ہوتا ہے ان کی تشریح بھی کرتی ہیں۔ ان کی روایت کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب تک وہ واقعہ کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیتی تھیں اس کی روایت نہیں کرتی تھیں، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات ان کو سمجھ میں نہیں آتی تو

آپ صلی علیہ وسلم سے اس کو بار بار پوچھ کر تسکین کر لیتی تھیں۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''ان کی فضیلت اس میں بھی ہے کہ انھوں نے مسامحات سے نہ صرف روایتوں کو پاک رکھا بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، دوسروں کی روایتوں کی بھی تصحیح کر دیتی تھیں، انھوں نے اپنے معاصرین کے مسامحات کی دار و گیر نہایت سختی سے کی، اور ان کی غلط فہمیوں کی اصلاح کی۔'' ۲۶

سید سلیمان ندوی حضرت عائشہؓ کی اس فضیلت کے بھی قائل تھے کہ بعض مسائل کی نسبت صحابہؓ میں جو اختلاف روایت ہے وہ کسی قدر اختلاف فہم پر مبنی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے فہم و ذکاء سے اس اختلاف کو بڑی حد تک دور کیا۔ سید صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان میں قوت حفظ کے تفاوت مراتب کو بھی دخل ہے، اس معاملہ میں حضرت عائشہؓ عطیہ الٰہی سے بدرجہ اتم سرفراز تھیں، اور اسی عطیہ الٰہی کی وجہ سے ان کی روایتوں میں شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

سید سلیمان ندوی حضرت عائشہؓ کی فضل و کمال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کو طب، تاریخ، ادب خطابت اور شاعری میں بڑی دستگاہ حاصل تھی، ان بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں معلوم تھیں، لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاتی تھیں تو زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں بیمار رہا کرتے تھے، اطبائے عرب ان کی بیماری کے سلسلہ میں جو کچھ بتاتے، اس کو وہ یاد کر لیتی تھیں۔

سید سلیمان ندی نے حضرت عائشہؓ کی اشاعت تعلیم کی بھی تفصیل لکھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے علم اور تعلیم کی اشاعت کس طرح کی، لکھتے ہیں کہ لڑکے، عورتیں اور جن مردوں کا پردہ حضرت عائشہؓ سے نہ تھا، وہ حجرہ کے اندر آ کر مجلس میں بیٹھتے تھے اور لوگ حجرہ کے سامنے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھتے، دروازہ پر پردہ پڑا رہتا، پردہ کی اوٹ میں وہ خود بیٹھ جاتیں، لوگ سوالات کرتے، یہ جواب دیتیں کبھی کوئی مسئلہ بحث میں چھیڑتا اور استاد و شاگرد خاص موضوع پر گفتگو کرتے، کبھی خود کسی مسئلہ کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے، شاگردوں کی زبان، طرز ادا اور صحت تلفظ کی بھی سخت نگرانی کرتیں تھیں، ان عارضی طالب علموں کے علاوہ جو کبھی حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے وہ خاندان کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور شہر کے یتیم

بچوں کو اپنی آغوش تربیت میں لیتی تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کرتیں تھیں ۔جن صحابہ کرامؓ نے ان سے استفادہ کیا ہے، سید صاحب نے ان کے نام بھی گنوائے ہیں ۔جن غلاموں نے ان سے تعلیم پائی ان کی تعداد بھی بتائی ہے، جن عزیزوں کو تعلیم دی ان کے نام بھی لکھے ہیں ۔تابعین میں تقریباً ڈیڑھ دوسوان کے خوشہ چین ہوئے، جن پردہ نشینوں نے اس پردہ حرم سے فائدہ اٹھایا ان کے نام کے ساتھ سید صاحب نے ان کے حالات بھی قلمبند کردیے ہیں ۔

سید سلیمان ندوی نے ارشاد کا عنوان قائم کر کے یہ بتایا کہ حضرت عائشہؓ نے داعی مذہب کی آواز جب کبھی پست ہوتے دیکھا تو اس آواز کو بار بار کی صدائے بازگشت سے خاموش نہ ہونے دیا، یعنی جب کوئی غیر اسلامی اور غیر شرعی باتیں ہوتے دیکھتیں تو اپنے ارشاد سے روک دیتیں ۔

آخر میں سید سلیمان ندوی نے عالم نسوانی میں حضرت عائشہ ؓ کا درجہ متعین کیا ،اور لکھتے ہیں کہ وہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیمؒ کی طرح قائل ہیں کہ اگر نسبی شرافت کا اعتبار ہے تو حضرت فاطمہ زہراؓ سب سے افضل ہیں، اگر ایمان کی سابقیت ،اسلام کی ابتدائی مشکلات کے مقابلہ اور اس زمانہ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و تسکین کی حیثیت سے دیکھئے تو خدیجہ کبریٰؓ کی زندگی سب سے مقدم ہے، لیکن اگر علمی کمالات ، دینی خدمات اور آنحضرت صلی اللہ علہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کے نشر واشاعت کی فضیلت کا پہلو سامنے ہو تو ان میں صدیقہء کبریٰؓ یعنی حضرت عائشہؓ کا کوئی حریف نہیں ۔اس سلسلے میں نذر الحفیظ ندوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کتاب میں ہر سطر اپنے جلو میں دلائل وشواہد کا لشکر لیے ہوئے ہے ،لیکن کتاب کے اختتام پر عالم نسوانی میں حضرت عائشہؓ کے درجہ کے عنوان سے سید صاحب نے جو کچھ تین صفحے میں تحریر فرمایا ہے وہ بلاشبہ معلومات کی وسعت و تنوع اور گہرائی کے لحاظ سے شاہکار ہے، اس کے ساتھ اختصار و ایجاز کا اعجاز ہے۔'' ۲۷

سیرت عائشہؓ کے بارے میں ممتاز فاخرہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''مصنف نے تاریخی حقائق کا استعمال کیا ہے لیکن سوانح عمری کو تاریخ نہیں بننے دیا ہے۔انھیں اوصاف کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی سیرت

عائشہؓ قابل قدر سوانح عمریوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔'' ۲۸؎

بہر کیف یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت عائشہؓ کی اس سیرت سے بہتر، مفید تر اردو میں نہیں لکھی گئی۔

## حیات مالک:

سید سلیمان ندوی نے یہ کتاب ایک مضمون کی صورت میں شروع کی اور یہ ان کا زمانہ طالب علمی کا تھا۔ اس مضمون کو بڑھا کر ۱۹۱۷ء میں کتابی شکل دے کر شائع کی۔ اس کے لئے انہوں اپنے استاد محترم مولانا شبلی نعمانی سے مفید مشورے بھی خطوط کے ذریعے حاصل کیے۔ جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''معلوم نہیں امام مالک کے اجتہادات کو تم نے کس حد تک لکھا ہے۔'' ۲۹؎

دوسرے خط میں لکھا کہ:

''تم نے شروع کر دیا حیات مالک تو خیر ورنہ ابن تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے مجھے اس شخص کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں۔'' ۳۰؎

اس سوانح عمری کی تصنیف کی وجہ بتاتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے۔

''آج کل ملک میں علوم اسلامی کی طرف سے جو سرد مہری اور بے اعتنائی برتی جا رہی ہے، اور جو انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اس کی روک تھام کے لئے مصلحین کے سامنے مختلف صورتیں پیش ہیں۔ منجملہ ان کے ایک صورت یہ ہے کہ ملک میں تاریخ کا مذاق کسی قدر پیدا ہو گیا ہے، اکابر اسلام کی سوانح عمریوں کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ لکھی جائے اور اس ضمن میں ضروری مسائل کی تشریح کی جائے۔'' ۳۱؎

اور ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''مجھ کو علم حدیث کی ابتدائی طلب سے امام موصوف اور ان کی موَطا سے بدرجہ غایت عقیدت رہی ہے، اسی کا اثر تھا جس نے مجھے اس فرض کے

انجام پر آمادہ کیا۔'' ۳۲؎

اس سوانح عمری کی غرض وغایت پر جب نگاہ جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ سوانح عمری کے ماسوا اس کے مقاصد میں علوم اسلامی سے اس بے اعتنائی کو روکنا ہے جو انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ملک میں ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں انکشافِ ذات کے علاوہ ان باتوں پر بھی قوت صرف کی گئی ہے جن سے ان مقاصد کی تحصیل میں مدد ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نام ونسب اور ولادت کے ذکر کے بعد تعلیم وتربیت کے عنوان میں مدینہ کے فقہا، صحابہ، تابعین پر بحث ہے۔ اس کے بعد شیوخ کی ایک مکمل فہرست ملتی ہے۔ فضل وکمال اور علم وفقہ کے باب میں امام مالک کے جوہر پر روشنی ڈالنے کے بعد مجلسوں اور تلامذہ کا بالتفصیل ذکر ہے۔ آگے خلافت امویہ کے خاتمہ اور خلافت عباسیہ کے آغاز کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں خلیفہ منصور امام کے معرکوں پر تفصیلی بحث اور محاکمہ ہے۔ اس کے بعد امام کی مشہور اور معروف تصنیف ''مؤطا'' زیر بحث ہے۔ اس کی مختلف جہتوں سے اس کی توضیح کی ہے۔ جیسے کہ تالیف مؤطا کی وجہِ تسمیہ، موضوع، مؤطا اور دیگر ائمہ کے مجموعہ ہائے تصنیف، مؤطا اور کتب احادیث وطبقات، کتب حدیث میں ومؤطا کا درجہ، طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ، مؤطا کا بخاری اور مسلم سے موازنہ، مؤطا کے مختلف نسخے کی ضمنی سرخیوں کے تحت اس تصنیف پر مفصل بحث وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً آدھی کتاب مؤطا کی بحث پر مبنی ہے۔ اس درمیان میں کہیں کہیں امام کی مجلس حب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حب مدینہ، فیاضی، مہمان نوازی، استقلال، حلم وعفو، حق گوئی، خودداری، انصاف پسندی، اہل علم کی عزت، حلیہ، پوشاک اور مکان وغیرہ موضوعات مختصراً زیر بحث آئے ہیں۔

یہ سوانح عمری جس صورت میں طبع ہوئی ہے وہ نامکمل نہیں ہے۔ اس کے نامکمل رہنے کے بارے میں مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''طالب علمی کے زمانہ میں، میں نے اس کا سلسلہ شروع کیا اور جنوری ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں اس پر ایک مضمون لکھا، فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا، ابھی تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا کہ حضرت الاستاد نے وفات پائی اور دم نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ

کر سب سے پہلے سیرت النبی کی تکمیل کی جائے ۔اس بنا پر جہاں تک
''حیات مالک'' کی مسافت طے ہو چکی تھی۔قلم کا مسافر وہیں پہنچ کر رک
گیا اور اب آئندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل معلوم ہوتی
ہے۔اس لئے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اس کو وقف ناظرین کیا جاتا
ہے۔'' ۳۳

سید سلیمان ندوی کے نقطہ نگاہ سے اس تصنیف کا جوہر وہ اجتہادات ہو سکتے تھے جو امام نے انجام دئے ہیں اور جن کو سپرد قلم کرنے سے وہ رہ گئے ۔لیکن اس کمی کو بہت حد تک انھوں نے مؤطا پر تفصیلی بحث کے ذریعے پورا کر دیا ہے ۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مؤطا پر ایک مفصل کتاب تصنیف کرنا چاہتے ہیں، اس لئے شخصی احوال و آثار کے ضمن میں بہت اختصار برتا گیا ہے ۔نام ونسب وولادت کے سلسلے میں کل تین صفحات ملتے ہیں ۔ان صفحوں میں امام کے سن پیدائش اور ولادت کے بارے میں بعض اغلاط کی نشان دہی کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش بھی ملی ہے ۔سن پیدائش کے بارے میں لکھا ہے:

''امام کی ولادت کا سن مختلف فیہ ہے ۔مؤرخ یافعی نے طبقات الفقہا میں
۹۴ ہجری لکھا ہے ، ابن حلعان نے ۹۵ ہجری بتایا ہے لیکن صحیح تاریخ
ولادت ۹۳ ہجری ہے جیسا کہ محدث ذہبی نے تذکرہ میں تصریح کی ہے
اور سمعانی نے انساب میں اس کو اختیار کیا ہے، کہ یہ تاریخ بسند امام کے
شاگرد خاص یحیٰ ابن بکیر سے مروی ہے ، جو مدتوں امام کی صحبت میں
رہے ہیں۔'' ۳۴

بعض بزرگان نے لکھا ہے کہ امام شکم مادر میں تین برس تک رہے اور اسکو ان کے فضائل وکمالات میں شمار کیا ہے مگر سید صاحب اس کو ان کے فضائل وکمالات میں شمار نہ کر کے اس کی سائنسی توجیح کرتے ہیں ۔ان کے اس رویے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ امام مالک سے نہایت عقیدت رکھنے کے باوصف کوئی مدحیہ سوانح عمری لکھنے کے حق میں نہیں ہیں ۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سوانح نگاری میں واقعیت اور صداقت کے راز سے بخوبی واقف ہیں ، بہر کیف امام کے شکم مادر میں تین برسوں تک رہنے کے قضیہ کو انھوں نے اس طرح حل کیا ہے:

''ابن سعد نے طبقات میں واقدی کی راویت سے بیان کیا ہے اور اسی کو
اور لوگوں نے بھی نقل کیا ہے کہ امام مالک تین برس تک شکم مادر میں رہے
،لیکن واقدی کی یہ روایت ہے اگر صحیح ہے تو غالباً اس کی غلط تعبیر طبعی
جہالت کا نتیجہ ہے ،عورتوں کو بعض عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جن
سے کبھی حمل کے تمام آثار ان پر طاری ہو جاتے ہیں اور وہ مدت تک باقی
رہتے ہیں۔اسی اثنا میں کبھی حمل حقیقی ہو جاتا ہے، ناواقف لوگ اس تمام
زمانے کو مدت حمل سمجھ لیتے ہیں۔'' ۳۵؎

امام کی تعلیم وتربیت کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مستند صحابہ کرام کے تربیت یافتہ حضرات سے علم وفضیلت کی دولت حاصل کی ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ ،عمر فاروقؓ ، حضرت عائشہؓ ،حضرت عبد اللہ بن عمرؓ ،حضرت ابن عباسؓ ،حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زید بن ثابت کی درسگاہوں سے فیضان حاصل کرنے والوں میں جن بزرگان دین کا نام مشہور ہے ان سب کی ایک فہرست پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ امام موصوف نے ان میں سے ہر ایک سے فرداً فرداً تعلیم وتربیت حاصل کی ،سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

''امام صاحب نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ وبہار تھا باستثنائے چند یہ
تمام بزرگوار درس وافتا' میں مشغول تھے امام نے ان میں سے اکثر سے
استفادہ کیا ،اور اس طرح مدینے کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ
اب صرف ایک سینے میں مجتمع ہو گیا اور اسی لئے امام دار
الہجرہ آپ کا لقب ہوا۔'' ۳۶؎

احادیث کے اخذ کرنے میں امام موصوف بہت سخت تھے۔کسی بزرگ سے حدیث اخذ کرنے سے قبل ان کے تقویٰ اور پرہیز گاری پر نگاہ رکھنے کے علاوہ ان کے فہم وادراک کو بھی تنقید کے ترازو پر تول لیتے تھے۔اگر کوئی بزرگ اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کے پاس موصوف پھٹکتے بھی نہ تھے۔اس سلسلے میں کئی روایتیں سید سلیمان ندوی نے اس سوانح عمری میں درج کی ہیں۔ان روایتوں کے مطالعہ سے یہ اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ احادیث کے اخذ واستفادہ کو امام موصوف بنا دیا ہے۔اس ضمن میں امام موصوف کا ایک قول حیات

مالک سے نقل کرتا ہوں:

''ابن وہب جو امام صاحب کے نامور شاگرد ہیں، ذکر کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے کتنے مقدس لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی ٹپک پڑتا اور بہت سے احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی، لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیوں کہ وہ صرف متقی وزاہد تھے اور یہ حدیث وروایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ علم وفہم اور پختگی کی حاجت ہے، وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا۔ جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسوں سے علم اخذ کرنا چاہئے۔'' [۳۷]

مندرجہ بالا عبارت میں احادیث کے اخذ کرنے کے لئے جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کی اتباع بعد کے اکثر محدثین نے کی ہے۔

محمد نفس ذکیہ اور منصور کی خلافت کے معاملے میں امام نے محمد نفس ذکیہ کا اسلئے ساتھ دیا کہ وہ حق پر تھے۔ اگرچہ محمد نفس ذکیہ کی قسمت یاور نہ تھی اور وہ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارے گئے، مگر امام نے اپنا موقف اس وقت بھی نہ بدلا حالانکہ منصور کی طرف سے امام کی بڑی خاطر مدارت ہوتی رہی مگر ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ کھلے عام کہتے کہ ''خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے'' کوئی عرض کرتا کہ ہم منصور کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے ہیں تو فرماتے ''منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام جبراً کیا جائے شرع میں اسکا اعتبار نہیں۔ حدیث ہے کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔

منصور نے جب اپنی خلافت کے ستونوں کو مضبوط کر لیا تو مدینہ میں اپنے چچیرے بھائی جعفر کو والی بنا کر بھیجا، جعفر نے لوگوں سے نئے سرے سے بیعت لینا شروع کی۔ امام مالک کی اطلاع کرائی کہ جبری طلاق کے سلسلے میں جو حدیث ہے اس سلسلے سے فتویٰ نہ دے لیکن امام اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اس طرح ان امور میں فتویٰ صادر فرماتے رہے۔ جعفر کے اشارے پر سلیمان نے ان کو ستر کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا امام

موصوف کو محکمہ امارت میں لائے گئے۔ان کے کپڑے اتارے گئے اوران کو ستر کوڑے لگائے گئے۔ پوری پیٹھ خون آلود ہوگئی۔ دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے۔اس کے بعد ان کو اونٹ پر بٹھا کر شہر کی گلیوں میں گھمایا گیا۔اس حالت زار میں بھی امام موصوف نے صداقت وحق کے دامن کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔گلی کوچوں میں ان کو گھمایا جاتا رہا اور وہ باآواز بلند فرماتے رہے "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ ابن مالک بن انس ہوں،فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں" جب ظالموں نے ان کو رہا کیا مسجد نبوی میں تشریف لائے اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کی۔اسی طرح کے اور بہت سے واقعات و واردات اس سوانح عمری میں تحقیق وتدقیق کے بعد درج ہوئے ہیں۔

امام مالک کے روابط مختلف حکمرانوں سے تھے۔بعض اوقات یہ حکمران ان سے خصوصی توجہ کے طالب ہوتے تھے مگر امام علم کے مدارج کو کسی بھی طرح گرنے دینے کے لئے تیار نہ تھے۔اس عنوان میں سید سلیمان ندوی نے کئی واقعات درج کئے ہیں ان میں سے ایک اس غرض سے درج کرتا ہوں کہ امام کی شان استغناء اور علم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> "۱۷۴ہجری میں رشید،امین اور مامون اپنے دونوں شہزادوں کو لیکر حج کے لئے آیا،رشید نے امام کو مؤطا کی املا کے لئے خود سراپردہ خلافت میں طلب کیا،امام صاحب نے بدستور انکار کیا،اور مؤطا کے بغیر تشریف لائے،رشید نے شکایت کی،امام صاحب نے فرمایا۔ہارون رشید! علم تیرے گھر سے نکلا ہے خواہ اس کو ذلیل کر خواہ عزت دے ہارون رشید متاثر ہوا،محمد الامین اور عبداللہ المامون دونوں شہزادوں کو لیکر مجلس درس میں حاضر ہوا وہاں طلبہ کا عام ہجوم تھا،رشید نے کہا "اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے امام نے فرمایا "شخصی فائدہ کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا" ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا،امام نے فرمایا" امیر المومنین تواضع پسندیدہ ہے" ہارون نیچے اتر گیا۔" ۳۸

حیات مالک میں پیش ہوئے ان واقعات نے اس کو امام مالک کی زندگی اور تبحر علمی پر ایک دستاویزی حیثیت دے دی ہے۔اگر چہ اس کی تصنیف کے پس پردہ سید سلیمان ندوی علوم اسلامیہ کی تاریخ اور فقہ ودین

کی شرح کرنا چاہتے تھے مگر امام کے اجتہادات کو پیش نہیں کر سکے۔اس کی وجہ انہوں نے دیباچے میں رقم کی ہے۔بایں ہمہ یہ سوانح عمری بعض معنوں میں بہت کامیاب ہے۔پہلی کامیابی اس کی یہ ہے کہ اس میں عقیدت اور پاسداری سے اجتناب برتا گیا ہے۔دوسری یہ کہ امام کے حالات اور واقعات کے ذکر و بیان میں صداقت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ان باتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جدید سوانح نگاری کے لوازمات سے سید سلیمان ندوی بخوبی واقف تھے۔اگر ان کے سر پر اپنے استاد کی وصیت کی تعمیل کا بار گراں نہ ہوتا تو شاید ایک زیادہ بہتر اور کامیاب سوانح نگاری ''حیات مالک'' کی شکل میں قارئین کے ہاتھوں میں ہوتی۔حیات مالک کے بارے میں ممتاز فاخرہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''جس طرح شبلی نے علوم مشرقیہ کو جدید روشنی میں لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا (ان کی الکلام، الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم) اس سلسلہ کی کڑی ہیں۔اس مقصد کی تکمیل ان کے شاگرد سلیمان ندوی نے حیات مالک لکھ کر کی۔اردو میں امام صاحب کی یہ پہلی مستند سوانح عمری ہے۔''
>
> ۳۹

یہ عرض کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ امام مالک فقہ حدیث کے جید عالم ہیں، ان کو امام الجہر ہ کا خطاب ملا ہے۔ایسی حالت میں ان کی سوانح عمری ان کی اس زبردست خصوصیت سے عاری کیوں کر ہوسکتی ہے۔کوئی بھی سوانح نگار ان کی زندگی کے اس پہلو سے بے توجہی برت کر ان کی کامیاب سوانح عمری نہیں لکھ سکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ امام کی ساری زندگی فقہ و حدیث کی تلاش و تحقیق میں گزری۔ان کی زندگی کا اگر کوئی محور تھا تو یہی تھا۔اس لئے ان کی زندگی کے نہاں خانے میں اترنے کے لئے ضروری ہے فقہ و حدیث سے بحث کی جائے ورنہ بصورت دیگر ان کی شخصیت کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔

## خیام:

عمر خیام فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے وہ اپنی رباعیوں کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہے۔اس کی رباعیوں میں زندگی اور اس کے متعلقات کے بہت سے گوشے روشن ہوئے ہیں۔مگر عام طور سے وہ ایک رند شراب اور سرخوش شاعر سمجھا جاتا ہے، اس وجہ سے اس کی شخصیت ادبی دنیا میں متنازعہ فیہ ہوگئی ہے۔اس امر پر روشنی

ڈالتے ہوئے خیام کے دیباچے میں سید سلیمان ندوی نے واضح لفظوں میں فرمایا ہے کہ:

''خیام کی نسبت ہر زبان میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس موضوع میں کوئی جدت باقی نہیں رہی ہے۔ تاہم میں نے اس پر قلم اٹھانے کی جرات کچھس کی صرف دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بعض واقعات تصانیف اور سنین کے متعلق مجھے کچھ کہنا تھا اور اپنی فکر و کاوش اور جد و جہد نئے نتیجے، اربابِ نظر کے سامنے پیش کرنے تھے دوسری یہ کہ اب تک لوگوں نے اس کو صرف اس کی رباعیوں ہی کے ذریعہ سمجھنا چاہا تھا جن کی تعین سراسر مشکوک ہے اور میں نے اس کو اس کی خاص فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ روشناس کیا ہے جن میں وہ بالکل ایک نیا شخص معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے کتاب کے آخر میں اس کی فلسفیانہ تصانیف کا حصہ بھی شامل کر دیا ہے تاکہ ہر شخص اس کو اس آئینہ میں دیکھ کر بہ آسانی پہچان سکے۔'' [۴۰]

یہ حقیقت ہے کہ فنکار صرف اپنی زندگی کے روز و شب کے واقعات ہی میں زندہ نہیں رہتا ہے بلکہ اس کے مزاج اور فطرت کی شناخت اس کی تصنیفات میں ہوتی ہے۔ سید سلیمان ندوی سوانح نگاری کے اس زریں اصول سے واقف تھے۔ اسی لئے انھوں نے اس کی سوانح عمریوں میں اس کی فلسفیانہ تصانیف کو بھی شامل کر لیا کہ لوگ اس کی روشنی میں خیام کی شخصیت کا مطالعہ کریں۔ اس بات سے قطع نظر کہ اپنی فلسفیانہ تصانیف میں خیام کی شخصیت اس کے خمریات سے مختلف نظر آتی ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف کے اس عمل نے خیام کی شخصیت کے بہت سے دبیز پردوں کو اٹھانے میں معاونت کی ہے۔

بہر کیف یہ سوانح عمری مطبع اعظم گڑھ سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی ہے، اگرچہ اس کے سرورق پر جو عبارت ملتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے اس کی تصنیف کل ہند اورنیٹیل کانفرنس پٹنہ منعقدہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس میں سنانے کے لئے ہوئی تھی۔ سید صاحب کے جملے ہیں:

''پیش نظر اوراق حقیقت میں آل انڈیا اورینٹل کانفرس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں بہ مقام پٹنہ ایک مقالہ کی حیثیت سے پڑھے گئے تھے قدر شناسوں نے توقع سے بڑھ کر حوصلہ افزائی کی تو خیال ہوا کہ رباعیات

کے کچھ اور مباحث بڑھا کر اس کو کتاب کی صورت میں شائع کر دیا

جائے۔'' [۴۱]

اگر چہ اس سوانح عمری کا سن طباعت ۱۹۳۳ء ہے مگر اس کی طباعت کا کام وسط ۱۹۳۲ء میں مکمل ہو گیا تھا مگر اس کو ہدیہ ناظرین اس لئے نہیں کیا گیا کہ خیام کے آخری رسالہ میزان الحکم کی صحیح اصل مہیا نہ ہوئی تھی، اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''اصل کتاب ڈیڑھ برس سے چھپی رکھی تھی مگر خیام کے آخری رسالہ میزان الحکم کی کسی صحیح اصل کی تلاش وجستجو اور حصول کے انتظار اور اس کی تصحیح کی کوشش میں طباعت کا کام رکا رہا۔ شروع دسمبر ۱۹۳۳ء میں بمبئ سے جب اس کے فوٹو آئے تو بقیہ کتاب کی چھپائی پوری کی گئی۔'' [۴۲]

واقعہ یہ ہے کہ اس سوانح عمری کی تصنیف میں سید صاحب نے اتنی ہی دقتِ نظر اور تحقیق وتلاش سے کام لیا ہے جتنی دوسری تصنیفات میں۔ سید صاحب کو تحقیق وتلاش کی خاص عادت ہے۔ کوئی بات وہ قیاساً نہیں درج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اپنی تصنیفات کو طبع کرانے کی جلدی بھی نہیں کرتے۔ مندرجات وہ ماخذات کی جب تک تحقیق وجستجو نہیں کر لیتے ان کو تصنیفات میں جگہ نہیں دیتے۔ ان باتوں نے ان کی تصنیفات کو علم وادب کی دنیا میں استناد کا درجہ بخشا ہے۔

یہ سوانح تصحیح اغلاط کے ساتھ پانچ سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کئی ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ ان ابواب کے تحت خیام سے متعلق واقعات وواردات پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، سوانح خیام کے ماخذ ومصادر پر ناقدانہ تبصرہ، واقعاتِ خیام کے چند سنین، خیام کا سال ولادت، خیام کی ولادت، وطن، نام ونسب، اہل و عیال، اخذ واستفادہ، فضل وکمال ملک شاہ اور دیگر سلاطین سے تعلقات، امرا وزرا سے تعلقات، معاصرین سے تعلقات ومباحث، وفات، قبر، تلامذہ، تصنیفات، شاعر خیام، فارسی رباعیات، عمر خیام کا مذہب، خیام کا مشرب ومسلک، خیام کی شراب، جعلی خیام استدراک واضافہ اس کے چند موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کے تحت خیام کی شخصیت اور زندگی کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر جگہ مولانا کی تحقیقی نگاہ نے نتائج کے اخذ کرنے میں روشنی بخشی ہے۔

سوانح خیام کے ماخذ ومصادر پر ناقدانہ تبصرہ کے تحت سید صاحب نے فرانسی مستشرق پروفیسر ہوئسما، روسی مستشرق والنٹین زوکوووسکی، انگریزی مستشرق ڈاکٹر ڈینی راس اور پروفیسر براؤن وغیرہ کی کتابوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

''اب ثابت ہو گیا ہے کہ خیام کے سوانح کی اصلی اور قدیم ترین ماخذات صرف تین ہیں۔ ایک بیہقی کی کتاب ''تاریخ الحکما'' جس کا مصنف خیام سے کم سنی میں ملا تھا اور اسکا باپ خیام کا دوست تھا اور خیام کا داماد خود اس کا دوست تھا۔ دوسری کتاب ''چہار مقالہ'' ہے جس کا مصنف نظامی عروضی سمرقندی ۵۰۶ ہجری میں اور اس کے پس وپیش خیام سے ملتا رہا تھا اور تیسری کتاب ''خریدۃ القصر'' ہے جس کا مصنف عماد کاتب اصفہانی غالباً خیام کی زندگی میں ۵۱۹ ہجری میں سلجوقیہ کے دارلسلطنت اصفہان میں پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ بقیہ تمام کتابیں جن میں خیام کے حالات ہیں وہ کم وبیش انھیں سے بعینہ یا حذف واضافہ کے ساتھ منقول ہے۔'' ۴۳؎

عام طور سے خیام کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نظام الملک اور حسن بن صباح کا ہمدرس تھا۔ تینوں امام فوق کے شاگرد تھے۔ تعلیم وتدریس کے دوران تینوں ہمدرسوں میں معاہدہ ہوا کہ جو کوئی کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوا اپنے دوسرے ہمدرسوں کو بھی مناصب دلائے۔ چنانچہ نظام الملک جب وزیر کے عہدے پر متمکن ہوا تو اس نے حسن بن صباح اور خیام کو بلایا۔ دونوں آئے اور ملک شاہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ حسن بن صباح نے بعض سازشوں کے ذریعہ نظام الملک کو برطرف کرانا چاہا، مگر وہ کامیاب نہ ہوا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد اس نے الموت میں اپنی جنت بسائی۔ سید صاحب نے مغربی مستشرقین اور مشرق محققین کے بیانات کو غایت تحقیق کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس ضمن میں کوئی نکتہ نہیں چھوڑا ہے اور تفصیلی بحث وتمحیص کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے:

''اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ ہمدرسی وغیرہ کی یہ داستان، سرگزشت کے ذریعہ سے ۶۵۴ ہجری کے بعد عالم وجود میں آئی اور قلعہ الموت سے

باہر کی تاریخ کا جز بنی ۔ یہی سبب ہے کہ اس زمانہ سے پہلے کی کسی تصنیف
کے کان اس داستان سے آشنا نہیں اور دفعتاً ساتویں صدی ہجری کے
اواخر اور آٹھویں کے اوائل سے ان تاریخوں کے ذریعہ سے جو تاتاری
دربار کے فاضلوں نے لکھی ہیں یہ کہانی ہر جگہ سنائی دیتی ہے ۔ اور ان
سے دوسرے تذکروں اور تاریخوں میں نقل ہو کر مشہور عالم ہو جاتی ہے ۔''
۴۴

اس طرح خیام کے سال ولادت سید صاحب متعدد سنین کی تردید کرنے کے بعد اس منطقی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی پیدائش ۴۴۰ھ ہو سکتی ہے ۔ اس ضمن میں انہوں نے رقم کیا ہے:

''وہ ملک شاہی رصد خانہ میں آنے سے پہلے سمرقند و بخارا میں پھرتا رہا
ہے اور وہاں کے سلاطین میں احترام پا چکا تھا اور نیز وہ ایک رسالہ حساب
لکھ کر چکا تھا اور کتاب جبر و مقابلہ کر چکا تھا اس لئے ملک شاہ کی ملاقات
اور بناء رص خانہ کے سال ۴۶۷ھ سے چھبیس ستائیس برس سے کم پہلے
پیدا نہ ہوا ہوگا تا کہ وہ علوم سے فارغ ہو کر ایک رسالہ اور ایک ایسی اہم
کتاب کی تصنیف کے قابل ہو سکے ۔'' ۴۵

''ان وجوہ سے یہ موزوں قیاس ہے کہ خیام کی ولادت کا تقریبی سال
۴۴۰ھ ہوگا ۔'' ۴۶

خیام کو مغرب میں ایک رند مشرب اور سرمست انسان کی حیثیت سے شہرت ملی ہے ۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اس نے زندگی میں زیادہ سے زیادہ سرخوشی حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے ۔ اس کے خمریات سے وہی شراب مراد لی گئی ہے جس کو صوفیانہ اصلاح میں ام الخبائث کہتے ہیں ۔ سید سلیمان ندوی نے اس کی رباعیوں میں الحاقی عناصر کی نشاندہی کی ہے ۔ پھر اس کی رباعیوں کے مختلف رنگوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ اس کے مذہب اور شراب و مسلک کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ اس کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ خیام بادہ پرست نہ تھا ۔ اس سلسلے میں سید صاحب رقم طراز ہیں:

''خیام جس شراب کا متوالا تھا وہ کون سی شراب ہے ۔ اس کے ساتھ اس
مقدمہ کو بھی شامل کیجیے کہ خیام کے جس قدر قدیم اور مستند سوانح نگار ہیں

ان میں سے کسی نے خیام کی بادہ پرستی و مے خواری کا ذکر کیا معنی اشارہ
تک نہیں کیا ہے۔ یہاں تک کہ کاتب اصفہانی، قفطی اور ابن دایہ جو خیام
کے دشمن تھے اور جنہوں نے اس پر الحاد وطبیعت پرستی کا الزام لگایا ہے
انہوں نے بھی اس کے اس وصف کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اب صرف
رباعیات کے حوالے سے جن کی نسبت اور تعین بہت کچھ مشکوک ہے اس
کو بادہ نوش کہنا مشکل ہے، اس کی رباعیوں کی صحت کا اگر یقین بھی کرلیا
جائے تو بھی یہ عامیانہ خیال درست نہیں کہ اس کی ہر رباعی میں شراب
سے وہی ''تلخوش'' مراد ہے جو صوفیوں کے محاورہ میں ''ام الخبائث''
ہے۔ اس لئے اس کی ہر اس رباعی کو جس میں بادہ جام وساقی کا ذکر ہے
تنہا شراب خانہ خمار نہیں کہہ سکتے۔'' ۴۷

سید صاحب لکھتے ہیں کہ خیام کی بعض رباعیوں میں میخواری و رندی کی تعلیم ملتی ہے ساتھ ہی ساتھ زہد وتقویٰ کا بھی۔ اس سلسلے میں بھی سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

''شاعر کے شعر میں ایسی لچک ہوتی ہے کہ جس مذاق کا آدمی جس خیال کو
دل میں رکھ کر پڑھتا ہے، اس کے مطابق معنی اس شعر میں اس کو نظر آتے
ہیں۔ خواجہ حافظ کے ایک ہی شعر میں ایک میخور کو رندی کی تعلیم اور ایک
پیر طریقت کو زہد و ترک سبق ملتا ہے۔ یہی حال خیام کی ان رباعیوں کا
ہے۔'' ۴۸

خیام کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تناسخ کا قائل تھا۔ اس سلسلے میں تاریخ الفی اور مخزن الغرائب میں بعض قصے گڑھے ہیں۔ اسی طرح دبستان المذاہب میں خیام کی ایک رباعی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش ملتی ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ سید صاحب نے اس سوانح عمری میں ایسے تمام خیالات کو باطل ٹھہرایا ہے۔ تناسخ کے سلسلے میں رقم کیا ہے کہ اس سلسلے میں جو واقعہ گھڑا گیا ہے اس کی حیثیت قصہ یا لطیفہ سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر خیام کی بعض رباعیوں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس پر لگایا گیا یہ الزام اپنے اندر شمہّ برابر حقیقت نہیں رکھتا خدا سے انکار کے بارے میں ان کا خیال، ملاحظہ ہو:

''جس نے خیام کی تصنیفات پڑھی ہیں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس الزام

کوقبول کر سکتا ہے؟ پھر یہ رباعی خیام کی متداول مجموعوں میں نظر آتی نہیں
آتی، بلکہ اس کے برخلاف اس کی تمام کتابیں حق تعالیٰ کے ذکر وجود سے
لبریز ہیں۔اس کی رباعیات کے جس قدر نسخے ملتے ہیں سب میں اس
کے الٰہیات کے بیشتر مضامین مشترک ہیں۔'' ۴۹؎

مندرجہ بالا جو باتیں عرض کی گئیں ہیں ان سے روشن ہوتا ہے کہ دنیائے ادب میں خیام ایک بہت بد قسمت فرد ہے۔ وہ ایک بڑا فلسفی، حساب دان اور ایک بڑا حکیم تھا۔اس کی حکمت، حساب دانی اور فلسفہ دانی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ فلسفہ وحکمت میں بوعلی سینا کے بعد اس کا شمار ہوتا ہے۔ایسی حالت میں فلسفہ وحکمت کی خوش وادی سے نکل کر شعر وشاعری کی تازہ اور شگفتہ دنیا میں اس لئے قدم رکھتا تھا کہ اس سے اس کو یک گونا مسرت ہوتی تھی مگر آج دنیا اسکے فلسفہ وحکمت سے ناواقف ہے اور شعر وشاعری اس کے لئے وجہ افتخار بنی ہوئی ہے۔اس پر طرہ یہ کہ اس کے اشعار میں الحاقی اشعار شامل کر کے اس کی شخصیت داغدار کی جاتی ہے۔ سید صاحب نے اس سوانح عمری میں ایسے تمام خیالات کو غلط محض قرار دیا ہے اور تحقیق وتفتیش کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ وہ ایک بڑا فلسفی، حساب دان اور حکیم تھا اس کتاب میں سید صاحب کا تبحر علمی ہر مقام سے جھلکتا ہے،ان مباحث نے اس سوانح عمری کو ایک علمی کارنامہ بنا دیا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالواسع

''اس کتاب سے خیام کے متعلق پھیلائی گئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ
ہوجاتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ کتاب محض سوانح حیات نہیں ہے بلکہ خیام کی
کارگزاریوں پر ایک مفصل اور مبسوط تصنیف ہے۔میرے خیال میں
مولانا کے سامنے محض سوانح عمری مرتب کرنے کا خیال نہ تھا بلکہ خیام
سے متعلق معلومات فراہم کرنی مقصود تھا۔یہ کارگزار اپنی جگہ پر مسلم ہے
اور یہ کتاب سوانح عمری کے مقابلے دوسری جہتوں سے زیادہ پسند کی
جائیگی۔'' ۵۰؎

## رحمتِ عالم:

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو تمام لوگوں کے لئے اسوہ کامل اور قابل تقلید نمونہ بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ کھلی کتاب کی طرح سب

کے سامنے عیاں ہے۔سید سلیمان ندوی کی زیرِ نظر کتاب بھی اسی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کی مختصر سی دستاویز ہے۔جس میں سید صاحب نے عبارت کی سادگی ،طرز ادا کی سہولت اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے تمام پہلوؤں کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے سید صاحب نے سیرت پر یہ کتاب مطبوعہ اعظم گڑھ سے ۱۹۴۰ء میں شائع کی ہے۔سید سلیمان ندوی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''دوستوں کی اسی فرمائش کی تعمیل میں یہ مختصر سی سیرت لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہیں اس میں عبارت کی سادگی ،طرزِ ادا کی سہولیت اور واقعات کے سلجھاؤ کا خاص خیال رکھا گیا ہے تا کہ چھوٹی عمر کے بچے اور معمولی سمجھ لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں ،اور اسکولوں اور مدرسوں کے کورسوں میں رکھی جا سکے۔'' ۵۱

رحمت عالم کو مکمل کرنے کی ذمہ داری سید سلیمان ندوی کے دوش پر ۱۹۱۴ء کے اواخر میں آئی۔اپنی تمام مصروفیات اور مشاغل سے کنارہ کش ہو کر سید صاحب نے اس کی تکمیل کے لئے اپنے کو وقف کر لیا۔اپنی بہت سی تصنیفات کو نامکمل حالات میں شائع کر دیا جیسا کہ حیات مالک کے دیباچے سے روشن ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رحمت عالم کی تکمیل کے دوران بچوں کے لئے اس موضوع پر ایک کتاب کی ضرورت سید سلیمان ندوی کو محسوس ہوئی۔بہت ممکن ہے انھوں نے رحمت عالم کے موضوعات ،،مندرجات کی تفصیلات و تشریحات کے پیش نظر آسان زبان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سیرت کی ضرورت محسوس کی ہو جو اپنی اندر اتنی سنجیدگی اور علمی مباحث نہ رکھتی ہو۔خود سید سلیمان ندوی نے اس امر کی طرف اشارے کئے ہیں۔ انھوں نے رقم کیا ہے:

> ''ایک زمانے سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے آسان ہو، پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے۔'' ۵۲

اس کتاب میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ملکِ عرب کے جغرافیائی

حالت، ابراہیم علیہ السلام کی نسل، کعبہ، اسمعیل کا گھرانہ، قریش، بنو ہاشم، عبد المطلب، انکی اولاد، عبد اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، پرورش، بی بی آمنہ کے پاس قیام، بی بی آمنہ کا انتقال، آپ کی پرورش میں عبد المطلب کا حصہ، عبد المطلب کا انتقال، ابو طالب کا آپ کی پرورش میں حصہ، حجاز کی لڑائی میں شرکت، مظلوموں کی حمایت کا معاہدہ، کعبہ کی تعمیر، سوداگری کا کام، تجارتی سفر، بی بی خدیجہ سے نکاح، آپ کا شرک اور برائی سے بچنا، اسلام کے پہلے مسلمان، پہلی عام شاعری، عام تبلیغ، حضرت حمزہؓ، حضرت عمرؓ اور ابو ذر غفاری کا مسلمان ہونا، غریب مسلمانوں پر ظلم وستم، حضرت صہیبؓ، حبش کی ہجرت، ابو طالب کی گھاٹی میں نظر بندی، ابو طالب اور بی بی خدیجہ کی وفات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصیبتیں، طائف کا سفر، قبیلوں کا دورہ، اوس وخزرج میں اسلام اور عقبہ کی بیعت، ہجرت کے واقعات، مسجد نبوی اور حجروں کی تعمیر، مکہ والوں کی شرارتیں اور سازشیں، منافقوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ، بدر کی لڑائی، اور حضرت فاطمہ زہرہ کا نکاح، عہد کی لڑائی، خندق کی لڑائی، حدیبیہ کی صلح، دنیا کے بادشاہوں کو اسلام کی دعوت، موتہ کی لڑائی، فتح مکہ، دین کی تکمیل، اسلامی نظام کی تاسیس، روزہ، نماز، زکوۃ، حج، حجۃ الوداع، وفات، ازواج واولاد، اخلاق وعادات ہے۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالئے تو روشن ہوگا کہ دین اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق کوئی واقعہ اس کتاب میں درج ہونے سے نہیں رہ گیا ہے۔ اس طرح سید صاحب کا یہ مقصد کہ کوئی بات چھوٹنے نہ پائے، بحسن وخوبی پورا ہوا ہے لیکن اس کتاب کی نمایاں خصوصیت اس کی زبان اور طرز بیان ہے۔ الفاظ بہت ہی سادہ ہیں اور کسی پیچیدگی کے بغیر اپنے مفہوم واضح کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے واقعات اور مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کے تمام تفصیلات کے ساتھ بڑے مؤثر اور دلچسپ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان امور کے اظہار میں سید سلیمان ندوی نے جو اندازِ نگارش اختیار کیا ہے اس کی مثال کے طور پر چند جملے نقل کرتا ہوں:

> ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہالی رشتے دار بنونجار ہتھیار لگا کر آپ کو لینے آئے۔ قبا سے شہر مدینہ تک ہر قبیلے کے معزز لوگ دورویہ کھڑے تھے آپ جس قبیلہ کے آگے سے گزرتے وہ عرض کرتا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم گھر، یہ مال، یہ جان حاضر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم

شکریہ ادا کرتے دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آیا تو مسلمانوں کے جوش کا
یہ عالم تھا کہ عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں''

طلع البدرُ علینا من مثنیات الودع

چودھویں کا چاند ہمارے سامنے نکل آیا۔ وداع کی گھاٹیوں سے۔'' ۵۳؎

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کو مکمل کرنے کی غرض سے مبعوث ہوئے۔ چنانچہ ان کو ایک ایسے خطہ اور ایک ایسی قوم میں نبی بنا کر بھیجا گیا تھا جو خوں ریزی، آپسی دشمنی، خاندانی بغض وعناد اور طرح طرح کی اخلاقی کمزوریوں میں ملوث تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی مرضی سے شمع ہدایت روشن کی اور بہت جلد پروانے شمع ہدایت کے ارد گرد اکھٹا ہوگئے، بہت کم مدت میں جو قوم دنیا میں ذلیل وخوار تھی سر بلند و معزز ہوگئی۔ ساتھ ہی دین کی تکمیل بھی ہوگئی۔ اس لئے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیت کی گھڑی قریب آئی تو انھوں نے اس بات میں بڑی طمانیت محسوس کی کہ ان کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ لوگ ان کے بتائے ہوئے راستے پر عمل پیرا ہیں انھوں نے اپنے پیچھے ایک ایسی جماعت تیار کر دی ہے جو ان کے بعد دین حق پر قائم رہے گی۔ اور اس طرح ان کی ہدایت کی شمع روشن رہی گی۔ یہ خیال کتنا مسرت بخش ہے اور اظہر من الشّمس ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرتے وقت ایسا لگتا ہے کہ سید سلیمان ندوی مسرت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اپنی وفات کے چند روز قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کا پردہ ہٹا کر نماز فجر کا نظارہ کیا تھا اور اپنے صحابہ کو نماز میں مشغول پا کر مسکرا دئے تھے۔ اس موقع پر سید صاحب نے یہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کے وقت پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی
نماز میں مشغول تھے۔ دیکھ کر مسکرادئے کہ خدا کی زمین پر آخر وہ گروہ پیدا
ہوگیا جو رسول کی تعلیم کا نمونہ بن کر خدا کی یاد میں لگا رہے۔'' ۵۴؎

چنانچہ اس سوانح عمری کی خوبیوں کے پیش نظر ڈاکٹر عبدالواسع نے خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''اس کتاب کے مندرجات اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ کتاب جس
مقصد کے تحت لکھی گئی تھی وہ مقصد بہر حال پورا ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق واقعات کی تفصیل بڑے اختصار سے درج

ہوئی ہے۔واقعات کے اندراج میں تناسب کا غایت خیال رکھا گیا ہے۔
تفصیل کی جگہ پر وضاحت برتی گئی ہے اختصار کی جگہ پر اختصار۔یہ ہے
کہ کچھ واقعات کا ذکر محض اشاروں میں ہے۔اس طرح یہ کہنا درست
معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر رحمت
عالم بہترین کتاب ہے۔'' ۵۵

اس سلسلے میں ڈاکٹر الطاف فاطمہ کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیں:

''موضوع سیرت ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں بہت کچھ
لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا ہے۔اس کے متعلق مواد اور معلومات کا لا انتہا
ذخیرہ موجود ہے۔مصنف نے اس میں بڑے سلیقہ اور ہنر مندی سے
انتخاب کیا ہے اس طرح کہ تمام اہم اور جزئیاتی واقعات بھی آ گئے اور
کتاب میں بے جا تفصیل اور طوالت بھی نہیں پیدا ہوئی۔بجائے اس
کے کم سن یا نو آموز قاری اکتا جائے۔اس کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔
واقعات کا حسن انتخاب اس کتاب کی خوبی ہے۔'' ۵۶

ممتاز فاخرہ حیات مالک کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مختصر یہ کہ واقعات کے تسلسل، استناد اور دلچسپی معلومات کے اعتبار سے
رحمت عالم ایک اچھی سوانح عمری کا درجہ رکھتی ہے۔'' ۵۷

ان خوبیوں کے ساتھ اس سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان بہت ہی سادہ، دلکش اور دل نشین ہے۔اس کتاب سے چند اقتباسات اوپر درج ہوئے ہیں ان سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ سوانح عمری کے لحاظ سے یہ ایک کامیاب سوانح عمری ہے۔اگر چہ اس کی تصنیف نو عمر بچوں کے لئے ہوئی ہے مگر یہ ان اصحاب کے لئے بھی بڑی مفید اور کار آمد کتاب ہے جو شبلی کی سیرت النبی اور اس قسم کی دوسری ضخیم اور تحقیقی سوانح عمری کے مطالعہ کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔بہت مختصر طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور دین اسلام سے متعلق اہم باتوں کا اندراج اس میں ہو گیا ہے۔اس لئے یہ ایک بہت ہی کامیاب سوانح عمری ہے۔

## حیاتِ شبلی:

علامہ سید سلیمان ندوی کی سب سے اہم اور مشہور سوانح تصنیف ''حیاتِ شبلی'' ہے۔ جس میں سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی سوانح حیات مرتب کی ہے۔ مولانا شبلی کی زندگی میں مختلف لوگوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا۔ افتخار عالم صاحب مارہروی خصوصاً اس کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے سفارش کرائی کہ مولانا شبلی انھیں ان کے سوانح لکھنے کی اجازت دیدیں۔ مولانا نے اس کے جواب میں سید صاحب کو فروری ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھا کہ:

> ''افتخار عالم صاحب میرے لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا۔'' ۵۸؎

افتخار عالم صاحب کو شبلی نعمانی اپنی سوانح حیات لکھنے کی اجازت نہ دی اس کے متعلق سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں ابوالکلام آزاد کے خطوط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ہاں اور سنو افتخار عالم صاحب مولوی نذیر کی لائف لکھ کر انھیں آلودہ ہاتھوں سے حیاتِ شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگیں ہیں ، میں نے لکھ دیا ہے، کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوایئے بھئی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی۔'' ۵۹؎

یہ واقعہ ہے کہ مولانا ان کی سوانح عمری لکھنے کے سب سے زیادہ مستحق سید صاحب ہی تھے۔ ان کی زندگی کے آٹھ سال ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۲ء تک خلوت وجلوت میں شبلی کے ساتھ گزرے تھے۔ انھوں نے ان کو ہر رنگ میں دیکھا تھا، پھر شبلی کی زندگی کے یہ آٹھ سال انکی ۵۷ سالہ زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ سید صاحب کے پیش نظر رہی۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے اس کام کو واقعی اس وقت انجام دیا جب دنیا کے اور کاموں سے ان کو بڑی حد تک فرصت مل گئی تھی۔ چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری اہم تصنیف ہے اور اس پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

شبلی کی سوانح لکھنے کے لئے سید صاحب نے متعدد ذرائع سے فائدہ اٹھایا ابتدائی اور خاندانی حالات ان کے اعزاواحباب اور شاگردوں سے پوچھے۔تعلیمی حالات خود مولانا سے وقتاً فوقتاً سنتے رہے۔علی گڑھ کے قیام کے حالات کا بڑا حصہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے پرانے اوراق سے بہم پہنچااوران کی پوری علمی زندگی کا خاکہ ان کے مکاتب کے مرقع میں باآسانی مل گیا۔مولانا کی سوانح کی تالیف اور واقعات کی ترتیب اور تاریخوں کے تعین میں مکاتب کی دونوں جلدیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں،سب سے زیادہ اہم بات اس سلسلے کی یہ ہے کہ سوانح لکھتے وقت مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی جومولانا کے حبیب مکرم تھے،موجود تھے جن سے واقعات کی تحقیق میں مدد ملی اس طرح مولانا کے علی گڑھ کے پرانے دوست میر ولایت حسین خان نے بھی قیام علی گڑھ اور تعلقاتِ سرسید کے کچھ واقعات لکھ کر بھیجے وہ سب ذرائع تھے جن سے لائق مصنف نے اس ضخیم سوانح کے لکھنے میں فائدہ اٹھایا سید صاحب شروع میں لکھتے ہیں:

> ’’خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہوا سکو بے کم وکاست سپرد قلم کردیا جائے۔مولانا کی سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے بہت کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر ہی ان کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہے، اس لئے کوئی سوانح نگار نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نہ کسی ایک فیصلے کے متعلق سب کی رائیں ایک ہوسکتی ہے کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بد گمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہے لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتِ فطرت کے مطابق ہے اوراس میں معتقد ومنتقد دونوں معذور ہیں فمن الرضا عن کل

عیب کلیلۃو لکن عین السخط تبد ی المسا ویا

بہر حال شبلی شبلی تھے، جنید، وشبلی نہ تھے۔''۶۰؎

حیات شبلی کی ابتدا ترتیب مواد اور معاونین کے ذکر سے ہوتی ہے اس کے بعد دیباچہ اور مقدمہ ہے، معلوم نہیں مولانا نے دیباچہ اور مقدمہ کے الفاظ الگ الگ مفہوم میں کیوں استعمال کئے ہیں یہ دونوں ایک ہی مفہوم کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ بہر حال دیباچہ میں مولانا کی زندگی پر جامع تبصرہ ہے مقدمہ میں دیار پورب اور لکھنؤ کے بعض علماء اور اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کے حالات ہیں اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، مولانا کی ولادت، حسب نسب، تعلیم وتربیت اور ابتدائی مشاغل زندگی کا بیان ہے پھر ۲۵ سال کی عمر میں علی گڑھ سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور زندگی سولہ سال کے دو ادوار پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلا دور ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۸ء ہے جو ایم اے او کالج کے علمی و تعلیمی کاموں اور قومی مشاغل تصنیفی مصروفیات، روم وشام سفر، شمس العلماء کا خطاب، ندوہ میں شمولیت، وظیفہ حیدر آباد وغیرہ پر مشتمل ہے دوسرا دور سرسید کی رحلت اور کالج سے قطع تعلق سے شروع ہوتا ہے، یعنی ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۴ء تک۔ اس دور میں درستی صحت، عقد ثانی، ملازمتِ حیدر آباد، شغلِ تصنیف، تحریک ندوہ کی رہنمائی، حیدر آباد سے استعفٰی، معتمدی دار العلوم ندوہ اور اس کی ترقی کے لئے جد وجہد خانگی حادثہ گزندپا، بمبئی کا قیام، ندوہ میں رفقاء سے اختلاف علاحدگی، مطالبہ اصلاح، تعلیمی ومذہبی اور قومی خدمات ومصروفیات تالیف سیرت النبی، تاسیس دار المصنفین اور وفات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ آخر میں آل واولاد اور اخلاق وعادات کا حصہ ہے۔ سید صاحب نے مولانا شبلی کو ''عہد جدید کا معلم اول'' قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کے عہد میں ایک نئے دور کی بنیاد پڑی اس لئے وہ قدیم اور جدید کے ایک سنگم تھے، جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے اور اسلئے ان کی زندگی کے کارنامے گذشتہ علماء دین کے کارناموں سے نسبتاً مختلف ہیں۔ وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید وآراو خیالات سے واقف بھی تھے قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید تعلیم کے ارکان اور جدید تعلیم یافتوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ ساتھ ہی محققِ فن بھی تھے۔ ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشاء پرواز بھی

تھے، خطیب بھی تھے مؤرخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، سیاسی
بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانے کیا قتضات اور مطالبات کے
مقابلے میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے اور یہ سب گوناگوں
رنگ ان کی زندگی کے مرقع میں نمایاں ہیں۔'' ۶۱؎

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سید سلیمان ندوی نے دیباچہ حیات شبلی کے ابتدائی چالیس صفحات میں مولانا شبلی کے کارناموں کی اہمیت اور اولیت پر روشنی ڈالی ہے۔ سید صاحب کتاب کے شروع میں رقم طراز ہیں:

'' نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری
نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی،
تعلیمی، مذہبی، اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔'' ۶۲؎

سید صاحب کا یہ دعوی بالکل صحیح ہے اور دیباچہ میں انھوں نے شبلی کی جامعیت پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ شبلی کی شخصیت مختلف حیثیتوں کی حامل تھی وہ بیک وقت مؤرخ، متکلم، ادیب اور شاعر تھے، مسلمانوں کی تعلیم سے خواہ وہ جدید ہو یا قدیم انھیں بہت دل چسپی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تعلیمی اسکیموں بنانے درسی نصاب کی اصلاح، عربی و فارسی کی اہمیت اور انگریزی کی ضرورت مسلمانوں کو بتانے میں انھوں نے اپنی تصانیف اور مضامین سے بہت کام لیا۔ انھوں نے اپنی تقریریوں سے سوتے ہوئے لوگوں کو بیدار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب کو ان کے عہد کی سیاسی، قومی، علمی وادبی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت پڑی اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں اس امر کو ماننا پڑے گا کہ حیات شبلی اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

دیباچہ کے بعد ایک طویل مقدمہ ہے جو پچاس صفحے کے لگ بھگ ہے۔ اس میں سید صاحب نے یورپ کے علماء وفضلاء کا ذکر بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے۔ ان مدرسوں کا ذکر کیا ہے جن کے دم سے علم کی شمع ان علاقوں میں روشن تھی اس سلسلے میں سید صاحب نے سینکڑوں کتابوں، رسالوں، کتب خانوں، اور علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے اس مفصل داستان کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ آل احمد سرور اس مقدمہ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''یہ بحث علاحدہ کتاب میں ہوتی یا مختصر طور پر آتی تو زیادہ بہتر تھا۔ حیات

شبلی میں اتنی تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔'' ۶۳؎

آل احمد سرور کا یہ اعتراض اپنی جگہ پر صحیح ہوسکتا ہے لیکن اس مقدمہ کی وجہ سے اس کتاب میں جو وزن اور وقار پیدا ہوا وہ اردو کی بیشتر سوانح عمریوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اس مقدمہ میں جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں۔ اس سے سوانح نگار کی نہ صرف علمیت اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس خطہ کی ایک روشن تصویر سامنے آجاتی ہے جس سے مولانا شبلی کا تعلق رہا۔

سید صاحب نے مولانا شبلی کو جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے ''عہد جدید کا معلم اول'' قرار دیا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ مشترقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو ''شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی تھے''۔ فارسی شاعری میں نئ شاعری کی بنیاد شبلی نے ڈالی۔ آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جارہا ہے اس کا مواد 'الفاروق' سے لیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں وہ اتحاد کے داعی اول تھے۔ سیاسی مسائل سے حضرات علما کو جو دلچسپی ہے وہ شبلی کی پکار کا نتیجہ ہے۔ اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو حکومت کے سامنے پیش کر کے تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچایا۔ سید صاحب حیات شبلی میں شبلی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> مشترقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو ''شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی تھے''۔ انہوں نے فارسی شاعری میں نئ شاعری کی بنیاد ڈالی آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جارہا ہے اس کا سارا مواد 'الفاروق' سے لیا جارہا ہے۔ ہندوستان میں وہ اتحاد کے داعی اول تھے۔'' ۶۴؎

شبلی کے خیال کے مطابق:

> ''سوانح عمری ایسی لکھنی چاہئے جس سے صاحب سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے۔'' ۶۵؎

حیات شبلی کے اوراق سے شبلی کی سیرت وعظمت کا پایہ بلند نظر آتا ہے۔ کتاب کی حسن ترتیب، مصنف کا عالمانہ اسلوب بیان، حوالوں کی کثرت، معلومات کی فراوانی اور شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کتاب کے گوناں گوں حسن اور سید صاحب کی کامیابی کے بہترین ضامن ہیں۔ بقول پروفیسر محمد ڈار:

''اس ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے۔اس
کتاب کی کامیابی کا ایک سبب مصنف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب
کے صفحات پر جابجا ہے۔حیات شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار
سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔'' ۶۶

رشید احمد صدیقی نے حیات شبلی کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''سید صاحب کو اپنے استاد علامہ مرحوم سے بڑی عقیدت تھی سیرت لکھ کر
سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کا سبب اتنی نہیں ہے جتنی اس شفقت کی
بنا پر ہے جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق محترم استاد
سے ہوسکتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی
دیکھنا نہیں چاہتا یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔'' ۶۷

سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ان کے بشری نقائص بھی بیان کیے ہیں۔لکھتے ہیں کہ:

''اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقیا اور مذہبی
تورع اور تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے،نہیں تھا۔'' ۶۸

صرف یہی نہیں سید صاحب کے مطابق شبلی کی بعض تصانیف میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ ''الفاروق'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''الفاروق'' کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی
روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا۔''۶۹

سید صاحب تحقیق کے مرد میدان تھے اور وہ اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ انداز بیان کے لئے مشہور ہیں،لیکن ان کی تحریر ادب وانشا کے بہترین نمونوں سے بھری پڑی ہیں۔یہاں صرف چند مثالیں حیات شبلی سے دی جاتی ہیں۔حیات شبلی کی ابتدائی تحریر ملاحظہ ہو:

پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں،جس نے بتیس
برس۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی
اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب کیا۔اپنی شعلہ نفسیوں سے

گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا۔'' ۷۰؎

ہندوستان میں فارسی زبان میں نئی شاعری کے بارے میں سید صاحب شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو کی نئی شاعری کی بنیاد خواہ مولانا نے ڈالی ہو یا شمس العلماء مولانا آزاد نے۔ مگر ہندوستان میں فارسی شاعری کی بنیاد بلاشبہ مولانا شبلی نے ڈالی، اور اس میں خیالات، قومی احساسات اور مذہبی جذبات کا ایسا زور بھرا کہ صرف زبان کی چاشنی اور محاوروں کی صحت کے نشہ کی جگہ جیسا کہ اب تک وہ تھی مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے آب حیات بن گئی۔''

۷۱؎

سید صاحب کے بعض چھوٹے چھوٹے جملے دلآویزی اور تاثیر کے اعتبار سے بلاغت کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ مثلاً مفتی عنایت احمد کے بارے میں جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بغاوت کے الزام میں انڈمان بھیجا گیا تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شرین اسی طرح ابلتا رہا۔'' ۷۲؎

دارالعلوم ندوہ میں تفسیر کے کمرے کی تعمیر میں شبلی اور ان کے ہونہار شاگردوں نے جس ذوق وشوق سے حصہ لیا ہے۔ سید صاحب اس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عمارت کی ہر اینٹ ان کی امید و آرزو کی ایک لوح تھی۔ اس خوش منظر قطعہ میں بھری ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے، کبھی دوسروں کو لے جاتے۔'' ۷۳؎

بمبئی اور دستہ گل کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میری یاد میں قیام کی غرض سے مولانا کا یہ سفر بمبئی پہلا تھا، اور یہی ''دستہ گل'' کی عطر بیزی اور مشام پروری کا زمانہ تھا، دستہ گل کی ابتدائی غزلیں اسی موسم بہار کے پھول ہیں۔ نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ ونو را مولانا کو انیس برس کے بعد غزل کا کوچہ یاد آیا تھا۔'' ۷۴؎

اسی بیان میں آگے لکھتے ہیں:

''یہ غزلیں اتنی ،مست تھیں کہ مولانا حالی نے ان کو حافظ کی غزلوں کے برابر رکھا اور قیاس فرمایا کہ اس میں چشمِ ساقی کی مستی بھی آمیز ہے۔خود شاعر نے بھی اپنے اعتراضات کا مغالطہ آمیز موقع رکھا ہے۔آن شد اے دوست کہ درندوہ بہ بینی  بازم کہ دم از صحبتِ آن دشمن ایمان زدہ ام وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس دشمن ایمان کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی کہ وہ علی گڑھ تحریک سے الگ ہوکر ندوہ میں شامل ہوگئے۔'' ۵ے

شبلی کی تجہیز و تکفین کا ذکر کرنے کے بعد،سید صاحب اس موثر انداز میں اپنے استاد کو خطاب کرتے ہیں:

''استاد بزرگوار! جاجا اور سایہ رحمت میں آرام کر ،دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈے گی ،لیکن نہ پائے گی ،لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منتظر ہمیشہ نظر آتا رہے گا۔

بعداز وفات تربت ماورز میں محودرسینہ ہائے مردمِ عارف مزارما۔'' ۶ے

حالی کی حیات جاوید کے متعلق شبلی نے مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ۷ اگست ۱۹۰۰ء کے ایک خط میں اسے ''کتاب المناقب اور مدلل مداحی'' قرار دیا۔

''حیات جاوید'' کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں۔اور وہ بھی غیر مکمل۔خیر والناس فیما یعشقوں مذاہب۔'' ۷ے

دوسری مرتبہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۶ء کے ایک خط میں لکھا:

''حیات جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بد طینتی ہے،لیکن اگر یہ صحیح ہوتو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہوجائیں۔بہر حال میں حیات جاوید کو ''مدلل مداحی'' سمجھتا ہوں۔''

۸ے

حیات شبلی کی اشاعت کے بعد بھی وہی صدا گونجی۔سخن فہم حضرات نے اسے بھی ''مدلل مداحی'' کہا، اور شبلی کے مذکورہ بالا تبصرہ کی روشنی میں اس کتاب کا جائزہ لیا۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار نے حیات شبلی پر تبصرہ کرتے ہوئے

اسے بھی مدلل مداحی کہا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''حیات شبلی کے کتاب المناقب ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔آخر یہ ضرور ہے کہ محاسن اور معائب کا توازن قائم رکھ کر ہیرو کی داستان کو''کتاب المحاسن والمساوی'' بنادیا جائے۔حیات شبلی میں مدلل مداحی سے کام لیا گیا ہے۔اور بہت سے اختلافی ونزاعی امور میں پوری واقفیت دلائل کے ساتھ شبلی کے طرز عمل کو حق بہ جانب ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن اس بحث میں سید صاحب کی حیثیت بعض اوقات محض ایک طرفدار کی سی رہ جاتی ہے۔اور وہ ایک کامیاب مناظر کی طرح مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہیں۔'' ۷۹؎

آل احمد سرور اپنے ایک مضمون حیات شبلی ایک تبصرہ میں لکھتے ہیں:

''سید سلیمان ندوی نے شبلی سے جو کچھ سیکھا تھا یہ کتاب لکھ کر اس احسان کا بدلہ دیا ہے۔یہ ایک طور پر سرکاری یا (OFFICIAL) سوانح عمری ہے۔'' ۸۰؎

سید صاحب پر طول کلام کا اعتراض بھی عائد کیا جاتا ہے۔پچاس صفحات کا مقدمہ،ندوے کے واقعات،قراردادوں اور تجاویز کا مفصل بیان،شبلی کے پاؤں کے حادثہ پر قصائد ونظموں کی زیادتی،سرسید کی انگریز پرستی پر اعتراض،لیکن گورنر ہیوٹ کی ندوہ کا سنگ بنیاد رکھنے پر دبی زبان سے تعریف،حیات شبلی میں خواتین بمبئی کے ذکر سے یکسر اجتناب،شبلی کی کتابوں پر بغیر کچھ لکھے ہوئے گزر جانا۔یہ سب خامیاں بھی بتائی جاتی ہے۔

حیات شبلی میں سرسید اور شبلی کے اختلافات کو جس رنگ میں پیش کیا گیا وہ علی گڑھ طبقہ کی ناگواری کا باعث بن گیا۔اور ہر قاری یہ بات سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ سید سلیمان نے سرسید کے ساتھ ناانصافی کی اور شبلی کو

ان سے برتر ثابت کرنے کی سعی کی۔

شبلی جس ادبی کارواں کے رکن تھے۔سرسید اس کے مہر کارواں تھے۔بلکہ سرسید محور تھے اور باقی اس کے گرد گردش کررہے تھے۔لیکن سید سلیمان ندوی نے اپنے ممدوح کو سرسید کے مقابل ٹھہرایا،اور بعض مقامات پر شبلی کو سرسید پر فوقیت دیدی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شبلی نے جو تنقید حیات جاوید پر کی تھی،وہی تنقید حیات شبلی پر بھی کی جاسکتی ہے۔دونوں مصنفین نے پیش از پیش اپنے ممدوحین کی تعریفیں کی ہیں اور ان کی خامیوں کا برائے نام ذکر کیا ہے۔

جہاں تک سرسید پر تنقید کا سوال ہے آل احمد سرور کی رائے بہت صحیح ہے:

''شبلی نے علی گڑھ پہنچ کر بہت ترقی کی تھی،وہ سرسید سے بھی آگے دیکھ رہے تھے'' ۸۱

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

''اکرام نے موجِ کوثر میں شبلی کو سرسید کا مد مقابل قرار دیا ہے یہ بات صحیح نہیں،شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں اس کی اصلاح کرنا تھا،اگر حیات شبلی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوجائے گی۔'' ۸۲

آل احمد سرور کا یہ اقتباس جس سے شبلی کی جامعیت پر پوری روشنی پڑتی ہے،نذر ناظرین کیا جاتا ہے:

شبلی کا اثر حالی کی طرح صرف ادب پر نہیں پڑا،پوری ذہنی زندگی پر پڑا،اپنے دور میں وہ سب سے رنگین،جاذب نظر اور جامع شخصیت رکھتے ہیں۔وہ اگرچہ ایک لحاظ سے سرسید سے قدیم ہیں لیکن آخر دور کے سرسید کے مقابلے میں زیادہ حریت پسند ہیں،انھوں نے ہمارے ادب میں علم کی گہرائی اور علم میں ادب کی تازگی اور شگفتگی پیدا کی۔انھوں نے علماء کی ایک نسل کو اپنے ماضی کا تجزیہ کرنے اور حال سے فیض اٹھانے کے لئے تیار کیا،وہ سرسید اور حالی جیسے سادہ مزاج نہیں تھے۔ان میں ایک عالم کی شان تھی۔وہ دوسروں کی تعریف بھی کم کرتے تھے،مگر وہ بڑے ستھرے

اور دلکش ذوق کے مالک تھے۔ وہ مولویوں کی اصلاح نہ کر سکے مگر نئی نسل
کے خیالات پر گہرا اثر چھوڑ گئے، افسوس ہے کہ ان کے جانشینوں نے ان
کی علمیت پر نظر رکھی، ان کے ذہن کی لچک اور شعریت پر توجہ نہ کی مگر نئی
نسل شبلی کے اثر سے اپنے گھر سے زیادہ واقف اور اپنے تہذیبی سرمایئے
سے زیادہ آشنا ہو گئی، شبلی نہ ہوتے تو محمد علی اور اقبال کہاں ہوتے۔
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔'' ۸۳؎

رہا یہ سوال کہ سید صاحب نے شبلی کی ساری اچھائیوں کو بیان کیا ہے اور کمزوریوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کسی حد تک صحیح ہے کیوں کہ وہ محض ایک سوانح نگار ہی نہ تھے، بلکہ ایک شفیق استاد کے عزیز اور محبوب شاگرد بھی تھے۔ مگر غور سے حیات شبلی کا مطالعہ کیا جائے تو جا بجا شبلی کی بعض کمزوریوں اور خامیوں کی طرف اشارے ضرور ملتے ہیں۔ شیخ اکرام حیات شبلی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اگر آپ اسے کامل سوانح عمری نہ بھی سمجھیں تب بھی حیات شبلی میں
فاضل مؤلف نے ہماری تیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی
تاریخ جس سے پیش کی ہے اور دیار یورپ کی کوئی سات سو سال کی علمی
تاریخ لکھ کر دی ہے۔ اس کے احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔''
۸۴؎

سید صاحب نے بنیادی طور پر شبلی کی ان عظمتوں کو اپنے سامنے رکھا۔ سید صاحب بذات خود ایک سنجیدہ اہل قلم ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔ ادب میں شگفتہ پن ہے۔ انداز بیان میں ندرت ہے۔ حیات شبلی سید صاحب کے اسلوب کے محاسن اور خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کا پایا بہت بلند ہے۔ اس میں سید صاحب کے مطالعہ کی ہمہ گیری اور گہرائی کے نقوش ہیں۔ دلائل و براہین کی قوی منطقی ترتیب ہے۔ قدرتِ بیان کا ثبوت ہے۔ سنجیدگی اور متانت لفظ لفظ سطر سطر سے عیاں ہے۔

# حوالہ جات

۱۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص۱

۲۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص۲۴۷

۳۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک، ص۸

۴۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۶

۵۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۶

۶۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۹۔۱۸

۷۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۹

۸۔عبداللہ کوثی ندوی، سید سلیمان ندوی، ص۱۶۹

۹۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۷

۱۰۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۸

۱۱۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۷

۱۲۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص۲۲۳

۱۳۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۲۶

۱۴۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۱۷

۱۵۔ڈاکٹر عبدالواسع، بہار میں اردو سوانح نگاری، ص۱۰۸

۱۶۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص۲۲۸

۱۷۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۲۹۔۲۸

۱۸۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۴۹۔۴۸

۱۹۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۵۳۔۵۲

۲۰۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۸۲

۲۱۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، ص۹۱

۲۲۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ،ص ۱۳۷

۲۳۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ،ص ۱۶۷

۲۴۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ،ص ۱۸۱۔۱۸۰

۲۵۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ،ص ۱۸۲

۲۶۔سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ،ص ۱۸۷

۲۸۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۱۴

۲۹۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی،ص ۱۹۳

۳۰۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی،ص ۱۹۳

۳۱۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۷

۳۲۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۷

۳۳۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۸

۳۴۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۱۱

۳۵۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۱۱

۳۶۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۱۳

۳۷۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۲۹

۳۸۔سید سلیمان ندوی، حیات مالک،ص ۶۷

۳۹۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۱۶

۴۰۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۱

۴۱۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۱

۴۲۔سید سلیمان ندوی، دیباچہ خیام،

۴۳۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۱۰

۴۴۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۴۲

۴۵۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۶۰۔۵۹

۴۶۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۶۰۔۵۹

۴۷۔سید سلیمان ندوی، خیام،ص ۳۳۶

۴۸۔سید سلیمان ندوی، خیام، ص ۳۵۸

۴۹۔سید سلیمان ندوی، خیام، ص ۳۶۶

۵۰۔ڈاکٹر عبدالواسع، بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء، ص ۱۰۴

۵۱۔سید سلیمان ندوی، رحمت عالم، دیباچہ اول

۵۲۔سید سلیمان ندوی، رحمت عالم، ص ۱

۵۳۔سید سلیمان ندوی، رحمت عالم، ص ۴۷

۵۴۔سید سلیمان ندوی، رحمت عالم، ص ۱۴۸

۵۵۔ڈاکٹر عبدالواسع، بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء، ص ۱۳

۵۶۔ڈاکٹر الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص ۲۱۷

۵۷۔ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص ۱۱۸

۵۸۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۴

۵۹۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۳

۶۰۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۸

۶۱۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱۰۔۹

۶۲۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱۰

۶۳۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۱۲۷

۶۴۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۷

۶۵۔پروفیسر محمد ڈار، حیات شبلی پر ایک نظر ص ۲۴۲

۶۶۔رشید احمد صدیقی، ہم نفسان رفتہ، ص ۲۷

۶۷۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۶۲۸

۶۸۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۳۲

۶۹۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۱

۷۰۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۲۲۳

۷۱۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۴۲۶

۷۲۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۴۵۱

۷۳۔سید سلیمان ندوی، حیات شبلی،ص۲ ۴۵

۷۴۔سید سلیمان ندوی،حیات شبلی،ص۲۶ ۔۷۲۵

۷۵۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی،ص۱۲۵

۷۶۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی،ص۱۲۵

۷۷۔شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی،ص۱۳۴

۷۸۔ پروفیسر محمد ڈار، حیات شبلی پر ایک نظر ص۲۴۰

۷۹۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۲۰۹

۸۰۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص۲۰۸

۸۱۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص۲۰۹

۸۲۔تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص۲۲۰۔۲۱۹

۸۳۔شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص۱۱

# باب ششم

## ﴾......عہد سر سید کے دیگر سوانح نگار اور ان کی سوانح عمریاں......﴿

سرسید احمد خان اوران کے ہم نواؤں نے ایک نئ فکر کی بنیاد ڈالی ۔اس صدی کو اصلاح ،استدلال اور مناظرے کی صدی بھی کہہ سکتے ہیں ۔اس دور میں ہر قسم کے ادب کی تخلیق اصلاحی اورافادی نقطۂ نظر سے کی جا رہی تھی اور یہی اس وقت کے اعلٰی ادب کے اصول تھے ۔چنانچہ سوانح نگاری کو بھی ان ہی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا ۔اس دور کی تصانیف پر سرسید ،حالی ،شبلی اور شرر کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں ۔تاریخی تصانیف پر زیادہ تر شبلی کا ،اور علمی پر حالی کے اثرات نظر آتے ہیں ۔عہد سرسید کے دیگر سوانح نگاروں میں مرزا حیرت دہلوی ،عبدالرزاق کانپوری ،سید افتخار عالم ،قاضی محمد سلیمان منصور پوری ،عبدالسلام ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں ۔

## مرزا حیرت دہلوی کی سوانح نگاری:

مرزا حیرت دہلوی بھی اس دور کے مایہ ناز مصنف ،سوانح نگار اور مدیر ہیں ۔انھوں نے بہت سی سوانحی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ۔انھوں نے ہندوستان کے مشہور و معروف اخبار ''اودھ'' کے لئے بحیثیت مدیر خدمات بھی انجام دیں ۔

یوں تو ان کی تصانیف کی تعداد کافی بتائی جاتی ہے ،انھوں نے بہت سارے قرطاس کو رنگین کیا اور

ڈھیر ساری کتابیں لکھیں، تاہم محققین نے ان کی سوانحی تصانیف کی جانب زیادہ توجہ نہ دی جس کی وجہ سے ان کی دیگر تصانیف کو اتنی شہرت نہیں مل سکی۔ مگر مرورِ ایام کے باعث چند سوانح عمریاں دستیاب ہو سکیں ان کا بالترتیب ذکر کیا جا رہا ہے۔ ''حیات طیبہ''، ''حیات فردوسی'' اور ''سیرت محمدیہ''۔

عہد سرسید میں حالی اور شبلی نے فن سوانح نگاری کی جانب اپنی توجہات کو مبذول کیں وہیں ان کے بعد بھی سوانح نگاروں نے اس فن کی جانب توجہ کی، ان میں ایک ممتاز نام مرزا حیرت دہلوی کا ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح نگاری کو مناظرانہ رنگ دیا۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام مخالف سازشیں ہو رہی تھیں، مذہب اسلام پر حملے ہو رہے تھے اور دشمنانِ اسلام اپنی جارحانہ کوششوں میں سرمست تھے، چنانچہ دشمنان اسلام خاص کر عیسائی مشنریوں کی جارحانہ تبلیغی کدوکاوش اور مذہب اسلام اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو حملے ہو رہے تھے ان حملوں کی پاداش میں اس زمانے میں کئی سوانح عمریاں لکھی گئیں جن میں مرزا حیرت دہلوی کی ''سیرت محمدیہ'' بھی ہے۔ اس حوالے سے ممتاز فاخرہ لکھتی ہیں:

> ''اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی سوانح عمریوں پر مناظرانہ رنگ اس لیے غالب ہے کہ عیسائی مشنریوں کی جارحانہ کوششوں اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات پر رکیک حملوں سے متاثر ہو کر لکھی جا رہی تھیں۔ چنانچہ سر سید کی خطبات احمدیہ اور شبلی کی سیرۃ النبی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں اور مرزا حیرت دہلوی نے سیرت محمدیہ لکھ کر اسی سلسلے کو آگے بڑھایا۔''[1]

مرزا حیرت کے طرزِ نگارش کو دیکھا جائے تو کسی حد تک علامہ شبلی نعمانی سے ملتا جلتا نظر آتا ہے کیوں کہ علامہ شبلی نعمانی اپنی سوانح حیات میں جس طرح تاریخی پہلوں پر بھرپور توجہ دیتے ہیں، اسی طرح مرزا حیرت دہلوی بھی تاریخی پہلوؤں پر خاصی توجہ برتتے ہیں۔ جس طرح علامہ شبلی نعمانی ہیرو اور کردار کے ذہنی اور علمی نشوونما کے لئے سماجی پس منظر کو ضروری سمجھتے تھے اسی طرح مرزا حیرت دہلوی بھی کسی بھی ہیرو کے کردار کے ذہنی و علمی نشوونما اور سماجی پس منظر کو ضروری سمجھتے تھے۔ مرزا حیرت دہلوی میں سوانح نگاری کی اعلیٰ صلاحیتیں موجود تھیں وہ کسی بھی شخص کے سوانحی حالات کو بڑی سلیقہ مندی سے الفاظ کا جامہ دیتے تھے۔ انہوں نے مذہبی لوگوں کی سوانح حیات لکھیں تاہم انہوں نے اپنی سوانح میں ان کو صرف مصلح قوم یا مجاہد کی نظر سے

نہیں دیکھا بلکہ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس شخص کے انسانی مشاغل اور اوصاف پر بھی نظر رکھی۔ مرزا صاحب کسی بھی شخص کی سوانح حیات میں اس کے گھریلو احوال وکوائف پر بھی خاص توجہ دیتے تھے۔ مرزا حیرت دہلوی پر علامہ شبلی کا اثر اس قدر نظر آتا ہے کہ وہ ان کی پیروی کرنے میں انگریزی کے الفاظ کا بے جا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس حوالے سے وہ علامہ شبلی کے سامنے کافی بونے نظر آتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے انگریزی الفاظ کا استعمال بڑی بے سلیقگی سے کیا ہے، بے موقع اور غیر ضروری انگریزی کے الفاظ کے استعمال نے ان کی تحریر میں حسن پیدا کرنے کے بجائے، بھونڈا سا بنا دیا ہے۔ جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''بی بی خدیجہ قریشی لیڈی تھیں جو آپ کی ناتے داری تھیں۔'' [۲]

مرزا حیرت دہلوی کے اسی اندازِ تحریر کی بنا پر ان کی تحریریں مجروح ہو جاتی ہے۔ بے جا انگریزی الفاظ کی وجہ سے ان کی تحریروں میں گرانی سی پیدا ہوگئی ہے اور ان کی تحریر کردہ سوانح عمریاں کامرانی کے پیمانے سے تھوڑا سا گر گئی ہیں۔

بہرکیف ان کی سوانح حیات میں سے تین سوانح عمریاں کافی مشہور ہوئیں (۱) ''حیات طیبہ'' اس کتاب میں مرزا نے ہندوستان کی ایک عبقری شخصیت شاہ اسمعیل شہیدؒ کی زندگی کے احوال وکوائف کو اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے جہاں شاہ اسمعیل شہیدؒ کے زمانہ کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے وہیں شاہ صاحب کے حوالے سے مورخین کی آراء کو بھی بیان کیا ہے۔

مرزا کی دوسری سوانح حیات ''حیات فردوسی'' ہے، حیات فردوسی میں انہوں نے فردوسی کی سوانح حیات بیان کی ہے، اگرچہ سوانح حیات کے بجائے یہ ایک خاکہ کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ تاہم کسی حد تک سوانح حیات کا خیال گزرتا ہے، ان تمام چیزوں کو بالتفصیل حیات فردوسی کے تحت بیان کیا جائے گا۔

مرزا کی تیسری تصنیف ''سیرت محمدیہ'' ہے۔ سیرت محمدیہ میں مرزا حیرت دہلوی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے خوشنما گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی تاریخ کو مکمل شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کا تذکرہ باقاعدہ طور پر سیرت محمدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا جائیگا۔

## حیات طیبہ:

ہندوستان کی فضا میں رشد وہدایت کی روشنیاں بکھیرنے کے لئے اللہ تعالی نے اپنے فضلِ خاص سے ایک ایسی شخصیت کو پیدا فرمایا جس نے اپنی قوت ایمانی اور علم وتقریر کے زور سے کفر وضلالت کے بڑے بڑے بتکدوں میں زلزلہ بپا کر دیا اور شرک و بدعت کے خود تراشیدہ بتوں کو پاش پاش کر کے توحیدِ خالص کی اساس قائم کی ۔ یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے ، شاہ اسمٰعیل شہید محدث دہلوی تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور امام محمد بن عبدالوہاب کے بعد دعوت واصلاح میں امت کے لئے ان کی یہ خدمات نا قابل فراموش ہیں انھوں نے نہ صرف قلم سے جہاد کیا بلکہ عملی طور حضرت سید احمد شہید کی امارت میں تحریکِ مجاہدین میں شامل ہو کر سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہادت کا درجہ حاصل کیا اور ہندوستان کے ناتواں اور محکوم مسلمانوں کے لئے حریت کی ایک عظیم مثال قائم کی ان کے بارے میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے کہا کہ ''اگر مولانا محمد اسمٰعیل شہید کے بعد ان کے مرتبہ کا ایک مولوی بھی پیدا ہو جاتا تو آج ہندوستان کے مسلمان ایسی ذلت کی زندگی نہ گزارتے'' زیر نظر کتاب برصغیر ہند و پاک کی اسلامی تاریخ کے اسی عظیم جرنیل شاہ اسمٰعیل شہید کی حیات مبارکہ پر مشتمل ہے کتاب کے پہلے حصے میں شاہ اسمعیل شہید اور دوسرے حصے میں سید احمد شہید کا تذکرہ ہے۔

''حیات طیبہ'' ان کی سوانحی تصانیف میں سب سے اہم ہے۔ حیات طیبہ کے سن تصنیف پر جب تحقیقی نظر دوڑائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا حیرت دہلوی نے اس کتاب کو۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۱۲ھ میں لکھا، کیوں کہ اس کتاب کی سن تصنیف کے حوالہ سے نواب سعیدالدین خان نے ایک تاریخی قطعہ کہا تھا۔ جس میں مرزا حیرت دہلوی کی اس سوانحی تصنیف ''حیات طیبہ'' کو ''نسخہ بے مثل'' گردانا تھا، نواب سعیدالدین کے اس قطعہ سے ۱۳۱۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''حیات طیبہ'' ۱۳۱۲ھ کی تصنیف ہے۔ نواب سعیدالدین خان کا تاریخی قطعہ ملاحظہ ہو۔

''جب ہوا سرشار فکر صہبا سے میں یہ ندا ہاتف کی آئی نسخہ بے مثل ہے

۱۳۱۲ھ'' [۳]

حیات طیبہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی سوانح حیات ہے۔ جو ۳۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اسمٰعیل نام، شاہ صاحب لقب، شہید خطاب، قاطعِ بدعت کنیت، شاہ صاحب کی تاریخ ولادت میں

کسی قدر اختلاف ہے۔ بقول مرزا حیرت دہلوی "مختلف روایتوں کو دیکھ کر ۱۲ ماہ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ صحیح معلوم ہوتی ہے"۔

ویسے تو حیات طیبہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ سید شاہ اسمٰعیل شہیدؒ پر مشتمل ہے اس میں ان کے زمانے کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، جب کہ آخری حصے میں مولوی سید احمد بریلوی کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ حیات طیبہ سوانح نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مرزا صاحب نے یہ تصنیف اس غرض سے لکھی تھی کہ عظیم مجاہد کے حوالے سے لوگوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اس کا سد باب ہو سکے حتیٰ کہ بعض وہ حضرات جو اس عظیم المرتبت شخصیت کے حوالے سے تعصب کی نظر سے دیکھتے تھے ان حضرات کو دنداں شکن جواب دیا جا سکے، چنانچہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں:

> "ہمارا منشا بہت بڑا یہ ہے کہ اس بزرگ قوم اور رکن اسلام کی نسبت بعض
> مسلمان اپنی نادانی یا غلط فہمی یا ہٹ دھرمی یا بے جا تعصب سے جو سوءظن
> رکھتے ہیں وہ بالکل مٹا دیا جائے اور پبلک کے سامنے اس کے ذاتی
> جوہروں کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جائے کہ پھر اس کے قبول کرنے میں
> دشمن کو بھی چارہ نہ ہوا اور برتر نفس کی سچی شان عالم پر ظاہر ہو جائے۔" [۲۴]

مرزا حیرت دہلوی نے شاہ اسمٰعیل شہید کے بچپن سے لیکر میدان جہاد تک کے حالات کو اس انداز سے بیان کیا ہے جس میں ان کی ذہنی تعمیر اور روحانی پرورش تک کا تذکرہ بھی آ گیا، اس دوران انھوں نے شاہ اسمٰعیل کے جہاں فکری شعور کا تذکرہ کیا ہے وہیں ان کی ذہانت وفطانت کو بھی بیان کیا ہے، ان کے علمی شوق کے پردہ کو ادا کیا ہے وہیں ان کی گھڑ سواری کا بھی تذکرہ کیا ہے ساتھ ہی ساتھ تیر اندازی پہلوانی اور گولی چلانے کی مہارت کو بھی سپرد قرطاس کیا ہے۔ چناچہ ممتاز فاخرہ اپنی کتاب مولانا شبلی پر ایک تنقیدی مطالعہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "انہوں نے بچپن کے ان واقعات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو
> انہیں توحید خالص کی منزل سے میدان جہاد تک لے جانے، ان کے ذہنی
> کی تعمیر اور روح کی پرورش میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلے
> میں انہوں نے مولانا شہیدؒ کی ذہانت، علمی شوق، فکری شعور، گھڑ سواری،

تیراندازی، پہلوانی، گولی چلانے وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کا ذکر
ایسے موثر انداز میں کیا ہے کہ ہیرو کی شخصیت اور مجاہدانہ زندگی کا عکس
پوری طرح اجاگر ہو جاتا ہے۔'' ۵

مرزا حیرت دہلوی نے اپنی اس تصنیف میں بڑا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ شاہ صاحب کے حالات زندگی بیان کرنے سے قبل اسلامی ممالک کا تاریخی جائزہ کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے جس سے عالم اسلام کے عروج وزوال اور قوموں کے انحطاط وتنزل کے اسباب وعوامل سامنے آسکیں، الطاف فاطمہ رقم طراز ہیں:

''انہوں نے شاہ صاحب کے حاالات ِ زندگی اور کارناموں کا ذکر کرنے سے
بیشتر عام اسلامی ممالک کے اس زوال اور انحطاط کا مختصر اور جامع خاکہ پیش کیا
ہے۔'' ٦

مرزا حیرت دہلوی نے قوموں کے انحطاط وزوال پر تاریخی نظر اس وجہ سے ڈالی تا کہ شاہ صاحب کے بارے میں یہ بیان کیا جا سکے کہ وہ کون سا زمانہ اور دور تھا جس دور کے ماحول میں شاہ صاحب نے آنکھیں کھولیں، یہی وجہ ہے کہ جب وہ شاہ صاحب کے بچپن کے حالات کا تذکرہ کرتے تھیں تو شاہی دربار، لوگوں کی زندگی کا سیاسی اور سماجی پس منظر، معاشرتی تنزل وانحطاط، حکومتوں کے بننے اور بگڑنے، معاشرہ میں زندگی گزار رہے لوگوں کے اعتقاد کی کمزوری، رسم ورواج اور بدعات وخرافات کا تذکرہ پورے شرح وبسط کے ساتھ کیا ہے۔ ان پہلوں کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوتی، تاکہ لوگوں کے سامنے شاہ صاحب کے عزائم ومقاصد سامنے آسکیں، کیوں کہ مرزا حیرت نے سیاسی وسماجی پس منظر کے تحت جن برائیوں اور ناہمواریوں کا تذکرہ کیا ہے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ انہیں ناہمواریوں کو مدنظر رکھ کر اٹھے تھے۔ شاہ صاحب کے عزائم ومقاصد کے بیان کرنے کے لیے مرزا حیرت دہلوی نے عالمگیر کے زمانے سے لیکر مغل بادشاہ کی آخری کڑی تک کا تجزیہ کیا ہے پھر اس کے بعد کے حصوں میں سید اسمٰعیل شہید کے بچپن، تعلیم وتعلم، تربیت، شوق علم، شعور فکر اور ان کے اوصاف جمیلہ کو بیان کیا ہے۔

مرزا حیرت دہلوی نے اس سوانحی تصنیف میں بڑے سلیقہ کا کام یہ بھی کیا ہے کہ شاہ صاحب کے تذکرہ تو کیا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی تحریک کے امام اول سید احمد بریلوی کی بھی زندگی کے احوال

وکوائف پر تبصرہ کیا ہے، کیوں کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلوی دونوں کی منزلیں ایک تھیں دونوں کے مقاصد ایک تھے، چنانچہ دونوں نے اپنی منزلوں کے راستے بھی ایک ساتھ طے کئے تھے اور دونوں کا انجام بھی تقریباً یکساں ہی رہا۔ بریں بنا مرزا حیرت دہلوی نے اس بات کو محسوس کیا کہ جب تک سید احمد کی حالات زندگی نہ بیان کئے جائیں اس وقت تک شاہ صاحب کی سوانح عمری ادھوری رہ جائیگی۔ مرزا نے شاہ صاحب کے بچپن اور تعلیم و تعلم اور ذوق و شوق کو بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب کے پہلے وعظ و تقریر کا تذکرہ کیا ہے، حکومت کی انصاف پسند اور حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ممانعت کے حوالہ سے وعظ وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کے تعلق سے الطاف فاطمہ نے لکھا ہے کہ:

> ''اس کے بعد کے ابواب میں عوام الناس کی شورشیں مولانا کا پہلا وعظ گورنمنٹ کی انصاف پسندی سرکار برطانیہ کی طرف سے ممانعت وعظ۔''
>
> ۷

اسی دوران شاہ صاحب کی ریذیڈنٹ سے ملاقات کا بھی تذکرہ ہے۔ مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تردد کو مٹانے کے لئے آخر شاہ صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ خود رزیڈنٹ سے ملیں اور اس سے گفتگو کریں تاکہ یہ تردد دور ہو۔ آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے سیدھے کوٹھی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمت گار تھا، پہلے آپ نے جا کے اطلاع کرائی، جوں ہی رزیڈنٹ نے سنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں فوراً باہر نکل آیا، اور باہر برانڈے سے آ کے لے گیا، حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔'' ۸

شاہ صاحب نے پنجاب کا سفر کیا تھا اس کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سکھ اور مسلمانوں کے اخلاق کے حوالے سے شاہ صاحب کے جو نظریات تھے ان کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب کی کامرانیاں اور شریعت کے خلاف چیزوں کی اصلاحات، سید احمد شہید سے ملاقات، پشاور کی فتح، دہلی کی واپسی اور شہادت کے واقعہ کو مرزا نے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ مرزا ان تمام چیزوں کے بیان کرنے میں عقیدت مندی کا جامہ پہنے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے فنی طور پر سوانح نگاری کا مزہ تھوڑا پھیکا سا ہوا ہے، اسی طرح مرزا نے جہاں جہاں شاہ صاحب کے مناقشے پر تبصرہ کیا ہے وہاں وہاں ان کے اوپر مناظرانہ انداز طاری ہو گیا ہے۔

## حیات فردوسی:

حیات فردوسی مرزا حیرت دہلوی کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۶ء میں جبکہ دوسری بار ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ حیات فردوسی ۱۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے فردوسی کے احوال زندگی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فردوسی کا اصل نام، منصور تھا، لقب حکیم اور تخلص ابوالقاسم کنیت فردوسی تخلص تھا، فردوسی شاداب میں سن ۵۰۰ ہجری میں پیدا ہوا، شاداب مواضع طوس کا ایک موضع تھا فردوسی کا باپ بہت بڑا فاضل اور مذہبی پیشوا تھا اور اس کو مولانا فخر الدین احمد مولانا فخر الفردوسی کہتے تھے، وہ مذہبی گروہ کا ایک بڑا رکن تھا، فردوسی اپنے آپ کو سید خاندان سے بتلاتا تھا اور وہ اس بات کا دعویٰ کرتا تھا کہ اس کا تعلق حضرت زین العابدین کے قبیلے سے ہے، اس زمانے میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ شاداب میں بخوبی جاری تھا، اکثر شرفاء فخر الدین کے پاس مذہبی علوم پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، فردوسی کا بچپن نہایت خوبصورت اور لطیف تھا، یہ جب تین ساڑھے تین برس کا تھا تو اپنے باپ کے پاس طلبہ کا سبق سننے کے لئے بیٹھ جاتا تھا اور کئی کئی گھنٹے بغیر روئے خاموش بیٹھا ہوا سنتا رہتا اور کسی بھی طرح کی بے چینی کا اظہار تک نہ کرتا، جب زیادہ دیر ہوتی تو وہیں اونگھنے لگتا اور باپ اپنی گود میں سلا لیتا، ،فردوسی نے بچپن میں اپنی ماں کو کبھی نہیں ستایا، وہ عام بچوں سے تھوڑا سا الگ تھا کبھی بھی کسی سے کوئی چیز نہیں لیتا تھا عام طور پر جو باتیں بچوں کو خوش کرتی ہیں فردوسی ان سے نفرت کرتا تھا، فردوسی کو پانی کے پاس بیٹھنے کا بڑا شوق تھا پانچ سال کی کم عمری میں ہی پانی کی روانی اسکو بھلی لگتی تھی یہی پانی کی روانی بعد میں اس کی طبیعت کی روانی کی دلیل بنی، فردوسی کے باپ نے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے کہیں اور بھیجنا مناسب نہ سمجھا بلکہ خود ہی اپنے پاس اسکی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا تاہم اپنے پاس پڑھانے کا سلسلہ تادیر قائم نہ رہ سکا چنانچہ قطب الدین دمشقی کو فردوسی کا باقاعدہ استاد مقرر کیا۔

۱۲برس کی عمر میں خواجہ نصیرالدین کے پاس ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور پہلے اسنے اقلیدس کو پڑھا چند ہی ماہ میں اقلیدس جیسی کتاب کو سمجھ لیا، علم ریاض کو سیکھنے کے بعد والد فخر الدین کے کہنے پر دوبارہ مذہبی دنیا میں قدم رکھا بعد میں اس کی جوں جوں عمر بڑھتی گئی شاعری کا شوق ہوتا گیا آخر کار اس نے اپنی زندگی ہی میں وہ کارنامے انجام دئے کہ بڑے بڑے سلاطین اس کے قدر دان ہو گئے۔

مرزا نے حیات فردوسی میں ایک مقدمہ بھی قائم کیا ہے جس کے حوالہ سے لوگوں کی آراء کچھ درست نہیں ہیں، کیوں کہ مرزا نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ شروع سے لیکر آخر تک اپنے موضوع سے یکسر مطابقت نہیں رکھتا کیوں کہ مرزا نے حیات فردوسی کا مقدمہ ۲۲ صفحات کا لکھا ہے تاہم ان ۲۲ صفحات میں کسی ایک جملے سے تھوڑا سا بھی اس بات کا اشارہ نہیں ملتا ہے کہ فردوسی کے حوالے سے گفتگو کی جارہی ہے یا کسی اور بات کے حوالے سے۔ الغرض یہ کہ ۲۲ صفحات میں فردوسی کی جانب بالکل اشارہ تک نہیں ملتا ہے، ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے مرزا صاحب کا یہ مقدمہ، مقدمہ شعروشاعری کے ردعمل کے طور پر لکھا گیا ہے کیوں کہ مرزا کے مقدمہ اور حالی کے مقدمہ شعروشاعری دونوں کا انداز تحریر ہو بہو ہے، دونوں کا لہجہ ایک جیسا ہے دونوں کا مواد تقریباً ایک ہے حتیٰ کہ دونوں کی ترتیب بھی ایک ہی جیسی لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر الطاف فاطمہ کہتی ہیں:

''یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مقدمہ شعروشاعری کا چربہ اتارا ہے۔'' ۹

جس طرح حالی نے ملٹن کی مثال اور مقولے پیش کئے ہیں اسی طرح مرزا نے بھی شیکسپیر کی مثالیں اور مقولے پیش کئے ہیں چنانچہ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

''مجموعی طور پر تحریر مولانا حالی کے اثر کی غمازی کر رہا ہے۔'' ۱۰

طویل مقدمے کے بعد مرزا اپنے اصلی مقصد کی طرف آتے ہیں اور فردوسی کے حالات زندگی بیان کرتے ہیں۔ فردوسی کے حوالے سے مناقشوں کو بڑی اہمیت بھی دی گئی مثال کے طور پر فردوسی کو محمود غزنوی نے ساٹھ ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا تاہم بعد میں وہ مکر گئے اس طرح کے بے جا سنے سنائے واقعات کو فردوسی کی ذات کے ساتھ لوگ جوڑ دیتے ہیں ان تمام کا تذکرہ مرزا نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مرزا نے اس واقعہ کو بیان کرنے میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، جس کی وجہ سے محمود غزنوی اور فردوسی کے تعلقات اور محمود کی قدر و منزلت غزالی کے شر پسند عناصر کی بے اعتدالیاں وغیرہ کو رفتہ رفتہ اور بتدریج اس سلیقے

سے بیان کیا ہے کہ قاری کو پڑھنے میں مزہ آنے لگتا ہے۔ دراصل مرزا حیرت نے فردوسی کے حالات زندگی کے واقعات تفصیلات سے بیان کیے ہیں، جن تفصیلات سے کردار یا ہیرو کے محاسن ومعائب اور خصائل وفضائل سامنے آجاتے ہیں کہ فردوسی کے خود کے حالات بیان کرنے کے بجائے ان کے متعلق واقعات کی تفصیلات کو قلمبند کیا جس سے از خود فردوسی کے اوصاف وخصائل قاری کے سامنے آگئے باقی فردوسی کے ابتدائی حالات پر تو مرزا نے بہت ہی مختصر تذکرہ کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مرزا نے ان کے ابتدائی حالات کو بس یوں ہی سرسری انداز میں بیان کر دیا ہے باقی تمام تر توجہ اس واقعہ کی جانب مرکوز کی ہے جس کے اردگرد فردوسی کی پوری زندگی گھومتی ہے۔ مرزا نے ایسا اسی وجہ سے بھی کیا کیوں کہ اگر وہ فردوسی کے عادات واخلاق، رہن سہن، کھانا پینا، پہننا اور اوڑھنے پر توجہ مرکوز کرتے تو شاید فردوسی کی زندگی پر اس خوبی کے ساتھ روشنی نہ ڈال پاتے جس خوبی کے ساتھ واقعات کی تفصیل کے ضمن میں ڈالی ہے کیوں کہ انہوں نے واقعات کے ضمن میں فردوسی کی شخصیت اس طرح قاری کے ذہن میں بٹھا دی جیسے کہ فردوسی خود بخود ان کے سامنے کھڑا ہو۔ سوانح نگار حضرات کی عام روش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے موضوع کو اس انداز پیش کرتے ہیں جس میں ہیرو کی سوانحی حالات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں جس سے پڑھنے والی کی ہم دردی ہیرو کے ساتھ ہو جاتی ہے اسی کے لئے سوانح نگار عام طور پر ہیرو کے معائب اور برائیوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ہیرو کے حریف اور مخالف کو اس انداز سے پیش کرتا ہے جس سے قاری یہ سمجھنے لگتا ہے کہ سراسر غلطی حریف یا مخالف کی ہے لیکن مرزا صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ اپنے ہیرو کی لیاقت وصلاحیت اور اس کے رتبہ اور جاہ ومرتبہ کی تو قدر کرتے ہیں تاہم وہ ہیرو کے معائب اور کمزوریوں کو بھی بیان کر دیتے ہیں مگر پھر بھی قاری کی ہمدردی ہیرو کے ساتھ ہی رہتی ہے اور ہیرو کے مخالف کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا ہے یہ صرف اور صرف مرزا صاحب کا کمال ہے، مثال کے طور پر فردوسی کی سوانحی واقعات کے ذیل میں مرزا صاحب، فردوسی کی قابلیت کو تو بیان کرتے ہی ہیں اس کے ساتھ محمود غزنوی کے ساتھ واقع شدہ واقعات اس انداز میں بیان کیا ہے جس میں نہ تو فردوسی کو مظلوم اور محمود غزنوی کو ظالم کہا جا سکتا ہے، بلکہ فردوسی کے ساتھ دربار کے دیگر لوگوں کے نزدیک فردوسی کی قدر ومنزلت کو بیان کرتے ہیں جس سے فردوسی کے رتبہ میں تو کمی نہیں آتی ہے ہاں فردوسی کی کمزوریاں قاری کے ذہن میں آجاتی ہیں کہ فردوسی جلد باز تھا اس کے اندار مردم شناسی کا عنصر کم تھا اور یہ بھی

معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی احسان شناس نہیں بلکہ احسان فراموش تھا مرزا صاحب کا یہ طریقہ فنی لحاظ سے عمدہ طریقہ کہا جائے گا اور حیات فردوسی کو بہترین سوانح کے بجائے بہترین خاکہ کہا جا سکتا ہے۔

مرزا حیرت دہلوی کی حیات فردوسی اور مولانا حالی کی حیات سعدی کا اگر موازنہ کیا جائے تو تقابلی جائزہ کے تحت بہر حال حالی کی حیات سعدی ہی فنی لحاظ سے بہتر گردانی جائے گی، تاہم مولانا حالی چونکہ نہایت ہی شریف الطبع انسان تھے ان کی اس شرافت کی وجہ سے ہیرو کے بعض واقعات جس کی وجہ سے ہیرو کی شخصیت پر ضرب آ رہی تھی اسی ضرب کی وجہ سے حالی نے ہیرو کے اس طرح کے واقعات کو نظر انداز کر یا جبکہ مرزا نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہیرو کے اہم اور ضروری معاملات پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات سے احتیاط برتا تا کہ ہیرو کسی گروہ کے نزدیک مردود اور مقبول نہ ہو۔ چنانچہ مرزا نے فردوسی کے مذہب اور عقیدے کو بیان کرنے میں اس بات کا بالکل خیال نہیں کیا کہ اس سے ہیرو کی ذات پر اثر پڑے گا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق فردوسی کے مذہب اور عقیدہ کو بالکل واضح انداز میں رقم کر دیا۔ یہی ایک سوانح نگار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جراتِ اظہار کے ساتھ سمجھوتا نہ کرے۔

## سیرت محمدیہ:

مرزا حیرت دہلی کی تیسری تصنیف جس پر تبصرہ کرنا ہے وہ ہے سیرت محمدیہ۔ سیرت محمدیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ہے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ذات گرامی ابتدائے نبوت ہی سے ان کے اصحاب کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں یہ دستور شروع ہو گیا تھا کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کرتا اور وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی، یا رسول اللہ کے کسی تازہ فرمان کا ذکر کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ، اخلاق و عادات اور تعلیمات کے جاننے کا شوق بڑھتا گیا، اس شوق وطلب کی باعث روایت کا ایک وسیع سلسلہ پیدا ہو گیا جو ابتدا میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور پھر جب دوسری صدی ہجری کے اوائل میں مسلمان کے یہاں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے اہل علم ان روایات کو قلم بند کرنا، اور ان کو موضوعاتی ترتیب

دینا شروع کیا، مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کون حریف ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات واقعات کا ایک ایک حرف اس طرح محفوظ رکھا کہ دنیا کا کوئی فرد، جماعت یا قوم کسی شخصیت و کوائف ایسی جامعیت کے ساتھ محفوظ نہیں رکھ سکے اور نہ آئندہ ایسے محیر العقل کارنامے کی توقع ہے انھیں کارناموں میں سے اردو زبان میں ایک کارنامہ مرزا حیرت دہلوی کا ہے۔ سیرت محمدیہ مرزا حیرت کی اس دنیا کے عظیم المرتبت شخصیت آقاء دو جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت و سوانح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اطوار و انداز اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کی وجہ سے اسلام کو فروغ ملا، جس کے باعث مذہب اسلام کی شاخیں سارے عالم میں پھیلیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات ہزارہا لوگوں نے بیان کی ہے ہر کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن کو زیر قلم لانے کی کوشش کی ہے تاہم جہاں تک سیرت محمدیہ کا تعلق ہے تو یہ سیرت اس معنیٰ کر اہمیت کی حامل ہے کہ اس اس تصنیف کا پس منظر ہی کافی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ مرزا حیرت دہلوی نے اپنی تصنیف کو ایک خاص پس منظر میں لکھا ہے دراصل عہد سر سید میں اسلام کے خلاف بڑے پیمانے پر ریشہ دوانیاں چل رہیں تھیں پیغمبر اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بے بنیاد الزامات مستشرقین کی اور مخالفین اسلام کی جانب سے عائد کئے جا رہے تھے جس کی پاداش میں مرزا حیرت دہلوی نے جواب کے طور پر سیرت محمدیہ لکھی تا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر الزام لگائے جانے والے کا جواب دیا ہے کیوں کہ اسلام مخالف طاقتوں اور مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف یہ الزام عائد کیا جا رہا تھا کہ اسلام اتنی تیزی سے جو پھیل رہا ہے اس کی وجہ یہ کہ اسلام نے تلوار کا سہارا لیا جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا اور اس خوف کی بنا پر اسلام نے تیزی اختیار کیا اس طرح کے الزامات کے جوابات دیتے ہوئے مرزا نے سیرت محمدیہ میں ان واقعات کا تذکرہ کیا جو واقعات صرف مسلمانوں کے لئے ہی خاص نہیں تھے بلکہ ان کا اقرار یہود و نصاریٰ بھی کرتے تھے چنانچہ مرزا نے اس تصنیف میں مناقب بیان کرتے ہوئے واقعات کی سچائی تک پہنچے ہیں اور ان واقعات کی سچائی کو تاریخ کے ترازو میں تولا ہے چنانچہ مرزا اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ہم اپنے سچے نجات دہندوں کی آنکھ بھوؤں کی

تعریف کے ورد کو بالائے طاق رکھیں اوراس کی سچی تاریخی صفات سے
بحث کر کے جبراً اس کی حقیقت عالم پر ثابت کریں ، دلیلیں ایسی روشن
ہوں کہ مانیں اور پھر مانیں اس نظر سے میں آنحضرت صلی علیہ وسلم اللہ کی
سوانح عمری موجودہ زمانیکے مطابق تحریر کرنے کی کوشش کر کے وہ واقعات
بہم پہنچائے ہیں، کہ متعصب سے متعصب شخص کو بھی قبول کرنے میں چارا
نہ ہو۔'' [۱۱]

مندرجہ بالا اقتباس دو باتوں کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مرزا نے اس کتاب میں مناظرانہ انداز اختیار کیا ہے جس سے مخالفین کو دندان شکن جواب دیا جا سکے اور جس سے مخالفین بھی ان باتوں کو ماننے کے لئے مجبور ہوں ۔ اس مناظرانہ انداز میں عہد سرسید کا بھی خاصا دخل ہے کیوں کہ اس زمانے میں لکھی جانے والی تصانیف میں مناظرانہ انداز زیادہ اختیار کیا جار ہا تھا، چنانچہ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں :

''مرزا حیرت کی ایک اور تصنیف (حیات محمدیہ ) ہے اور یہ اس خاص
مناظرانہ رجحان کی آئینہ دار ہے جو عہد سرسید کا امتیازی نشان ہے'' [۱۲]

یہ بات تو ظاہر ہے کہ جب مناظرانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں دلائل وشواہد اور براہین کو مدنظر رکھ کر بات کرنی پڑتی ہے اسی لئے مرزا نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح بیان کرتے ہوئے سیرت وسوانح پر تاریخی روشنی ڈالتے ہوئے براہین و دلائل سے کام لیا ہے، جس سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ اردو زبان میں مغرب کے ذریعہ سوانح نگاری کو ادب میں باقاعدہ ایک مقام حاصل ہو رہا ہے، سیرت محمدیہ کو چونکہ مرزا نے بڑی ہی کد و کاوش ، محنت اور جانفشانی کے ساتھ وسیع مطالعہ اور پختہ استدلال کے ساتھ لکھی ہے اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے وہ یہ کہ سرسید کے عہد میں لکھی گئی ہے جس کی وجہ سے استدلال اور وسیع مطالعہ کے بعد میں یہ تصنیف منظر عام پر آئی مرزا نے سیرت محمدیہ کے دیباچے میں اس بات کا اقرار بھی کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''میں ڈاکٹر سرسید احمد ریفارمر قوم کی تحقیق وتفتیش میں مجھے مدد پہونچائی۔'' [۱۳]

سیرت محمدیہ دراصل عام سوانح عمریوں کے مقابل میں تھوڑی سی جداگانہ سوانح عمری ہے کیوں کہ بعض جگہوں پر مرزا نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے صرف اسی شخص کا مختصراً جواب نہیں دیا بلکہ تاریخی

شواہد کا سہارا لے کر جواب دیا ہے ساتھ ہی ساتھ پورے عالم اسلام کی تاریخ اور پورے عالم اسلام کے حالات کو سامنے لا کر رکھا ہے پھران حالات کے مدنظر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے جیسا کہ خلافت عثمانیہ اور حضرت عائشہ پر اٹھائے جانے والے سوالات کے جوابات میں ان چیزوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

## عبدالرزاق کانپوری کی سوانح نگاری:

عہد سرسید کے سوانح نگاروں میں ایک خاص اور اہم نام مولانا عبدالرزاق کانپوری کا ہے۔انھوں نے اگر چہ سوانح اور تاریخ کی زیادہ کتابیں تصنیف نہیں کی ہیں لیکن وہ اس سے اور اس کے اہم فرق سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔عبدالرزاق کانپوری نے مغرب اور مشرق کے تصورِ سوانح کا بخوبی مطالعہ کیا۔انگریزی مصنفین کارلائل ،لوتھر اور بنجامن فرینکلن کے علاوہ حالی وشبلی کی سوانح نگاری سے بھی کافی متاثر نظر آتے ہیں۔بقول ڈاکٹر نیر جہاں:

> ''عبدالرزاق کانپوری حالی اور شبلی سے متاثر نظر آتے ہیں۔انگریزی کے سوانحی ادب کا مطالعہ بھی کیا ہے اور کارلائل ،لوتھر اور بنجامن فرینکلن سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔شبلی کا براہ راست اثر قبول کرتے ہوئے انہوں نے ''ہیروز آف اسلام'' کی ڈگر پر چلنے کی کوشش اور ناموران اسلام پر قلم اٹھایا۔'' [۱۴]

عبدالرزاق کانپوری کی پیدائش ۱۸۶۶ء میں انبالہ میں ہوئی۔عبدالرزاق صاحب کانفرس کے سالانہ جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ان جلسوں میں خاص طور پر ان موضوعات پر زور دیتے تھے جو اسلامی تعلیم سے متعلق ہوتے تھے۔اس سلسلے میں وہ سرسید کی تحریک سے بہت متاثر تھے اور سرسید،ان سے بہت متاثر تھے۔انھیں کی ہمت افزائی سے ''البرامکہ'' کی تالیف کا آغاز ہوا۔یہی نہیں ان کے اپنے عہد کے تمام اکابر اور ہمعصروں سے اچھے تعلقات تھے۔اس سلسلے میں سعیدہ بانو لکھتی ہیں:

> ''مولانا کے اپنے عہد کے جملہ اکابرین یعنی سرسید احمد خان ،حالی ،شبلی ،
> محسن الملک ،نذیر احمد سے مراسم تھے۔شبلی نعمانی ،مولانا ابولکلام آزاد اور

مہدی حسن افادی سے نہایت بے تکلفی تھی ۔مولانا آزاد خاص طور سے
آپ کی نکتہ سنجی اور تاریخ دانی کے معترف تھے اور کسی تاریخی موضوع پر قلم
اٹھانے سے پہلے مولانا سے مشورہ ضرور لیتے تھے، دو، دو تین تین ماہ کتب
خانہ میں قیام رہتا تھا لکھنؤ سے شرر صاحب آ جاتے ، گورکھپور سے مہدی
حسن صاحب ۔خوب محفلیں جمتیں ۔مولانا بڑی دلچسپی سے ان ادبی
صحبتوں کا تذکرہ فرماتے تھے ۔یادایام کا ہر صفحہ ان واقعات سے مزین
ہے۔'' ۱۵

چنانچہ عبدالرزاق صاحب نے پوری زندگی ادبی مجلسوں اور تصنیف وتالیف میں صرف کی ۔ان کے تصنیفی کارناموں میں سے البرامکہ زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

البرامکہ عبدالرزاق کانپوری کی ایک اچھی کوشش ہے ۔ وہ فن سوانح سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں ۔شبلی کے ''سلسلہ ناموران اسلام'' سے متاثر ہوکر انھیں البرامکہ کا لکھنے کا خیال آیا۔خاندان البرامکہ کے فضائل نے انھیں سوانح لکھنے پر آمادہ کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بھی بیوگرافی پر قلم اٹھایا ہے اور اس مقصد کے واسطے خاندان
برامکہ انتخاب کیا ہے، جو خاص فضائل سے منسوب تھا اور جن کے جودو
کرم کے افسانے اور علمی کارنامے بطور ضرب المثل آج تک تاریخوں
میں یادگار ہیں۔'' ۱۶

سوانح نگاری کی ضرورت واہمیت کے علاوہ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ راہ نہایت دشوار گزار ہے۔

''علم تاریخ اور اس کے متعلق سیرت یا لائف یہ وہ سنگلاخ گھاٹی ہے کہ
جس میں قلم کا مسافر بھی (باوجود یہ کہ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ رکھتا
ہے) ہر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔'' ۱۷

یہ سوانح ۱۲۲۰ ہجری میں تصنیف ہوئی ۔اس سے پہلے کسی اور نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مصنف نے مواد کی فراہمی میں بہت سی کتابیں چھان بین کرکے واقعات فراہم کئے ہیں ۔بقول ڈاکٹر نیر جہاں:

''سوانح نگار نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جو اب تک اچھوتا تھا۔
ایسے میں مواد پر بے پناہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور عبدالرزاق
کانپوری نے مواد کی فراہمی پر بہت محنت کی ہے اور بہت ساری کتابوں کا
مطالعہ کر کے مواد کو ریزہ ریزہ چنا ہے۔'' ۱۸

عبدالرزاق صاحب کا البرامکہ لکھنے کا مقصد یحییٰ، فضل اور جعفر برمکی کی صرف سوانح حیات ترتیب دینا نہیں تھا بلکہ ان کے خاندان کے مفصل حالات، ایران کی شاہانہ عظمت کی کہانی، ان کے زمانے کے سیاسی ومعاشرتی حالات، حکومت کے انتظامی دفاتر اور عدلیہ کا نظام وغیرہ کا خاکہ بھی پیش کرنا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''البرامکہ ایک شخص یا صرف تین نامور وزراء یحییٰ، فضل اور جعفر برمکی کی
سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ ایران کی قدیم عظمت کی کہانی، عہد عباسی
کے عظیم الشان تمدن وتہذیب کی تاریخ، اسلامی تاریخ کے درخشاں ترین
دور کی جاگتی تصویر اور عباسی خلفاء کے سیاسی وانتظامی اداروں کی مکمل
داستان بھی ہے۔'' ۱۹

اس کتاب سے ہمیں جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ برامکہ کون تھے، وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بلخ کی عظمتِ گزشتہ کیا تھی، اور ہارون رشید کے زمانہ میں کس قسم کے سیاسی ومعاشرتی افکار پائے جاتے تھے، کہ اس دور میں حکومت کے انتظامی دفاتر کیا کیا تھے، عدلیہ کا نظام کس طرح قائم تھا، مالیات عامہ، اور مال گزاری کا اصول کیا تھا، عربی ادبیات کا اس زمانہ میں کیا حال تھا، فارسی کا جدید ادب جو ابھی عالم طفلی میں تھا، کس دور سے گزر رہا تھا وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ علوم اوائل یعنی فلسفیانہ افکار وخیالات کی آمیزش سے اس زمانہ میں اسلامی عقائد واعمال پر کیا گزر رہی تھی۔

علاوہ اس کے عبدالرزاق کانپوری اس سوانح کے ذریعے ہارون رشید کے دامن سے اس بدنما داغ کو دور کرنا چاہتے تھے جو آل برمکہ کے قتل سے ان پر لگ چکا تھا۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''خاندان برامکہ اور خلیفہ ہارون رشید کی لائف لکھنے میں جس قدر میں
نے محنت کی ہے اس کی علت غائی، شہرت وناموری، جلب منفعت کی

> توقع یا قوم ستائش کی تمنا نہیں ہے بلکہ اصلی مقصد اور صدق عقیدت یہ ہے
> کہ خلیفہ ہارون رشید سے جو خاندان رسالت کا ایک معزز ممبر ہے وہ غلط
> اور بیہودہ الزام دور کردوں جو خلاف اور وزارت کے باہمی میل جول
> اور ایک جہتی سے تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔'' ۲۰؎

اسی طرح اس کتاب کے مصنف کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ حضرت جعفر و عباسیہ کے نکاح کے متعلق تاریخوں میں جو غلط بیانات درج کیے گئے تھے اس کا صحیح فیصلہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں وہ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں:

> ''برامکہ ہارون رشید کی سیرت نگاری میں جس قدر محنت کی گئی ہے اس کی
> غرض و غایت صرف یہ ہے کہ جعفر و عباسہ کے نکاح کے متعلق (خلافت
> اور وزرات کے اتحاد سے) تاریخوں میں جو غلط واقعات درج ہو گئے
> ہیں، مورخانہ تنقید کے بعد اس کا صحیح فیصلہ کیا جائے۔'' ۲۱؎

مصنف نے سوانح عمری تحقیقی سپرد قلم کی ہے۔ برمک کی تحقیق اور برامکہ کے خاندان کی وجہ تسمیہ کے لئے عربی و فارسی ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے البرامکہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ یحییٰ برمکی کی سوانح عمری پر مشتمل ہے۔ اس میں یحیٰی برمکی کے حالات، سیرت کردار اور سلطنت عباسیہ کی شان وشوکت کی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہیرو کی علمی بصیرت، سخاوت اور فہم سے متعلق دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے جس سے ہیرو کی شخصیت اور قابلیت میں اور نکھار پیدا ہو گیا ہے۔

دوسرے حصے میں فضل برمکی کے حالات ہیں۔ جس میں ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، ملکی خدمات، سیاسی مہم، ملکی انتظام، ان کی سخاوت، دریا دلی، تواضع، علمی خدمات، علماء کی قدر دانی سے متعلق قابل قدر واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ مصنف کا محبوب ہیرو ہے، لیکن جب ان کی طبعی کمزوریوں کے انکشاف کا موقع آتا ہے تو وہ ایک دیانت دار سوانح نگار کی طرح اپنا فرض انجام دیتے ہیں اور صاف دلی سے ہیرو کی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ جعفر برمکی کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ان کے ساتھ بھی مصنف نے غیر جانبداری کے ساتھ کام لیا ہے۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ کمزوریوں کو بھی واضح کیا ہے۔ ہیرو کے جاہ جلال بیان کرنے کے

بعداس کے زوال وتباہی اور برد باری کے واقعات پر مصنف کو بحیثیت انسان افسوس ہے۔لیکن اس ہمدردی کی آڑ میں وہ حقائق کی پردہ پوشی نہیں کرتے ہیں۔اس لیے جہاں انھوں نے ہارون رشید کو غلط ٹھہرایا تو آل برامکہ کو بھی ان کی بے اعتدالیوں پر موردِ الزام قرار دیا ہے۔کتاب کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نہ صرف ایک سوانح نگار کا مزاج پایا ہے بلکہ ان کا قلم ایک ادبی حسن کا بھی حامل ہے جس سے کسی فن پارے میں ابدیت کے عناصر پیدا ہوتے ہیں۔

البرامکہ میں مصنف ہیرو کی شان وشوکت کی داستانیں سنا کر قاری کو مسحور کر لیتا ہے اس کے بعد آہستہ آہستہ قاری کے ذہن کو ہیرو کے زوال کی طرف لانے کے لیے اسباب تلاش کرتا ہے جس سے قاری پہلے ہی سے اس المیہ اور دردناک انجام سے واقف ہو جاتا ہے جس سے قاری کا شوقِ مطالعہ اور بڑھ جاتا ہے۔

بہر کیف عبدالرزاق کانپوری نے اس کتاب میں ایک دیانت دار سوانح نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے اورانہوں نے فنی لوازم کو بھی بڑے سلیقے سے برتا ہے۔البرامکہ کو مصنف کے وسعتِ مطالعہ اور تحریر کی روانی نے ایک ایسی تاریخی کتاب بنا دیا ہے جو ہر اعتبار سے بے مثال اور لاجواب ہے۔عبدالرزاق صاحب کی یہ مایہ ناز تصنیف البرامکہ اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔چناچہ الطاف فاطمہ اپنی کتاب اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ عبدالرزاق کانپوری صاحب اپنے وقت کے بلند پایہ سوانح نگار ہیں۔اوران کی مایہ ناز تصنیف ''البرامکہ'' اردو کی اعلیٰ اور بلند تصانیف میں سے ہے۔'' ۲۲

## سید افتخار عالم کی سوانح نگاری:

سید افتخار عالم کا بھی شمار اردو سوانح نگاروں میں جدید وقدیم ادوار کی عبوری کڑی کی حیثیت سے ہوتا ہے ان کی سوانحی تصنیف ''حیات النذیر'' ہے۔جو ۱۹۱۲ء میں منظر عام پر آئی۔یہ کتاب حالی کی حیات جاوید کی طرز پر لکھی گئی ہے۔یہ حیات جاوید کی طرح مفصل اور جامع سوانح عمری ہے اس میں مصنف نے ہیرو کی تحریروں کا زیادہ استعمال کیا ہے۔اسلوب بیان میں بھی ہیرو کی تحریروں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔اس تصنیف پر

مولانا حالی، مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق نے بیک وقت مقدمے لکھے ہیں۔ان میں سے ہر ایک نے سید افتخار عالم کوان کی اس تصنیف پر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔حالی نے اس کو ڈپٹی نذیر احمد کی مکمل سوانح عمری کہا اور مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ یہ مولانا نذیر احمد کی بڑی جامع سوانح عمری ہے اور محض اس کو پڑھ لینے سے قاری مولانا کی زندگی کے ہر رخ سے آشنا اور مانوس ہو جاتا ہے مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ میں:

''مولانا نذیر احمد اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو ان کی بیسیوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔مسرت کی بات یہ ہے کہ یہ ضرورت بوجہ احسن پوری ہوئی۔'' ۲۳؎

یہ سوانح عمری اپنے عہد کی سوانح عمریوں میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔مصنف نے اپنے موضوع کا مطالعہ بڑے قریب سے کیا ہے۔حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ سوانح نگاری کے فن سے واقفیت رکھتا ہے۔وہ واقعات پر اسی وقت بھروسا کرتا ہے کہ جب ان کی تحقیق ہو چکی ہوتی ہے۔وہ ہیرو کو خطا و نسیاں سے پاک نہیں سمجھتا۔اس لیے ان کا کہنا ہے کہ صاحب سوانح کی تصویر کے دونوں رخ کو واضح کرے گا تا کہ قاری ہیرو کی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس کی قدر و قیمت کا تعین کر سکے۔وہ لکھتے ہیں:

'' کہتے ہیں لوگ کسی ادنیٰ آدمی کو بھی اس کے منہ پر برا نہیں کہتے لیکن پیٹھ پیچھے بادشاہ کو بھی برا کہنے سے نہیں چوکتے۔مگر راقم نے اس کے خلاف عمل کیا ہے یعنی بادشاہ (صاحب سوانح) کے عیب کچھ ہیں تو اس کے منہ (حین حیاۃ) پر رکھ دیتے ہیں۔بہر حال حیات النذیر میں صاحب سوانح کے تاریک و روشن دونوں رخ دکھا دیے ہیں۔خوبیوں کی جگہ خوبیاں اور کمزوریوں کی جگہ کمزوریاں بیان کی گئی ہیں۔ہاں بے ادب اور گستاخ بن کر دل آزاری نہیں کی ہے اور نہ نمک مرچ لگا کر بہ نظر تحقیر بات کا بتنگڑ بنایا ہے اور نہ خوبیوں میں اپنے حسن اعتقاد کو سمو کر پیراں نمی پرند مریداں پرانند پر عمل کر کے مناقب کی کتاب تیار کی ہے۔'' ۲۴؎

ڈپٹی نذیر احمد کی اس سوانح عمری کو مصنف نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں نذیر احمد

کی ولادت، بچپن، تعلیم وتربیت، اور دہلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے تک کا بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ شادی وغیرہ کی تفصیلات کا حصہ سب زیادہ پرکشش ہے۔تحفہ تحائف سے انکار کرنا وغیرہ جیسی مثالوں سے ہیرو کی خودداری پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسرے حصے میں ان کی کاروباری زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ملازمتوں کے سلسلے سے دیے گئے امتحانات، تجربات انگریزی زبان سے واقفیت اور انکے منصب وعہدہ کی ترقیوں کا ذکر و بیان ہے۔تیسرے حصے میں ان کی اس زندگی کو پیش کیا گیا ہے جوانہوں نے حیدرآباد میں گزاری ہے۔ چوتھے حصے میں نذیر احمد کا حلیہ، اخلاق وعادات اور اطوار کی تفصیلات ہیں۔اس حصے میں مصنف نے ہیرو کی سیرت اجاگر کرنے میں ان کے لطائف وظرائف سے بھی مدد لی ہے۔ پانچویں حصے میں مصنف نے ڈپٹی نذیر احمد کی ان کی تصنیفات پر تبصرہ کیا ہےاوراس تبصرہ میں جہاں ہیرو کی اعلیٰ ادبیانہ حیثیت کو تسلیم کیا ہے، وہاں امہات الامتہ پر کیے گئے اعتراضات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ساری کتاب میں ہم کو تین مقام ضرور ایسے معلوم ہوئے جہاں مصنف کا قلم سرپٹ جاتے جاتے پھسل گیا ہے۔مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولاد ذکور زندہ رہنے پر مولف نے جن الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے یا اس طرح جو دل شکن مثالیں حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کے معاملات میں دی گئی ہیں وہ ضرور ایسے فقرے ہیں جن کو دیکھنے کی تاب نہیں ہوسکتی۔راقم نے خود ایک مرتبہ مولف سے دریافت کیا کہ یہ فقرے اور آپ کے قلم سے۔کہنے لگے کہ ''بے شک شوخی ہوگئی ہے۔'' خیر ان کا یہ خیال ہے مگر ہم تو اس کو گستاخی کہیں گے یہ اور بات ہے کہ مولانا نہ سمجھیں۔افسوس کہ مولانا کے بے لگام قلم کو' باخدا دیوانہ وبا مصطفیٰ ہشیار باش'' کا بھی لحاظ و پاس نہ رہا۔''[۲۵]

چھٹا حصہ ہیرو کے مذہب سے متعلق ہے۔اس سلسلے میں مصنف اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتے بلکہ اس کی وضاحت خود ہیرو کی تحریروں سے کرتے ہیں۔ساتویں حصے میں ان ضمیموں کا بیان ہے جو مصنف نے حیات کے بعد شامل کرنا ضروری سمجھا ہے۔تا کہ کتاب کا کوئی بھی حصہ تشنہ نہ رہ جائے اور یہ ہر اعتبار سے مکمل ہو جائے۔

اس سوانح عمری کے ابواب اوران کے موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نے بہت ہی متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔اس کے علاوہ اس نے ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچنے کے لئے بنیادی کام بہت ہی حسن وخوبی سے انجام دیا ہے۔اس سوانح عمری میں واقعات وواردات کی پیش کش میں بڑی واقعیت اور حقیقت نویسی کی راہ دی گئی ہے۔بہ حیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب اورمعیاری سوانح عمری ہے۔افسوس کہ آج کی علمی وادبی دنیاان کے نام سے واقف نہیں۔ایسامحسوس ہوتا ہے کہ ان کی کم نویسی اس راہ میں مانع ہوتی ہے، مگرایک کامل سوانح نگارکی حیثیت میں ان کی شناخت ہونی چاہیئے۔بقول ڈاکٹر الطاف فاطمہ:

''مولوی افتخار عالم نے بڑی محنت اور دماغ سوزی سے مولانا نذیراحمد کی یہ سوانح عمری تیارکی ہے۔'' ۲۶

حیات النذیر کے متعلق مولانا حالی کی یہ رائے بڑی مناسب ہے۔

''حیات النذیر میں مصنف نے مولانا نذیراحمد کی زندگی،ان کی طرز ماند وبود،ان کے اخلاق ،عادات ،ان کے واقعات ومشاغل ،ان کے اعتقادات،ان کی رایوں کا جوصحیح نقشہ خودانھیں کی تصنیفات وتحریرات کی بنا پر کھینچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات مذکورہ کے تفحص اور جستجو میں سعی وکوشش کا پوراپوراحق ادا کیا گیا ہے کہ ایک بڑے آدمی کی سچی بائیوگرافی سے جو گراں بہا فائدے آئندہ نسلوں کو پہنچ سکتے ہیں ان کو پہنچانے میں تابمقدورکوتاہی یا بخل نہ کیا جائے۔'' ۲۷

## قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی سوانح نگاری:

قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری (۱۹۳۰ء) کی تصنیف رحمتہ للعالمین کاتعلق بیسویں صدی کے ربع اول سے ہے۔یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کی پہلی جلد۱۹۱۲ء میں ،دوسری جلد۱۹۱۲ءاور تیسری جلد مصنف کے انتقال کے بعد۱۹۳۳ءمیں شائع ہوئی۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا بیان ہے۔

''سالہا سال سے یہ آرزوتھی کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی سیرت پر تین

کتابیں لکھوں۔(۱)مختصر(۲)متوسط(۳)مفصل۔'' ۲۸

مختصر کتاب انہوں نے ''مہر بنوت'' کے نام سے لکھی۔ یہ پہلی بار ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ کم وبیش پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔زبان عام فہم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کے لئے لکھی ہے۔۲۳ سالہ دور نبوت کا خلاصہ ہے اور حضور علیہ السلام کی سیرت کے تمام پہلوؤں کو انتہائی اختصار کے ساتھ آسان انداز میں بیان کیا ہے۔

متوسط کتاب کو انہوں نے ''رحمتہ للعالمین'' کے نام سے موسوم کیا۔اپنی خواہش اور آرزو کے مطابق سیرت پاک پر مفصل کتاب نہ لکھ سکے۔رحمتہ للعالمین کی تیسری جلد لکھنے کے بعد قاضی صاحب حج کے لئے تشریف لے گئے اور واپسی پر جہاز ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔آپ کے انتقال کے بعد ایک عرصے تک یہ مسودہ آپ کے سامان میں بند رہا۔پھر سید سلیمان ندوی نے تلاش کر کے اسے شائع کرایا۔خود سلیمان ندوی کا اپنا بیان ہے:

> ''آج سے بیس سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے اپنی سیرۃ النبی کی تجویز اہل ملت کے سامنے پیش کی تھی۔اس کے جواب میں ہر طرف سے تائید کی آوازیں بلند ہوئیں۔صرف ایک آواز مخالف میں اٹھی۔ یہ مولوی انشاء للہ خان مرحوم ،ایڈیٹر ''وطن'' لاہور کی آواز تھی۔ انہوں نے لکھا کہ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری چونکہ اس کے لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔اس لئے مولانا شبلی کو تکلیف کی ضرورت نہیں۔اس کے بعد خاموشی سے بیس برس گزر گئے اور دونوں مصنفوں کی تصنیفوں کی کئی جلدیں ارباب شوق کے سامنے پیش ہوئیں اور دونوں نے قبولیت کی عزت پائی۔پھر کس کو خیال آسکتا تھا کہ یہ دونوں مصنف آگے پیچھے اس دنیا کو خیر باد کہیں گے اور ان دونوں کے بعد ایک تیسرا شخص آئے گا جو فیض و برکات کے ان دو مختلف سوتوں کو ملا کر ایک چشمہ بنا دے گا۔خدا کے سامنے میں اس کی دی ہوئی اس عزت پر نازاں ہوں کہ اس نے بزرگوں کے متروکات کی تکمیل کی سعادت میرے حصہ میں رکھی۔'' ۲۹

''مہر نبوت''اور''رحمتہ للعالمین'' کے علاوہ قاضی صاحب کی دو کتابیں اور ہیں۔جن میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے حالات زندگی کی اجمال واختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔(ا) بدرالبدور، یہ بنیادی طور پر شرکائے بدر کا تذکرہ ہے۔مگران میں نبی علیہ السلام سرفہرست ہیں۔اس لئے آپ صلی علیہ وسلم کے ذکر جمیل سے ابتداء کی گئی ہے۔(۲) دوسری کتاب ''سیدالبشر'' ہے۔یہ سیرت النبی کے موضوع پر قاضی صاحب کی چار تقریروں کا مجموعہ ہے۔اسے ان کے ہم وطن قاضی ابوالفضل حبیب الرحمٰن طارق نے مرتب کر کے مصنف کی وفات کے پندرہ سال بعد۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔

مہر نبوت، بدرالبدر واور سیدالبشر، اپنی اپنی جگہ اہم سہی، لیکن قاضی صاحب کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مظہر اور علم وتحقیق کی اصل جولان گاہ ان کی تصنیف''رحمتہ للعالمین'' ہے جسے انہوں نے کامل علمی دیانت اور مورخانہ احتیاط کے ساتھ لکھا ہے۔اس کتاب کے بارے میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> ''اہل خبر آگاہ ہیں کہ سیرت نبوی صلی علیہ وسلم کا لکھنا کس قدر مشکل کام ہے۔اگر ذرہ بے مقدار خورشید جہاں افروز کے نور گیتی آراء کا کمیال بن سکتا ہے تو مجھ سے بے بضاعت کثیر الاشغال بھی، جس کا اس راہ میں کوئی یار ومددگار نہیں، درست طور پر کچھ لکھ بھی سکتا ہے۔۔۔لیکن ایک فرض کا احسان ہے کہ سکوت پر غالب آگیا ہے اور درد محبت ہے، جس نے بے حس قلب کو تڑپا دیا ہے۔توفیق الٰہی ہے جو برابر اس کام پر مجھے لگائے رکھتی ہے۔جذبہ ربانی ہے جس کی کشش اس طریق حق پر لئے جاتی ہے۔''[۳۰]

اس فرض شناسی، درد محبت، توفیق الٰہی اور جذبہ صادق نے ان سے ایک ایسی کتاب لکھوائی جو سیرت رسول صلی علیہ وسلم پر اردو میں نہ صرف ایک جامع اور مفصل کتاب ہے بلکہ استناد کے بھی اونچے مقام پر فائز ہے۔

''رحمتہ للعالمین'' کی پہلی جلد ایک مقدمہ اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔مقدمہ میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات سے آغاز کر کے آپ کے اجداد کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔پھر عہد جاہلیت کے عرب کا نقشہ کھینچنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی برکات

اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں۔ پھر انبیاء کی صفات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا موازنہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان نبوت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

اس کتاب کا پہلا باب، میثاق مدینہ، غزوات کی ابتداء، غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ احزاب، فتح مکہ، غزوہ تبوک، اسیران جنگ سے نبی علیہ السلام کا حسن سلوک پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب، سربراہان مملکت کے نام دعوتی خطوط، دعوت اسلام کے لئے مختلف قبیلوں اور بادشاہوں کی طرف سفارتیں۔ تیسرا باب، ان وفود کے حالات جو فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ چوتھا باب، مدنی زندگی کے اہم واقعات مثلاً مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر، سلسلہ مواخاۃ، تحویل قبلہ، فرضیت زکوٰۃ، فرضیت صوم، صلح حدیبیہ، حجتہ الوداع، وصال۔ اور پانچواں باب، بنی علیہ السلام کے اخلاق حسنہ کا بیان، قرآن حکیم کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔

''رحمتہ للعالمین'' کی دوسری جلد آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ابتداء میں مصنف نے وضاحت کی ہے کہ ''دوسری جلد ایسے مضامین پر مشتمل ہے۔ جنہیں اکثر سیرت نگار کتاب کے اول حصے میں جگہ دیا کرتے ہیں۔ مگر میں نے جلد اول میں ایسے اہم اور بنیادی مضامین کو جمع کیا کہ اگر بقیہ جلدیں نہ لکھ سکوں، یا شائع نہ ہو سکیں تب بھی وہ نقش ناتمام کی صورت میں ادھورا اور نامکمل نظر آئے گا''۔ چنانچہ دوسری جلد میں، پہلی جلد کے بعض مضامین کی توضیح وتشریح ہے اور بعض نئے مباحث ہیں۔ ابواب کی تفصیل اس طرح ہے:

پہلا باب نبی علیہ السلام کا شجرہ نسب، شجرہ طیبہ کی تحقیق میں مصنف نے بڑی محنت کی ہے اور بعض ایسی معلومات جمع کی ہیں جو سیرت لٹریچر میں نوادر کا درجہ رکھتی ہیں۔ دوسرا باب امہات المومنین رضی اللہ عنہما کے مبارک تذکرے کے لئے وقف ہے۔ تیسرا باب غزوات وسرایا۔ ہر غزوہ کا الگ بیان، لشکر اسلام اور دشمن کی تعداد، حربی قوت کا موازنہ، اس باب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے حضور علیہ السلام کی دس سالہ مدنی زندگی میں ہونے والے جہاد کا موازنہ پہلی جنگ عظیم سے کیا ہے۔ مہابھارت اور یورپ کی مقدس جنگوں میں جو جانی نقصان ہوا، اس کا بھی ذکر ہے۔ غزوات وسرایا کے شہداء کی فہرستیں بھی شامل کی ہیں۔

چوتھے باب میں عیسائیوں کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم میں بیان کئے گئے قصے اور واقعات ایک عیسائی عالم سے سن کر اپنی زبان میں ڈھال لئے تھے۔اس بات کا بھی جواب دیا کہ مشرکین عرب پچھلے انبیاء اوران کی قوموں کے حالات کو اساطیر الاولین (پچھلے لوگوں کے غیر حقیقی قصے کہانیاں ) کہتے تھے۔اس باب میں مصنف نے یہ ثابت کیا کہ قرآن حکیم کی تعلیم دوسری آسمانی کتابوں سے کئی گناہ زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔پانچواں باب سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت ظاہر وثابت کی گئی ہے۔چھٹا باب نبی اکرم صلی علیہ وسلم کی سب سے بڑی،اور جامع صفت ''رحمتہ للعالمین'' کے لئے مخصوص ہے۔قرآن حکیم کی آیت سے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ذات اقدس تمام ،تمام زمانوں اور تمام جہانوں کے لئے سراپا رحمت ورافت ہے۔ساتواں باب کا مرکزی موضوع ''حب النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے۔اس باب میں یہ بات ثابت کی ہے کہ پوری کائنات اورنسل انسانی میں نبی علیہ السلام سے زیادہ کسی اور ذات اور شخصیت سے محبت نہیں کی گئی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی بھی محبوب خلائق ،محبوب ملائک اور محبوب خدا نہیں ہوا۔

آٹھواں باب واقعات سیرت کو قلم بند کرتے وقت مصنفین کو یہ بات بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ دن اور تاریخ میں تطابق نہیں ہوتا۔کبھی دن صحیح ہوتا ہے اور تاریخ غلط ہو جاتی ہے اور کبھی تاریخ صحیح ہوتی ہے تو دن غلط ہو جاتا ہے۔قاضی صاحب نے ہجری سنہ اور تاریخ میں تطابق پیدا کرنے اور معلوم کرنے کا طریقہ بتایا ہے اور باقاعدہ جدولیں بنا کر اسے آسان کر دیا ہے۔

رحمتہ للعالمین کی تیسری جلد تین ابواب پر مشتمل ہے۔تیسری جلد کے تینوں ابواب انتہائی اہم بھی ہیں اور طویل بھی۔پہلی دو جلدوں کی طرح تیسری جلد بھی ایڈیشنوں کے اختلافات کے باوجود چار سو صفحات سے زائد پر مشتمل ہے۔لیکن صرف تین ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب کا عنوان ''خصائص النبی'' دوسرے باب کا عنوان ''خصائص القرآن'' اور تیسرے باب کا عنوان ''خصائص الاسلام'' ہے۔گویا اس جلد کا موضوع اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن کے امتیازی خصائص ہیں۔علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''پیش نظر حصہ کہنے کو خصائص محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں ہے،
مگر درحقیقت اس میں اسلام کے ان امتیازیات اور خصوصیات کا خاکہ

ہے جس کی بنا پر اس کو ''دین کامل'' کا خطاب ملا۔اسی طرح اس میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فضائل ومحامد درج ہیں جن کی بنا پر آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم اور مکمل دین کا پر فخر خطاب
باری تعالیٰ سے عطا ہوا ہے۔مصنف کے دلائل ایسے دل نشین اور طرز ادا
ایسا متین ہے کہ اس کی یہ تصنیف ہر صاحب ذوق کے لئے باعث تسکین
ہوسکتی ہے۔زمانہ حال نے خیالات میں جو تغیر اور طریق تبلیغ میں انقلاب
پیدا کیا ہے،مصنف مرحوم نے اس کی پوری طرح نگہداشت کی ہے اور
اسلام اور پیغمبر اسلام کے وہ تمام امتیازات ومحاسن جو اس دور میں کسی
حیثیت سے بھی پیش کرنے کے لائق تھے مرحوم نے ان کا پورا احاطہ کیا
ہے،اور کہیں سے کوئی کارآمد نکتہ نہیں چھوڑا۔'' ۳۱

رحمتہ للعالمین کی تیسری جلد، بلکہ یوں کہئے کہ پوری کتاب کا انتہائی اہم باب خصائص النبی کا ہے۔ پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ عربی میں متقدمین کی چند کتابیں اس موضوع پر اگرچہ موجود ہیں مگر سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتابیں لکھی گئیں اور جن میں پوری سیرۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بیان کرنے کی کوشش کی،ان میں یہ موضوع یا تو سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت اجمال واختصار کے ساتھ۔اردو میں لکھی جانے والی کتب سیرت میں عام طور پر اس موضوع کو شامل نہیں کیا جاتا۔بعض کتب سیرت میں اگر ہے تو بہت مجمل و مختصر جیسے علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت المصطفیٰ میں۔اردو میں اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی نہیں ہیں۔

رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اردو میں لکھی جانے والی (سیرت کے موضوع پر) پہلی کتاب ہے جس میں خصائص النبی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے،اور اس بحث کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے خصائص کا استنباط زیادہ تر قرآنی آیات سے کیا ہے کیوں کہ اللہ سے بڑھ کر حضور علیہ السلام کے خصائص نہ کوئی جانتا ہے،اور نہ جان سکتا ہے۔مصنف نے اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں وجود گرامی کی بحث ہے،اور دوسرے حصے میں خصائص نبوت کا تذکرہ ہے اور آخر میں اسمائے مبارکہ میں سے چند اسمائے عالیہ لکھ کر باب کو ختم کر دیا ہے۔

دوسرا باب ''خصائص القرآن'' ہے۔اس موضوع پر مصنف نے جلد اول میں بھی بحث کی تھی لیکن یہاں بحث کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے باہمی تعلق کے بارے میں یہاں بھی قاضی صاحب کہتے ہیں کہ:

''قرآن کریم وہ پاک کتاب ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ بنا کر اپنی زبان مبارک سے حرفاً حرفاً سنایا،لہذا سیرت نگار کا فرض ہے کہ قرآن مجید کے متعلق بھی ضروری مباحث کو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ پیش کرے۔'' ۳۲؎

اس باب کی فصل اول میں قرآن کی ضرورت اور اس کی فصاحت و بلاغت پر،فصل دوم میں اس کے معانی،عالیہ ومضامینِ نادرہ پر،فصل سوم میں اس کی تاثیر پر،فصل چہارم میں اس کی تعلیم کے جیتے جاگتے نمونوں (صحابہ کرام) پر،فصل پنجم میں اس کی ہمہ گیر مقبولیت پر،فصل ششم میں اس کی خصوصیات پر،فصل ہفتم میں اس کے کلام الٰہی ہونے پر اور فصل ہشتم میں اس کی پیشن گوئیوں پر طویل بحث کی گئی ہے صرف پیشن گوئیوں والا حصہ ۵۸ صفحات پر محیط ہے۔

اس جلد کا تیسرا باب ''خصائص الاسلام'' کے بارے میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام دین التوحید ہے۔مصنف نے قرآنی آیات کی مدد سے نہ صرف اسلام کے مسئلہ توحید کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے بلکہ اسے اعلیٰ درجے کی روحانیت کا حامل مذہب قرار دیتے ہوئے اخلاق عالیہ کا معلم ثابت کیا ہے۔ مصنف نے اس کی خدمات گنواتے ہوئے کہا ہے کہ

''اسلام نے رحم وعدل کا مسئلہ حل کیا،علم اور علماء کی حمایت کی خود کو علمی دین ثابت کیا،یہ بانی اخوت ہے،مدراج انسانیت طے کرنے والا ہے، غیر متعصب ہے،دین محبت ومساوات ہے،رعایا کو حکومت کے کاروبار میں شریک کرنے والا اور قومیت کی حدود سے بالا کرنے والا مذہب ہے۔یہ آج بھی اپنے گہوارہ میں قائم ہے اور تہذیبی وتمدنی،دینی ودنیوی ہر اعتبار سے اقوام عالم کے لیے فیض رسان ہے۔یہ خدائی ہدایت کی ہمہ گیریت کا قائل ہے اور نیکی و پارسائی،حق وصداقت اور حسن و جمال کا

مذہب ہے۔'' ۳۳؎

سوانح نگاری کا یہ بنیادی اصول ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق جس قدر کتابیں دستیاب ہوں، ان کا بے لاگ مطالعہ کیا جائے اور ان میں سے صرف وہی واقعات اخذ کئے جائیں جو معیارِ تحقیق پر پورے اتریں۔ ''رحمتہ للعالمین'' کی تالیف کے وقت قاضی صاحب نے یہی اصول سامنے رکھا ہے۔ انہوں نے نہ تو عقیدت کے آبگینوں کو ٹھیس لگنے دی ہے اور نہ حقائق کو مسخ کیا ہے۔ انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت وشیفتگی برقرار رکھتے ہوئے کتب تاریخ وسیر میں سے صرف ایسے واقعات چنے ہیں جو ہر لحاظ سے مستند ہیں۔ مراجع ومصادر کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ قاضی صاحب نے صرف اسلامی علوم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ غیر مذاہب کی مقدس کتابوں کی بھی ورق گردانی کی ہے اور یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی مضبوط شواہد بہم پہنچا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''رحمتہ للعالمین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے ذوق کے مطابق سوانح اور واقعات کے ساتھ غیر مذہب کے اعتراضات کے جوابات اور دوسرے صحائف آسمانی کے ساتھ موازنہ اور خصوصیت سے یہود ونصاریٰ کے دعاوی کا ابطال بھی اس میں جا بجا موجود ہے۔ مصنف مرحوم کو توراۃ اور انجیل پر مکمل عبور حاصل تھا اور عیسائیوں کے مناظرانہ پہلوؤں سے جامع پوری واقفیت تھی۔ اسی بنا پر ان کی یہ کتاب ان تمام معلومات کا جامع خزانہ ہے۔'' ۳۴؎

قاضی سلیمان منصور پوری نے بائبل کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ بے شمار حوالے پیش کئے جا سکتے ہیں جو ''رحمتہ للعالمین'' کی تینوں جلدوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات کے لئے انہوں نے اس کتاب کا ورق ورق کھنگالا، اس لئے کہ صرف یہی کتاب عیسائی پادریوں کے لئے قابل حجت تھی۔ یوں بھی عہد نامہ قدیم وجدید (یعنی تورات، زبور، انجیل اور دیگر صحائف آسمانی) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جا بجا بشارتیں موجود تھیں اور ان سے قرآن مجید، احادیث اور کتب سیر کے بیانات کی تصدیق ہوتی تھی۔ چنانچہ ''رحمتہ للعالمین'' میں ابتداء سے ہی

یہودیوں اورعیسائیوں کی اس مذہبی کتاب کے حوالے سے شروع ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب جب بھی رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے بارے میں کوئی واقعہ لکھتے ہیں تو اس کی تائید کے لئے ویسا ہی حوالہ بائبل سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔مثلاً رحمتہ للعالمین کے پہلے باب میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے نام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''دادا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد اور ماں نے خواب میں ایک فرشتے سے بشارات پا کر احمد رکھا تھا اور فٹ نوٹ میں واضح کرتے ہیں کہ سیدہ آمنہ بی بی کو نام رکھنے کی بشارت فرشتے کی معرفت ایسے ہی ملی تھی جیسے کہ فرشتے کی بشارت سے ہاجرہ بی بی نے اسمٰعیل کا نام (پیدائش ۱۶/۱۱) اور مریم نے یسوع کا نام (لوقا اول باب ۳۱ درس) رکھا تھا۔''

۳۵

بائبل سے غیر شغف کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قاضی صاحب نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل منابع یعنی قرآن حکیم، کتب سیر و مغازی، اور کتب شمائل کو نظر انداز کر دیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زیادہ قابلیت اور جامعیت کے ساتھ اردو کتب سیرت میں قاضی صاحب سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مراجع اور منابع تک رسائی حاصل کی ہے۔ممتاز فاخرہ ''رحمتہ للعالمین'' کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

''سوانح عمری میں مصنف نے تحقیق کا سائنٹفک انداز اختیار کیا ہے۔ تحقیق کا یہ انداز اسے دوسری تمام سیرتوں سے جدا اور نیا رنگ عطا کرتا ہے۔'' ۳۶

بہرکیف رحمتہ للعالمین اردو میں لکھی جانے والی ایک مکمل سوانح عمری ہے اور اردو کے سیرت لٹریچر میں ایک جامع اور مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

## مولانا عبدالسلام ندوی کی سوانح نگاری:

مولانا کا شمار اردو کے نمائندہ سوانح نگاروں میں ہوتا ہے۔مولانا شبلی جن مذہبی اور علمی کاموں کو اپنی

زندگی میں پورا نہ کر سکے،ان کی تکمیل کے لئے اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کو وصیت کر گئے تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہی دسمبر۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے دارالمصنفین قائم کیا تو مولانا عبدالسلام صاحب کوکلکتہ سے اعظم گڑھ بلالیا اس وقت سے لیکر وفات تک وہ برابر دارالمصنفین سے وابستہ رہے۔انہوں نے دارالمصنفین کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی بحثییت ادیب ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے،اس لئے انھوں نے اپنا دائرۂ عمل تالیف وتصنیف ہی تک محدود رکھا اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر تصنیفی کاموں کو انجام دیتے رہے۔اور وہ دارالمصنفین کے اہم رکن تھے۔مولانا عبدالسلام ندوی کی دلچسپی کسی خاص فن تک محدود نہ تھی۔شعروادب سے ان کو فطری لگاؤ تھا لیکن فن سوانح نگاری سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔سیرت عمر بن عبدالعزیز اور اقبال کامل ان کی فن سوانح نگاری کا بہترین مثال ہیں۔

## سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ:

خلافت راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید وانقلاب کی فوری ضرورت پیدا کردی،قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت اور خلافت راشدہ کے آثار سے دب گئے تھے،نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے،حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا،کتاب وسنت نہیں رہا بلکہ عربی سیاست اور ''مصالح ملکی'' بن گیا،تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کردیا تھا،اور جو بادیہ عرب میں پناہ گزیں تھی،پھر واپس آگئی،قبائلی غرور،خاندانی جنبہ داری،اعزہ پروری جو خلافت راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی ہنر اور محاسن بن گئے،اعمال واخلاق کے محرکات بجائے اجر وثواب کے جاہلی ناموری، مدح وتعریف اور تفوق ہو گئے۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی،ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک سیدنا حسینؓ کا اقدام،دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا مقابلہ ناکام ہو چکا تھا،کسی انقلاب کا دور دور تک امکان نظر نہیں آرہا تھا،شخصی وموروثی حکومت نے اصلاح وتبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے،اس وقت اسلام کو

غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے مرد مجاہد کی ضرورت تھی۔

یہ مرد مجاہد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھا، جو خود بانی خاندان ''مروان'' کے پوتے اور ان کی ماں ام عاصم فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سنجوگ اسی لئے ہوا تھا کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفہ راشد پیدا ہو جو ایسا انقلاب برپا کرے کہ عہد صحابہؓ سے ملا دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جسے مولانا عبدالسلام ندوی نے یوں تحریر کیا ہے:

> ''خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کا دور حکومت شروع ہوا، جس میں بڑے بڑے فرماں روا گزرے.........لیکن ان میں صرف عمر بن عبدالعزیزؒ ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے زمانہ کی باگ پھیر کر اس کو عہد صحابہؓ سے ملا دیا، اس لئے محدثین نے ان کو مجدد دین اسلام میں شمار کیا ہے۔'' ۳۷

اسلام کے اس انقلابی ہیرو اور مجدد اعظم کی حالات زندگی، فضائل و مناقب، اخلاق و عادات کو عربی زبان کے بہت سے مصنفین نے اپنی تصنیف کا حصہ بنایا ہے، جن میں ابن جوزی اور طبقات ابن سعد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی اس سوانحی تصنیف کا خصوصی ماخذ انہی دو کتابوں کو قرار دیتے ہوئے اردو کے ان مصنفین سے شکوہ کناں ہیں جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فضائل و مناقب پیش کرنے میں ان دونوں کتابوں سے بے اعتنائی برتی ہے، چنانچہ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''لیکن اردو میں جن لوگوں نے ان کے حالات لکھے ہیں، انہوں نے صرف سیاسی تاریخوں کو پیش نظر رکھا ہے، اور ان دونوں کتابوں سے مطلق فائدہ نہیں اٹھایا ہے، حالانکہ ان کے اخلاق و عادات، فضائل و مناقب اور مجددانہ کارناموں کا اصلی ذخیرہ انہی کتابوں میں مل سکتا ہے، اس لئے ہم نے اور کتابوں کے ساتھ ان دونوں کتابوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی تصنیف کا ماخذ قرار دیا ہے۔'' ۳۸

''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' مولانا عبدالسلام ندوی کی قابل ذکر سوانحی تصنیف ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کو انہوں نے کیوں منتخب کیا، اس کے متعلق دیباچہ سیرت عمر بن عبدالعزیز میں تحریر فرماتے ہیں:

''اسلام کا روشن ترین زمانہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا اور خلافت راشدہ تک پہنچ کر ختم ہوگیا، اس لئے خلفائے اسلام کا قابل فخر کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے دنیا کو اس نقطۂ نورانی سے آگے بڑھایا، بلکہ ان کا حقیقی شرف یہ ہے کہ انہوں نے زمانہ کو اس قدر پیچھے ہٹایا کہ وہ عہد صحابہؓ سے جا کر مل گیا۔'' ۳۹؎

مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ تصنیف ۱۹۲۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی، اس سے پہلے اردو زبان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی کوئی مستند اور سیر حاصل سوانح عمری نہیں تھی ۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے اپنی اسی تصنیف کے بارے میں ایک نہایت عمدہ بات لکھی جسے یہاں درج کرنا مناسب ہوگا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''ہماری زبان میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان مرقعوں میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تصویر کے اصلی خدوخال نمایاں نہیں ہوسکتے، اس لئے ان کے شایان شان ایک دوسری تصنیف کی ضرورت تھی، اور اسی ضرورت نے مجھ کو اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا۔'' ۴۰؎

اس کتاب ''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کو فن سوانح نگاری کے جملہ اصول وضوابط سے کسی حد تک واقفیت تھی، انہوں نے اپنی اس سوانحی تصنیف کو دس ابواب میں منقسم کیا ہے، اور اپنے ہیرو کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو ان ابواب کا عنوان مقرر کیا ہے، جو کچھ اس طرح سے ہے''نسب اور خاندان، صفحہ ۱۶ تا ۲۸، خلافت، صفحہ ۲۹ تا ۲۷ جس میں آپ کی وفات اور جریر کے مرثیہ پر تبصرہ بھی شامل ہے، ازواج واولاد، صفحہ ۷۳ تا ۷۷، اخلاق وعادات، صفحہ ۷۸ تا ۱۱۸، اعمال وعبادات، صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۱، کارنامہائے زندگی، صفحہ ۱۳۲ تا ۱۶۵، تدوین حدیث، صفحہ ۱۶۶ تا ۱۷۴، عمارات، صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۷، سیاست وحکومت، صفحہ ۱۷۸ تا ۲۱۷، مآثر بنوامیہ، صفحہ ۲۱۸ تا ۲۳۹ پر مشتمل ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے ہیرو کی سنہ ولادت اور جائے پیدائش کے متعلق دو اقوال بیان کئے ہیں، جس میں انہوں نے قول ثانی کو ترجیح قرار دیا ہے ملاحظہ ہو:

''حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مصر کے ایک گاؤں 'حلوان' میں جس کے امیر ان کے باپ تھے، سن ۶۱ ھ یا سن ۶۳ ھ میں پیدا ہوئے، لیکن علامہ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ وہ یزید کے زمانہ خلافت میں مدینہ میں پیدا ہوئے، اور اپنے باپ کے گورنری کے زمانہ میں مصر میں نشو ونما پائی، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔'' ۴۱

بہر حال مولانا عبدالسلام ندوی کی ترجیحی رائے کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ میں پیدا ہوئے اور جب بڑے ہوئے تو ان کے والد عبدالعزیزؒ مصر کے گورنر مقرر ہوئے اور وہاں سے انہوں نے اپنی بی بی ام عاصم کو لکھا کہ اپنے بچے کو لے کر مصر آ جائیں، انہوں نے اس کی اطلاع اپنے چچا حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دی، تو انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو چھوڑ کر جانے کا مشورہ دیا، اور کہا ''وہ تم میں ہم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے'' لہٰذا وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو ان کے پاس چھوڑ کر چلی گئیں، جب ان کے والد نے ان کو نہیں دیکھا تو دریافت کیا! عمر کہاں ہے؟ انہوں نے واقعہ بیان کیا، تو بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے ہزار دینار ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد اپنے والد کے پاس مصر چلے گئے، اس طرح انہوں نے شروع سے ہی ناز ونعمت کے آنگن میں پرورش پائی، اس کے بعد تعلیم وتربیت کا مرحلہ آیا، آپ کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''...ایک واقعہ کے پیش آ جانے سے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان کی تعلیم مدینہ ہی میں ہو، چنانچہ ان کو مدینہ بھیج دیا اور انہوں نے وہیں صالح بن کیسان کی اتالیقی میں تعلیم وتربیت پائی۔'' ۴۲

اور صالح بن کیسان نہایت متقی و پرہیز گار اور علمائے مدینہ میں بڑے پایہ کے محدث تھے، انہوں نے جس دیانت کے ساتھ ان کی مذہبی واخلاقی نگرانی کی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے، جس کو مولانا عبد السلام ندوی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''کہ ایک بار انہوں نے نماز میں تاخیر کی، اور صالح بن کیسان نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا ''بال سنوارنے میں دیر ہوگئی'' بولے کہ 'اب بالوں کی

آرائش کونماز پر ترجیح دیتے ہو؟! چنانچہ عبدالعزیز کواس واقعہ کی خبر کی، اور
انہوں نے فوراً ایک آدمی روانہ کیا جس نے آکر پہلے ان کے بال
منڈوائے، اس سے بات چیت کی۔ غالباً یہی اثر تھا جس کی بنا پر حضرت
عمر بن عبدالعزیز نے ان کو اپنی اولاد کا اتالیق بھی مقرر کیا۔'' ۴۳؎

عمر بن عبدالعزیز خلیفہ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی تھے، اوراس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اوراس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے گورنر تھے، ان کی جوانی اورامارت کوان کی خلافت کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر بن عبدالعزیز گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

اس سوانح عمری کا وہ حصہ بہت ہی دلچسپ ہے، جس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زندگی کے نشیب وفراز بیان کئے گئے ہیں، ایسا نہیں ہوا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے عقیدت ومحبت میں آکر غیر جانبدارانہ طور اختیار کیا ہے، اوراپنے ہیرو کی صرف خوبیاں ہی خوبیاں بیان کی ہے، اورفنی خصوصیات سے کسی طرح کی بے اعتنائی برتی ہے، بلکہ سوانح نگار کو ہیرو کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں سے بھی محبت ہے، عبدالسلام ندوی بحیثیت سوانح نگار ایسے موقعوں پر بڑی فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہیں اوراپنے محبوب ہیرو کے ان لغزشوں کو بڑی صاف دلی سے بیان کرتے ہیں جو مدینہ کی گورنری کے دوران ان میں موجود تھیں، وہ لکھتے ہیں:

''خلافت سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک مغروراور جاہ پسند شخص
تھے، نہایت عمدہ کپڑے پہنتے تھے، نہایت عمدہ خوشبو لگاتے تھےاورراہ میں
اکڑتے ہوئے چلتے تھے۔'' ۴۴؎

خلافت سے پہلے ان کی حالت یہ تھی کہ:

روز نئے کپڑے بدلتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جب میرے کپڑوں کو

لوگ دیکھ لیتے تھے تو میں سمجھتا تھا کہ پرانا ہوگیا۔'' ۴۵؎

لیکن یہ تمام کمزوریاں اس وقت تک تھیں جب تک کہ وہ خلیفہ نہیں بنے تھے۔عہدہ خلافت سنبھالتے ہی آپ کی زندگی میں اس قدر تبدیلی آئی کہ زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناخداترس تھے،ان کے سامنے شاہی تزک واحتشام اور جانشینی کا جوسامان پیش کیا گیا،اس کو بیت المال میں داخل کیا،اوراسی گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی،اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن خطابؓ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعدان کے خاندانوں اورشہروں کوواپس کردیا،مظالم کا صفایا کیا،اوراپنی مجلس کوجس نے کسریٰ وقیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کرلی تھی،سنت اورخلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اورسنت کے مطابق بنادیا،اپنی جاگیر مسلمانوں کوواپس کردی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا،انہوں نے ایسی زاہدانہ زندگی اختیار کی جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے،درویشوں اورفقیروں میں بھی ملنی مشکل ہے،لباس میں ایسی کمی کی کہ بعض اوقات کرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا،بنی امیہ جوساری سلطنت کواپنی جاگیراور بیت المال کواپنی ملکیت سمجھتے تھے،اب اپنانپا تلا حصہ پاتے،خودان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے،وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے،سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے،روکرفرمایا کہ کیاتم اس پر راضی ہو کہ تم انوع واقسام کے کھانے کھاؤ اورتمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کروہ بھی روپڑیں،اس وقت جبکہ وہ روئے زمیں کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمراں تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجودشوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا،نوکر سے جوان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟اس نے کہا کہ دس بارہ دینار،کہا کہ اس میں حج کیسے ہوسکتا ہے؟اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارکباد دی،اورکہا کہ حج کا سامان آگیا،فرمایا ہم نے اس مال سے بہت فائدہ اٹھایا ہے،اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کراس کو بیت المال میں داخل کردیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے خلافت بادشاہت کی شکل اختیار کرچکی تھی،انہوں نے اپنے اجتہادات اور کارناموں سے عہد صحابہ کرامؓ کی یادیں تازہ کردی اوریہی مولانا عبدالسلام ندوی کا پسندیدہ پہلو ہے،خلافت سے پہلے ہیرو پرنخوت،متکبر،نازک مزاج اور جاہ پسند نظر آتا ہے،لیکن خلافت کے

بعد کا کردار مصنف کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ''خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی ان کے اخلاق و عادات میں جو عظیم الشان انقلاب ہوا اس نے عُجب وغرور کو تواضع اور انکساری سے بدل دیا، جب وہ مدینہ کے گورنر تھے تو وضع قطع سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ گورنر نہیں ہیں، لیکن خلیفہ ہونے کے بعد کسی نے یہ نہیں جانا کہ وہ خلیفہ ہیں۔'' ۴۶؎

سیرت بن عبدالعزیز کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کو اپنے ہیرو سے بہت عقیدت و محبت تھی کیونکہ جب وہ اپنے ہیرو کا حلیہ بیان کرتے ہیں تو اس سے بھی ان کی زندگی میں زہد وتقویٰ، تقشّف اور خشیت الٰہی جیسے مجاہدانہ صفات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا رنگ سفید، چہرہ پتلا، اور آنکھیں گہری تھیں، بچپن میں گھوڑے نے پیشانی پر لات ماری تھی، جس کا نشان باقی تھا، اور اس سے وہ ''اشج بنوامیہ'' کہلاتے تھے، اخیر عمر میں بال سفید ہونے لگے تھے، جسم لاغر تھا، اور یہ غالباً زہد وتقشّف کا اثر تھا۔'' ۴۷؎

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت خوش خلق اور نرم خو تھے، چند خاص لوگ تھے جن سے رات کو معاملات خلافت کے متعلق مشورہ لیا کرتے تھے، لیکن جب ان کا جی چاہتا کہ یہ لوگ یہاں سے اٹھ جائیں تو صرف اس قدر کہتے کہ اگر آپ لوگ چاہیں۔ ایک بار چند آدمیوں کے پاس غلطی سے بغیر سلام کئے ہوئے بیٹھ گئے، یاد آیا تو اٹھ کر سب کو سلام کر لیا تو بیٹھے۔

مولانا عبداسلام ندوی کی تحریروں میں بہت کچھ رنگ علامہ شبلی کا نظر آتا ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ انہوں نے علامہ سے ایک مدت تک علمی استفادہ کیا ہے، مثلاً جس طرح علامہ شبلی اپنی سوانحی تصنیفات میں جزئیات کے ذریعہ اپنے ہیروز کی خوبیاں بڑی لطف کے ساتھ بیان کرتے اور ہیروز کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں، انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اپنے ہیرو کی وصف بیانی میں جزئیات سے خوب کام لیا ہے، اور ان کے ہر گوشہ زندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً:

> ''لوگ ان کے سامنے کھڑے ہوئے تو فرمایا ''اگر تم کھڑے رہو گے تو ہم بھی کھڑے ہو جائیں گے، اور تم لوگ بیٹھو گے تو ہم بھی بیٹھیں گے،

لوگوں کوصرف خدا کے سامنے کھڑا ہونا چاہیئے۔'' ۴۸؎

مولانا عبدالسلام ندوی نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بطور جزئیات کے پیش کیا ہے، ان منقول واقعات میں سے صرف دو واقعہ بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ لگتا ہے کہ واقعتاً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ایسی ہی شخصیت تھی۔ ملاحظہ ہو:

''ایک بار رات کو رجاء بن حیوۃ سے گفتگو فرما رہے تھے، کہ دفعتہً چراغ جھلملانے لگا، پہلو ہی میں ایک ملازم سویا ہوا تھا، رجاء نے کہا اس کو جگا نہ دوں! بولے سونے دو انہوں نے کہا میں خود اٹھ کر چراغ کو ٹھیک کر دوں ''فرمایا'' مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے، بالآخر چادر رکھ کے خود ہی اٹھے، برتن سے زیتون کا تیل لیا اور چراغ کو ٹھیک کر کے پلٹے تو کہا'' جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا اور جب لوٹا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں۔'' ۴۹؎

انہوں نے باوجود خلیفہ ہونے کے کبھی اپنے آپ کو عام مسلمانوں بلکہ لونڈی غلاموں سے بھی بالاتر نہیں سمجھا، ملاحظہ ہو:

''ایک بار لونڈی ان کو پنکھا جھل رہی تھی، کہ اس حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی، انہوں نے خود پنکھا لے لیا، اور اس کو جھلنے لگے، وہ جاگی تو شور کیا، بس بولے تو بھی میری طرح ایک آدمی ہے، میری طرح تجھے بھی گرمی معلوم ہوئی اس لئے میں نے چاہا کہ جس طرح تو نے مجھے پنکھا جھلا ہے میں بھی تجھے پنکھا جھل دوں۔'' ۵۰؎

مذہب، سیاست، اخلاق، تمدن، غرض نظام عالم کے کل اجزاء جب زنگ آلود ہو جاتے ہیں تو نظام الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مصلح، ایک رفارمر اور ایک مجدد کو پیدا کرتا ہے جو ان تمام چیزوں کو جلا دے کر آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

خلافت راشدہ کے بعد سے لے کر سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ تک خلیفہ صرف حاکم و بادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کرنے کی نہ فرصت تھی، نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا

جا تا تھا، کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق ورجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ ونصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علماء ومحدثین کا سمجھا جا تا تھا، عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دوئی کو مٹایا، اوراپنے آپ کو حقیقی معنی میں خلیفہ ثابت کیا۔ چنانچہ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس سلسلہ میں خوبصورت تحریر اور جاذب انداز بیان میں اپنے ہیرو کی اصلاحی وتجدیدی فکر وتدبر کو پیش کرتے وقت ایک تمہید قائم کیا ہے اور لکھا ہے:

''سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ خلافت تک تاریخ اسلام پر پوری ایک صدی گزر چکی تھی، اور اس طویل زمانہ میں اسلام کا نظام مذہب، نظام سیا ست، نظامِ اخلاق اور نظام تمدن بالکل زنگ آلود ہو گیا تھا، اس لئے ان تمام چیزوں کی تجدید واصلاح کے لئے ایک مجدد کی ضرورت تھی، اور حافظ جلال الدین سیوطیؒ کو فخر ہے کہ مصر کی خاک نے سب سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ذریعہ سے اس ضرورت کو پورا کیا، اور متصل کئی صدیوں تک پوری کرتی رہی، چنانچہ لکھتے ہیں:۔''مــــــــن الــلـطـائف......فی الثامنۃ'' ترجمہ: یہ ایک لطیفہ ہے کہ ہر صدی کی ابتدا میں جو مصلح پیدا ہوئے وہ سب کے سب مصری تھے یعنی پہلی صدی میں عمر بن عبدالعزیزؒ، دوسری میں شافعیؒ، اور ساتویں میں ابن دقیق العید، اور آٹھویں میں بلقینی۔'' ۵۱ؔ

انہوں نے زِمام خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمال حکومت اور امراء وفوجی افسران کو طویل خطوط اور فرامین روانہ کیے، جو انتظامی سے زیادہ دینی واخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ کی روح ہے، اور اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی ہے، ان خطوط میں وہ امراء اور افسران کو وقت پر نمازیں پڑھنے، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر واشاعت کی تاکید کرتے ہیں، چنانچہ مولانا نے ایک اقتباس نقل کیا ہے جو حضرت عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارطاۃ کے نام ایک فرمان لکھا، جس میں خاص طور پر اس طرف توجہ دلائی:

''فلا تسنن بسنتہ فانہ کان یصلی الصلوٰۃ لغیر وقتھا''

ترجمہ: حجاج کی تقلید نہ کرو، کیونکہ وہ نماز بے وقت پڑھتا تھا۔'' ۵۲؎

حضرت عمر بن عبدالعزیز جہاں اپنے عمال کو تقویٰ و اتباع شریعت کی وصیت فرماتے وہیں سیاسی حیثیت سے انھوں نے جن صیغوں میں اصلاحات کیں ان میں سب سے مقدم چیز بیت المال ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: بیت المال مختلف قسم کی آمدنیوں کے مجموعہ کا نام ہے، جن میں ہر ایک کے مصارف و مداخل جدا جدا ہیں، غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے سے پہلے یہ تمام آمدنیاں ایک ہی جگہ جمع ہوتی تھیں، لیکن انہوں نے خمس، صدقہ اور فئے کے متعلق الگ الگ بیت المال قائم کئے اور ہر ایک قسم کی آمدنی کو الگ الگ جمع کیا۔

بیت المال درحقیقت مسلمانوں کا مشترکہ خزانہ ہے، جس سے ہر مسلمان مساوی طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے تمام خاندان شاہی کو عام مسلمانوں سے الگ الگ مخصوص وظیفہ ملتا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کو کلیتہً بند کر دیا۔ مداحانہ قصائد کے صلے میں شعراء کو بیت المال سے جو انعامات ملتے تھے ان کو بالکل موقوف کر دیا، عمال عشاء اور فجر کے لئے بیت المال کے چراغ سے جاتے تھے اس پر پابندی عائد کر دی، بیت المال کی آمدنیوں میں خمس کے پانچ مصرف متعین ہیں ان کے علاوہ خمس کے مصارف کو روک دیا، ان اصلاحات کے ساتھ بیت المال کی حفاظت اور نگرانی کا ٹھوس اور مضبوط انتظام کیا۔

مولانا لکھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے دینی علوم اور سنتوں کی احیاء کی طرف بھی توجہ کی، ابوبکر بن حزم جو ایک بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ علماء رخصت ہو جائیں گے، اور علم مٹ جائے گا''۔ انھوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابوبکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرو''۔ اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کئے کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔ وہ خود بڑے عالم تھے، انھوں نے بنفس نفیس فرائض وسنن کی تشریح کی طرف توجہ کی۔

مولانا لکھتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت

کے نفاذ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے غیر مسلم کی اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ کی اور اس میں ان کو اپنے صدق و اخلاص کی برکت اور اپنی زندگی کی برکت اور اپنی زندگی و عمل سے اسلام کی صحیح اور مؤثر نمائندگی کی وجہ سے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ عمر بن عبدالعزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظام حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کی مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہوگئی اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوت محرکہ ان کا قوی ایمان، آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انہوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع ولطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے، جس کا ترجمہ یہ ہے ''اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے''۔ ان کی رقت وخشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی، وہ بجھ گئی۔

مولانا لکھتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیز کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے اس خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی، اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمر کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیہ خداوندی سے محروم کر دیا۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے ۱۰۱ ہجری میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔

مصنف کتاب ''مولانا عبدالسلام ندوی'' نے اپنے کتاب کے خاتمہ میں 'سلطنت بنوامیہ کا زوال' کے

عنوان سے تین صفحوں پر مشتمل قدرے تفصیل سے بحث کی ہے، جس میں سلطنت بنو امیہ کے زوال کے اسباب و وجوہات بیان کئے ہیں، کیوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے کے تیس سال بعد اموی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اس لئے یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس مبارک عہد کے ۳۰ سال بعد ہی زمانہ نے کیوں کر خاندان بنوامیہ کا تختہ الٹ دیا، کیا اس کے اسباب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی کے زمانے میں پیدا ہوئے؟ کیا ان کا عادلانہ نظام سلطنت اس زمانہ کے لئے موزوں نہ تھا؟ کیا قدیم جبر و اقتدار کے استیصال نے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک شاندار کارنامہ ہے، نظام حکومت میں ایسا ضعف پیدا کر دیا جس سے حریفانہ طاقتوں نے فائدہ اٹھایا؟

مولانا نے قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے ان تمام سوالات کا جواب دیتے ہوئے اپنے ہیرو کے عہد خلافت کو اس سے مبرا قرار دیا ہے، چنانچہ پوری تفصیل کے بعد لکھتے ہیں اور اسی پر کتاب کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے کہ:

> ''اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور خلافت سے پہلے ہی بنوامیہ کے سلطنت کے زوال کے اسباب پیدا ہو گئے تھے اور وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ عرب کی خانہ جنگی نے ان کو کامل طور پر نشو نما دے دی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور خلافت کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔'' ۵۳؎

مولانا عبدالسلام ندوی کی اس بات کی تائید کہ ،سلطنت بنو امیہ کے زوال میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے، جسے انہوں نے اپنی کتاب ''تاریخ اسلام'' حصہ دوم کے صفحہ ۵۸۲ پر لکھا ہے کہ:

> ''اموی حکومت کا زوال اس کے قیام کے تقریباً ایک صدی بعد ہوا، لیکن اس کے عناصر اس کی تعمیر ہی کے وقت سے اس میں مضمر تھے، اور بعد کے خلفا کی سیاست اور ان کے عمال کی بے عنوانیوں نے اس میں اور اضافہ کیا۔'' ۵۴؎

اس سوانح عمری کے متعلق ممتاز فاخرہ اپنی کتاب اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء میں یوں رقم طراز ہیں:

''مصنف واقعات بیان کر کے فیصلہ کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔اسی لیے
سیرۃ عمر بن عبدالعزیز شخصیت کے بے لاگ تبصرے، تحقیق وتبصرے
اسلوب کی دلکشی وسادگی کی بنا پر اچھی سوانح عمریوں میں شمار کی جائے
گی۔''۵۵

## اقبال کامل:

یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آئی ہے۔اس کتاب کی تالیف کا اصل مقصد یہی تھا کہ اس وقت تک اقبال پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کو نقد وتبصرہ کے ساتھ مرتب طریقے سے ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔چنانچہ اس میں اقبال کے سوانح، ان کی مذہبیت، اخلاق وسیرت اور تصانیف پر تبصرہ ہے۔اوران تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف ان کے پیش نظر تھی مگران کے لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔اس کے بعدان کی شاعری کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا ہے۔اسی طرح فارسی شاعری پر تبصرہ ہے۔اس کے بعدان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے ہیں اور اس کی شہرت ومقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر ہے۔اس سلسلے میں ان کی ادبی لسانی فروگزاشتیں بھی دکھائی ہیں۔ان کے فلسفہ خودی پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے اجزاوعناصر پر روشنی ڈالی ہے۔پھر نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات پیش کئے ہیں اور نعتیہ کلام کے تبصرے پر کتاب ختم ہوتی ہیں۔اس کتاب کے دیباچے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے تحریر فرمایا ہے:

''تصنیف وتالیف کا میدان ایک ایسا میدان ہے جس کی تنگی اور وسعت
دونوں ایک مصنف کے لئے مشکلات کا سبب بن جاتی ہیں، اگر یہ میدان
تنگ اور محدود ہے تو اس کے لئے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ تھوڑی سی
معلومات سے کیونکر اس طرح کام لے کہ وہ پھیل کر ایک مستقل تصنیف کا
قالب اختیار کر لیں، اس لئے وہ اس مشکل کے حل کرنے کے لئے بعض
اوقات نہایت تصنع وتکلف سے کام لیتا ہے اور بہت سی غیر ضروری اور غیر
متعلق باتوں کو شامل کر کے کتاب کے حجم اور ضخامت کو بڑھانا چاہتا ہے،

اس طریقہ سے اگر چہ ایک کتاب تو تیار ہو جاتی ہے، لیکن اسکو اصلموضوع کتاب سے کوئی تعلق نہیں رہتا، لیکن اگر چہ میدان وسیع اور غیر محدود ہوتا ہے تو اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان غیر محدود اور وسیع معلومات کو سمیٹ کر کیونکر متوسط حجم اور ضخامت کی ایک خوبصورت کتاب مرتب کر سکتا ہے، معلومات کا ایک بے پایاں ذخیرہ اس کی نگاہ کے سامنے ہوتا ہے، اور اس میں اس کو اپنے ذوق سلیم کی مدد سے مفید اور ضروری معلومات کا انتخاب کر کے اپنی راہ سب سے الگ نکالنی پڑتی ہے۔'' ۵۶؎

مولانا نے نہایت ہی ایمان داری سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب کا سوانحی مواد معمولی تغیر وتبدل کے بعد انھوں نے بعض دوسرے حضرات کے مقالوں اور کتابوں سے اخذ کیا ہے، جن کا حوالہ دیدیا گیا ہے، اسی طرح سے بعض دوسرے عنوانات کے سلسلے میں بھی یہی روش اختیار کی گئی ہے، مگر علامہ کی شاعری اور فلسفہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ان کو بہت کچھ اضافہ کرنا پڑا ہے، اس سلسلے میں مولانا لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر مجھ کو بہت کچھ اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی اور اس کتاب میں میں نے جو کچھ دماغی کاوش کی ہے وہ صرف اس حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جس کے لئے صرف اخذ وانتخاب کافی نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے پورے کلام کے مطالعہ کی ضرورت تھی، ڈاکٹر صاحب کا کلام اگر چہ زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ، مذہبی، سیاسی اور قومی مسائل پر مشتمل ہے لیکن یہ مسائل شاعرانہ طرز واسلوب میں بیان کئے گئے ہیں، اس لئے ان کی تمام حیثیتوں پر شاعرانہ حیثیت کو تقدم حاصل ہے اور ہم کو اس موقع پر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھنا اور اس کو نمایاں کرنا چاہئے، لیکن ڈاکٹر صاحب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں ان کی اسی شاعرانہ حیثیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور انھوں نے جن حقائق ومسائل کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، ان کی توضیح کے لئے جو مثالیں ان کے کلام سے پیش کی گئی ہیں ان میں شاعری بہت کم پائی جاتی ہے خود ڈاکٹر صاحب شاعری سے برأت ظاہر

کرتے ہیں، اور غزل گوشاعر بننے سے تو ان کو شدت سے انکار ہے، اس لئے دوسرے لوگوں نے بھی ان کی مجددانہ، مصلحانہ اور فلسفیانہ حیثیت کو تو سامنے رکھا ہے اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو نمایاں نہیں کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کا کلام خشک فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ نہیں ہے یعنی وہ صرف ناظم نہیں ہیں بلکہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں، اس لئے میں نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور سیاسی مسائل سے پہلے ان کی ذات کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے پیش نظر رکھا ہے اور مختلف عنوانات میں ان کی شاعرانہ حیثیت کو زیادہ مکمل صورت میں نمایاں کیا ہے۔ فلسفیانہ اور صوفیانہ حقائق و مسائل پر بھی جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی حیثیت کو سامنے رکھا ہے، اور زیادہ تر ان کی غزلیات، قطعات اور نظموں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری اور فلسفہ دونوں کا خوشگوار امتزاج موجود ہے۔'' ۵۷

مولانا نے اقبال کے سوانح حیات والا حصہ اس طرح ترتیب دیا کہ ولادت سے لے کر انتقال سے قبل تک کے حالات و واقعات مکمل صورت میں آ گئے۔ ڈاکٹر اقبال کی ولادت کے ضمن میں مولانا ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں:

''ان کی ولادت سے چند روز پہلے ان کے والد نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ''ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اڑ رہا ہے ، اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے، اس ہجوم میں میں بھی ہوں، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا، لیکن خود بخود میرے دامن میں آ کر گرا، اور میں نے پکڑ لیا''، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب پیدا ہوئے تو انھوں نے اس خواب کی یہ تاویل کی کہ وہ پرندہ ہی بچہ ہے، اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا۔'' ۵۸

''سوانح حیات'' کے پینتالیس صفحات مکمل کرنے کے بعد دوسرے موضوع کا تعین کرتے ہیں ''علالت اور وفات'' اس موضوع کی تکمیل سات صفحات میں ہوتی ہے۔ بعد ازاں ''آل و اولاد'' کے عنوان سے چھ

صفحات تحریر کرتے ہیں ''ذاتی حالات'' کی ایک سرخی قائم کی ہے اس موضوع کے تحت پچیس صفحات رقم کئے ہیں۔ ان صفحوں میں علامہ اقبال کے مذہب وعقائد سے متعلق رجحانات اور اسباب وعلل پر روشنی ڈالی ہے اور کہیں کہیں مثالیں بھی دی ہیں۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب اگر چہ اخیر میں ٹھیٹ مذہبی آدمی ہو گئے تھے، لیکن اس منزل تک وہ بتدریج پہونچے تھے، اپنی ابتدائی زندگی میں وہ مشکک تھے۔'' ۵۹

اس دعوے کی دلیل میں ''مثنوی رموز بیخودی'' سے تین اشعار نقل کئے گئے ہیں کچھ دنوں تک جذبہ حب الوطنی کی سرشاری میں دین وملت سے بیزار رہے۔ مولانا رقم طراز ہیں:

''یہی وہ دور ہے جس میں خاکِ وطن کا ہر ذرہ ان کا خدا تھا، اور نوع انسان کی محبت انکا ایمان، اس لئے بصد حسرت خفتگانِ خاک سے پوچھتے ہیں۔ آہ وہ کشور بھی تاریکی سی کیا معمور ہے یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے۔'' ۶۰

اقبال کے جذبہ حب الوطنی اور اتحاد قومی کا سبب مولانا کے نزدیک وحدۃ الوجود کے صوفیانہ عقیدے تھے وہ لکھتے ہیں۔

''جب دنیا کی تمام چیزیں ایک ہی آفتاب کا پرتو ہیں، تو ان میں اختلاف کے کیا معنی؟ چنانچہ وہ اپنی نظم ''جگنو'' میں اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے ہیں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو — ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو۔'' ۶۱

غرض اس دور میں ایک ایسا مذہب چاہتے تھے جس کی بنیاد باہمی محبت پر ہو۔ چناچہ اپنی نظم ''نیا شوالہ''

میں اسی خیال کو اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے ــــ تیری صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے ــــ خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے۔'' ۶۲

لیکن وطنیت کے بعد اقبال کی ملی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو اقبال پختہ مسلمان اور اسلام کے داعی نظر آتے ہیں یہیں سے ان کی تبلیغی شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ بالخصوص قرآن کو شمع ہدایت سمجھتے ہیں اور اسی کی روشنی میں زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں ۔مولانا عبدالسلام ان کے اس رجحان کا محرک قیام یورپ کو بتاتے ہیں۔اس بابت میں وہ لکھتے ہیں:

''لیکن جب یورپ میں ان کی وطنیت کے خطرناک نتائج نظر آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ وطنیت بجائے خود ایک بہت بڑا بت ہے اور اس کو صرف روحانی طاقت سے توڑا جا سکتا ہے تو وہ مذہب کے پر جوش مبلغ ہو گئے،اور یورپ سے پلٹنے کے بعد وہ برابر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ '' ۶۳

اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مولانا نے عقائد پر طویل بحث کیا ہے۔قرآن،فقہ،حدیث اور تصوف پر اقبال کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال اسلامی عقائد پر سختی سے عمل پیرا تھے۔کہا جاتا ہے کہ اقبال منکر حدیث تھے،مخالف تصوف تھے،حالانکہ ایسی بات قطعاً نہیں ہے۔مولانا لکھتے ہیں۔

''وہ حدیثوں کے سرے سے منکر نہ تھے، بلکہ بہت سی حدیثوں پر شدت سے اعتقاد رکھتے تھے،ان کو جو کچھ شک وشبہ تھا، وہ احادیث کی شرعیت کے متعلق تھا۔'' ۶۴

علامہ اقبال پر یہ الزام ہے کہ وہ تصوف کے مخالف تھے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے اس الزام کی تردید کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''وہ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ،اور ان کے والد بزرگوار ایک صوفی منش آدمی تھے ،خود ڈاکٹر صاحب سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے''۔ ۶۵

مولانا نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں اقبال کے کئی خطوط پیش کئے ہیں۔طوالت سے بچتے ہوئے صرف ایک خط جو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام لکھا گیا ہے، حاضر ہے۔

''آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہوگی۔اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (یظہر فیھم السمن) کا ظہور ہوگا، میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار وکیل امرتسر میں شائع کئے تھے جس کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ ''سمن'' سے مراد رہبانیت ہے، جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی، میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وحدۃ الوجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں، میں خود بیعت رکھتا ہوں، حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔'' ۶۶

عبدالسلام صاحب نے حتی الوسیع یہ ثابت کر دیا کہ اقبال اسلامی تصوف کے مخالف نہ تھے بلکہ عجمی تصوف کے مخالف تھے اور عجمی تصوف کے ان مسائل پر اقبال نے نکتہ چینی کی تھی جن سے اسلام کی عملی اور مجاہدانہ قوت کو صدمہ پہنچا تھا۔مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب نے تصوف کی جو مخالفت کی اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کو تاویلات فاسدہ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ بال جبریل میں فرماتے ہیں:

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پاژند ۶۷

گویا اقبال کے ''ذاتی حالات'' پر گفتگو کرنے کے لئے مولانا کو دماغی کاوش زیادہ نہیں کرنی پڑی البتہ مواد کے اخذ وانتخاب میں کسی قدر سعی وجہد سے کام لینا پڑا لہذا جا بجا مختلف اہل قلم کے اقوال نقل کئے ہیں جن سے اقبال کے دینی واسلامی فکر وعمل پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔مولانا مودودی کی تحریر نقل کرتے ہیں۔

''مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا،

اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا ،اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا، وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔'' ۶۸

''ذاتی حالات'' کے باب میں مذکورہ رجحانات وعقائد کے ساتھ دیگر عقائد مثلاً توحید، رسالت، معجزات، حیات بعدالممات، تقدیر وغیرہ پر بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے۔مختلف اقوال کے ساتھ متعدد اشعار بھی نقل کئے ہیں۔اس کے بعد اسلامی آداب وطہارت وغیرہ ذبیحہ جانور کے گوشت سے اجتناب نماز روزہ اور تہجد، حج اور تلاوت قرآن جیسے ضمنی موضوعات پر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ''ذاتی حالات'' کے عنوان کی تکمیل کرتے ہیں۔تلاوت قرآن کے ضمن میں مولانا عبدالسلام نے مولوی ابومحمد مصلح اور محمد اقبال سلمانی کی چند تحریریں نقل کی ہیں۔اس سلسلے میں ابومحمد مصلح رقم طراز ہیں۔

''شاعر اعظم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت وجد میں آجاتا تھا، اقبال اپنی نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے پھر یہ کیونکر ہوسکتا تھا، کہ خدا کے کلام کو سنوار کر نہ پڑھتے ،قرآن مجید کی تلاوت با آواز بلند کرتے تھے جس سے ان کے قلبی جوش کا اظہار ہوتا تھا، یہ وہ وقت تھا کہ اقبال حال بن جاتا تھا، اور شاعر پر ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا۔اقبال راتوں میں جاگتے تھے، اور سحر خیزی ان کی چہیتی چیز تھی، پھر قرآن کو تو ان اوقات کے ساتھ خاص لگاؤ ہے، لہذا شغف قرآن، قرآن کے نورانی صفحات ان کے سامنے کر دیتا تھا، اور یہ بلبل ہزار داستان بڑی خوش الحانی کے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مصروف نظر آتا تھا، کہا جاسکتا ہے، کہ اقبال لحیم شحیم تھے مگر رقیق القلب ایسے تھے کہ دورانِ تلاوت قرآن میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔'' ۶۹

صفحہ نمبر ۸۷ پر ''اخلاق وعادات'' کے موضوع سے ایک مضمون تحریر فرمایا ہے یہ مضمون سولہ صفحات پر

مشتمل ہے۔اس میں سات ذیلی عناوین ہیں۔طرزِ معاشرت،غذا،وضع ولباس،استغناء وخودداری،فیاضی، وطن کی محبت اور لطف صحبت،ہر عنوان کے تحت علامہ اقبال کی خوبیوں او خیالات کا اظہار ہے نیز مختلف اہل قلم کے اقوال مع حوالے درج کیے،کہیں کہیں علامہ اقبال کے اشعار بطور دلیل پیش کئے۔علامہ اقبال کے اخلاق کے بارے میں عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کے اخلاق وعادات بالکل حکیمانہ درویشانہاور قلندرانہ تھے،وہ اگر چہ انگریزی وضع میں رہتے تھے لیکن ان کی طرز معاشرت میں درویشانہ اور حکیمانہ سادگی نظر آتی تھی۔'' ۷۰؎

عبدالسلام صاحب نے اقبال کے''وطن کی محبت''پر صرف پانچ صفحات تحریر کیے ہیں لیکن نہایت ہی بلیغ انداز تحریر ہے۔۔عبدالسلام ندوی کا بیان ہے کہ:

''وطن کی محبت کا ایک تو سیاسی تخیل ہے جو دسرے ملکوں اور دوسری قوموں سے بغض ونفرت اور رشک ورقابت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اس قسم کی وطنیت کے سخت مخالف تھے،لیکن اس کے ساتھ ہر شخص کا ایک خاص مولد ومنشاء ہوتا ہے جو ایک محدود رقبہ زمین سے تعلق رکھتا ہے،اور اس سے اس کو فطری لگاؤ ہوتا ہے اور اسی فطری لگاؤ کا نام وطن کی محبت ہے۔'' ۷۱؎

فارسی اور اردو اشعار کے ساتھ عربی کے دو شعر نقل کیے ہیں جو اقبال کے آبائی وطن کشمیر سے تعلق و محبت کا مظہر ہیں۔اس سلسلے میں عبدالسلام صاحب یوں رقم طراز ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب کا آبائی وطن کشمیر تھا،اور وہ کشمیر کی محبت کا ہی پاک جذبہ اپنے دل میں رکھتے تھے،اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار کرتے تھے۔''۷۲؎

اسی بیان میں آگے لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی نظمیں زیادہ تر کشمیر ہی سے تعلق رکھتی ہیں،ان میں چند رباعیات جو انھوں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں لکھی تھیں،اور وہ مطبوعہ کلام میں

شامل نہیں ہیں۔منشی محمد الدین فوق نے نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۵۲ میں درج کی ہیں:

| | |
|---|---|
| کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے | اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے |
| واہ واہ کیا محفل احباب ہے | ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے |
| ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر | بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور |
| سامنے ایسے گلستان کے کبھی گھر نکلے | حبیب خجلت سے سر طور نہ باہر نکلے |
| ہے جو ہر لحظ تجلی گہ مولائے جلیل | عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے۔'' ۳ے |

صفحہ ۹۴ پر ''تصنیفات'' کے موضوع سے ایک مضمون ہے جو کم و بیش ساڑھے سولہ صفحات پر مبنی ہے۔ ان اوراق میں اقبال کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تالیفات کا ذکر ہے خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں سب پر مختصر تبصرہ ہے بسا اوقات ان کے محرکات کا بھی اجمالاً ذکر ہے، اولاً اقبال کی نثری تالیف ''علم الاقتصاد'' پر گفتگو کی گئی ہے دوسرے نمبر پر وہ کتاب ہے جو فلسفہ ایران پر لکھی گئی ہے اور اس پر پی ایچ ڈی، کی ڈگری ملی تھی۔اس کے بعد اقبال کی شاعری کے احوال و کوائف نیز اسباب و علل چند سطور میں بیان کئے گئے۔بعد ازاں پہلی منظوم فارسی تصنیف ''اسرار خودی'' مطبوعہ ۱۹۱۵ء اور رموز بیخودی مطبوعہ ۱۹۱۸ء پر نقد و تبصرہ کے ساتھ کچھ اقوال بھی نقل کئے ہیں جن کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

مذکورہ دونوں کتابوں کے بعد ''پیام مشرق'' کا ذکر ہے نیز دونوں کتابوں سے اس کا تقابلی مطالعہ کر کے قدر و اہمیت کی تعیین کی گئی ہے اور ''پیام مشرق'' کے چاروں اجزاء پر مختصر ترین گفتگو کی گئی ہے۔''پیام مشرق'' کے بعد ''بانگ درا'' کی تاریخ اشاعت کے ساتھ ہی ''زبور عجم'' کا ذکر آ گیا ہے۔پھر مولانا عبدالسلام نے ''زبور عجم'' کے چاروں اجزاء پر تین تین چار چار سطور کے تبصرے کئے ہیں جو ناکافی و تشنہ ہیں۔بقول عبدالسلام ندوی:

> ''تاہم ڈاکٹر صاحب نے اپنی زیادہ توجہ فارسی کی طرف مبذول کر دی اور اس سلسلے میں جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کا جواب لکھنا شروع کیا جس کا نام ''پیام مشرق'' ہے۔'' ۴ے

''زبور عجم'' کے تیسرے حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام نے واضح کیا ہے کہ یہ حصہ محمود

شبستری کی مثنوی ''گلشن راز'' کا جواب ہے ثبوت میں اقبال کا شعر بھی نقل کرتے ہیں۔مولانا لکھتے ہیں:

> ''تیسرے حصے کا عنوان ''گلشن زار جدید'' ہے جو شیخ سعدالدین محمود شبستری کی گلشن راز کا جدید طرز میں جواب ہے۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس کی تمہید میں خود فرماتے ہیں:
>
> بطرز دیگراز مقصود وگفتم جواب نامہ محمود گفتم۔''۵ے

اس کے بعد''جاوید نامہ'' کی تالیف اوراس کے محرکات پر کسی قدر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''جاوید نامہ'' دراصل گوئٹے کی تصنیف''ڈیوائن کامیڈی''شیخ محی الدین ابن عربی کی تصنیف ''فتوحات مکیہ'' اورابوالعلاءمعری کے''رسالتہ الغفران'' کا جواب ہے۔

ابوالعلاءمعری کے ایک شاعروادیب دوست نے زمانہ جاہلیت کے شعراءوادباء پر طنزآمیز تحریریں رقم کی تھیں،ان تحریروں میں انہیں عتاب الٰہی کا حقدار ٹھہرایا تھالہذا اس کے جواب میں ابوالعلامعری نے رسالتہ الغفران لکھا۔بقول مولانا عبدالسلام:

> ''لیکن ابوالعلاء نے رسالہ الغفران میں ادبی رنگ میں اپنی بہشت و دوزخ کی سیر دکھائی،اور دوست رحمت الٰہی کے واضح کرنے کے لئے بدکاروں،گنہگاروں اور زمانہ جاہلیت کے شاعروں کو جنھوں نے بالآخر مرنے سے پہلے توبہ کر لی تھی،مغفرت ورحمت کا سزادار ہوتے اور جنت میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا۔'' ٦ے

ڈیوائن کامیڈی،فتوحات،اور جاوید نامہ کے تقابلی مطالعہ کے بعد مولانا عبدالسلام نے جاوید نامہ کو تفوق دیا ہے۔ڈیوائن کامیڈی اورفتوحات تمثیلات کی کثرت کے سبب پیچیدگی کا شکار ہوگئی ہے۔اس کے برعکس جاوید نامہ شاعرانہ پیرہن سے مزین ہے۔

ڈیوائن کامیڈی اورفتوحات میں زیادہ تر حیات بعدالممات کے حقائق وکوائف بیان ہوئے ہیں جبکہ جاوید نامہ میں موجودہ زندگی کے مسائل سے گفتگو کی گئی ہے۔جاوید نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام نے سنیما کے پردہ کا استعارہ کیا ہے کہ جس طرح پردے پر کبھی پہاڑ تو کبھی سمندر،کبھی نغمہ تو کبھی نوحہ،غرض مختلف مناظر پردے پر دکھائے جاتے ہیں اسی طرح جاوید نامہ کے مضامین ہیں۔تنوع پسند ذوق کے لئے

نہایت پر لطف ہیں۔مولانا لکھتے ہیں:

''انھوں نے دور قدیم اور دور جدید کی مختلف تاریخی شخصیتوں اور روحوں سے دور حاضر کے اہم مسائل پر گفتگو کی ہے اور اس طرح بتدریج پردے بدلتے گئے ہیں، ایک پردہ گر گیا ہے تو فوراً دوسرا پردہ اٹھ گیا ہے، ایک تصویر غائب ہوگئی ہے تو اس کی جگہ دوسری تصویر نمایاں ہوگئی ہے، کہیں نغمہ ہے اور کہیں نوحہ، کہیں پہاڑ ہے کہیں دریا، غرض مختلف منظر سامنے آتے گئے ہیں، اور یہ تبدیلیاں تنوع پسند ذوق کے لئے ڈرامہ، تھیٹر اور سنیما کی طرح نہایت پر لطف ولذیذ معلوم ہوتی ہیں۔'' ۷۷

''جاوید نامہ'' نہایت اہمیت کی حامل کتاب ہے لیکن مولانا عبدالسلام کے نزدیک شاعرانہ خوبیوں کے نقطہ نظر سے ''پیام مشرق'' اور ''زبور عجم'' اس پر فوقیت رکھتی ہیں۔مولانا نے اقبال کی شاعری میں شاعرانہ عناصر اور شاعرانہ خوبیوں کو مقدم رکھا ہے یہی سبب ہے کہ ''پیام مشرق'' اور ''زبور عجم'' کو جاوید نامہ پر تفوق دیتے ہیں۔بال جبریل پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو کا پہلا مجموعہ بال جبریل کے نام سے جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا، جس کے پہلے حصہ میں زبور عجم کے طرز کی کچھ غزلیں اور پیام مشرق کے طرز کی کچھ رباعیاں یا قطعے ہیں، اور یہ حصہ گویا زبور عجم کا چربہ ہے جس میں وہی باتیں الفاظ کا قالب بدل کر دہرائی گئی ہیں، اس لئے اس میں زبور عجم کی تمام خصوصیات یعنی جوش، بلندی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے۔'' ۷۸

دوسرے حصہ کی نظموں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کچھ نظمیں اندلس کی مشہور عمارات ومقامات پر ہیں، اگرچہ ان میں وہ جوش وخروش نہیں ہے جو شکوہ جواب شکوہ وغیرہ میں ہے، تاہم تسلسل وروانی اور عقیدت ومحبت کے جذبات سے یہ نظمیں خالی نہیں ہیں۔'' ۷۹

ذوق وشوق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''جس کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے ہیں، لیکن اس میں بھی ڈاکٹر

صاحب کا شاعرانہ زور بیان کم ہے۔'' ۸۰؎

ضرب کلیم کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

''پہلے اس کا نام صور اسرافیل رکھنا چاہتے تھے، لیکن بعد کو ضرب کلیم کے نام سے شائع کیا۔ غالباً اس نام کی بنیاد بال جبریل کا یہ شعر ہوگا۔ رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد''۔ ۸۱؎

''ضرب کلیم'' پر چند سطور میں تبصرہ کرنے کے بعد اس کی شاعرانہ خوبیوں کی کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن اس کتاب میں شاعرانہ رنگینی اور دلآویزی کم ہے۔'' ۸۲؎

ضرب کلیم کے بعد ان کی فارسی کتابوں کا ذکر آتا ہے۔ جس میں اولاً مثنوی کا تذکرہ ہے۔ اقبال کامل میں مذکورہ مثنویوں کے شان نزول اور محرکات ورود اور تالیف کے ذکر کے علاوہ کوئی نقد تبصرہ نہیں ہے نیز اس کے فوراً بعد ہی اقبال کی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' کی تاریخ اشاعت کے ساتھ اس کی تصنیف کے اسباب وعلل اور نوعیت کو بیان کیا ہے۔ مزید یہ بھی واضح کیا ہے کہ چند اردو نظمیں بھی ہیں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' اسی تصنیف میں ہے۔

ارمغان حجاز کے بعد اقبال کی چند اور تصنیفات ہیں، کچھ نظم میں ہیں کچھ نثر میں۔ ان تصنیفات میں بعض مکمل ہوئیں لیکن زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکیں بعض نامکمل رہیں۔ بعض مقدمات اور مباحث کی تقسیم وترتیب تک ہی رہیں اور کچھ کے خاکے اقبال کے ذہن ودماغ میں ہی رہ گئے۔ ان تمام تصنیفات کے محرکات وضروریات پر عبدالسلام صاحب نے روشنی ڈالی ہے اور مصادر ومخارج کی وضاحت کی ہے جن سے کتابوں کی تکمیل عمل میں آئی نیز ان وجوہات کی نشاندہی کی جو لباس لفظ وحرف زیب تن کرنے میں درانداز ہوئے جس کے باعث کتاب کا خاکہ صفحہ قرطاس سے محروم رہ گیا۔ ان کتابوں کے اسماء یہ ہیں:

''منطق الطیر، اردو رامائن، فراموش شدہ پیغمبر کی کتاب، قرآن پاک پر ایک کتاب، اسلامی اصول فقہ پر تجدید، تاریخ تصوف، اسلام میرے نظر سے۔'' ۸۳؎

مولانا نے اقبال کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی اردو اور فارسی شاعری کا الگ الگ

مطالعہ کیا ہے جس سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ان کے پیش کردہ مباحث ایک دوسرے سے گڈ مڈ نہیں ہونے پائے ہیں۔ مولانا نے اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ چونکہ تقسیم ادوار کے سلسلے میں مولانا کے یہاں کوئی ندرت یا جدت نہیں ہے مولانا نے اقبال کی تحریر کردہ مختلف اصناف سخن کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک ''اقبال کی غزلوں کے رنگ میں ہمواری نہیں پائی جاتی۔'' ۸۴ے

اس کی وجہ انکے خیال میں یہ ہے کہ ان کے ہر دور کی غزل دوسرے دور کی غزل سے مختلف رنگ وآہنگ کی حامل ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں (۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک) جو غزلیں لکھی ہیں ان میں ان کے نزدیک غالب اور میر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے، دوسرے دور میں بھی ان کا یہی رنگ غزل برقرار رہتا ہے، ان کی غزل گوئی کا تیسرا دوران کے یورپ سے ہندوستان آنے کے بعد شروع ہوتا ہے اس دور میں اقبال نے جو غزلیں لکھی وہ مولانا کے نزدیک رعنائی، برجستگی اور شگفتگی کا شاہکار ہیں ان کی غزلوں کے یہ وہ عناصر ہیں جو ان کے گذشتہ دونوں ادوار شاعری میں نمایاں نہ ہو سکے۔ بال جبریل کے شروع میں علامہ اقبال کی جو چند غزلیں شریک اشاعت ہیں وہ مولانا کے نزدیک اقبال کی غزل گوئی کے چوتھے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان غزلوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ:

''زبان اور مضمون دونوں حیثیتوں سے ہم ان کو بمشکل غزل کہہ سکتے ہیں۔''

اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ:

'' غزل کی ایک خاص زبان ہے جو نرم، لطیف، شیرین، خوش گوار اور لوچدار ہوتی ہے'' ۸۵ے

اور علامہ اقبال نے بال جبریل کی مذکورہ ابتدائی غزلوں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ ان اوصاف سے خالی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے خیالات اور الفاظ کے تعلق پر جو گفتگو کی ہے وہ اس لحاظ سے ہمارے لئے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کی مدد سے مولانا کا تنقیدی رویہ سمجھا جاتا ہے۔ مولانا خیالات اور الفاظ کے تعلق پر نظر ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''الفاظ بالکل خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور غزل کی یہ زبان قدرتی

طور پر اس لئے پیدا ہوگئی ہے کہ غزل میں جو مضامین بیان کئے جاتے ہیں
وہ خود بھی نہایت لطیف و نازک ہوتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی یہ غزلیں
اس قسم کے لطیف مضامین سے خالی ہیں۔۔۔اس بنا پر ہم بال جبریل کی
غزلوں کو بمشکل غزل کہہ سکتے ہیں۔'' ۸۶؎

یہ تو ہوا اقبال کی غزل گوئی کے چوتھے دور کے کلام پر مولانا کا ایک عمومی اظہار خیال مگر اس کے ساتھ ساتھ مولانا ان غزلوں کی اہمیت کے قائل بھی معلوم ہوتے ہیں جس کی وجہ ان غزلوں کے الفاظ یا زبان نہیں بلکہ ان کا ایک دل چسپ موضوع ہے جو اس دور کی غزلوں میں نئے نئے رنگ و آہنگ میں پیش کیا گیا ہے یہ موضوع کیا ہے اور مولانا کے نزدیک اس کی اہمیت کیا اور کیوں ہے؟ انہی کے الفاظ میں ذیل کی سطروں میں کیا جاتا ہے:

''غزل کا ایک دلچسپ مضمون عقل و عشق کی آویزش ہے اور اس کو صوفیانہ
اور رندانہ دونوں قسم کی شاعری سے تعلق ہے اور شعرا نے ان دونوں
حیثیتوں سے عقل کے مقابلے میں عشق کی حمایت کی ہے، ڈاکٹر صاحب
کی شاعری اگر چہ رندانہ نہیں ہے، تاہم اس کا ایک ماخذ تصوف بھی ہے،
اس کے ساتھ عشق و محبت کو جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے فلسفہ
خودی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لئے عقل و عشق کی معرکہ آرائی ان کی
شاعری کا ایک اہم جز ہے، اور انھوں نے غزل میں اس مضمون کی
آمیزش اپنی غزل گوئی کے تیسرے دور میں کی ہے اور چوتھے دور میں جو
اسی تیسرے دور کا تتمہ اور تکملہ ہے یہ شراب تند سے تند تر ہوگئی
ہے۔'' ۸۷؎

مولانا نے اس طرح اقبال کی مرثیہ نگاری، مثنوی نگاری، قطعات و رباعیات نویسی، قومی وطنی اور ظریفانہ شاعری پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے۔ اقبال کی اردو شاعری پر اپنے نقطہ نظر سے تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد مولانا نے اقبال کی فارسی شاعری کو اپنے مطالعہ کا ہدف بنایا ہے اور سب سے پہلے انھوں نے اس سوال کا

جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا موضوع کیوں بنایا۔مولانا کے نزدیک صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات جس قدر برجستگی اور موزونیت کے ساتھ فارسی زبان میں ادا ہو سکتے ہیں اس قدر دنیا کی کسی دوسری زبان حتیٰ کہ عربی زبان میں بھی بیان نہیں ہو سکتے۔

چونکہ اقبال نے اپنی فارسی شاعری میں جن افکار وخیالات کا اظہار کیا ہے وہ زیادہ تر فلسفیانہ ہیں اس لئے ان کو نظم کے قالب میں ڈالنے کے لئے انھوں نے فارسی زبان کا انتخاب کیا ہے مولانا کے اصل الفاظ یہ ہیں

> ''واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے لئے دنیا کی زبانوں میں فارسی زبان سے زیادہ بہتر کوئی زبان نہیں،عربی زبان نہایت وسیع ہے اور عربی شعرا کی کثرت کا شمار نہیں،بایںہمہ عربی شاعری فلسفہ وتصوف سے بالکل تہی دامن ہے،اس لئے یورپ سے پلٹنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فلسفیانہ خیالات ادا کرنے چاہے تو انھوں نے اردو کو چھوڑ کر اس قسم کی شاعری کے لئے فارسی زبان اختیار کی۔'' ۸۸؎

اسی سلسلۂ سخن میں مولانا نے اس بات سے بھی بحث کی ہے کہ اقبال اپنی فارسی شاعری میں کس فارسی شاعر سے سب سے زیادہ متاثر ہیں،یوں تو خود علامہ اقبال نے جگہ جگہ اپنے اشعار میں اپنے آپ کو مولانا روم کی شاعری سے متاثر قرار دیا ہے۔لیکن مولانا کے نزدیک ''جہاں زبان وبیان کا تعلق ہے ان پر خواجہ حافظ کی رنگین بیانی کا بڑا اثر پڑا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک الفاظ وطرز بیان کا تعلق ہے،ڈاکٹر صاحب نے متاخرین شعرائے ایران کی شت زبان اور خواجہ حافظ کا پرجوش انداز بیان اختیار کیا ہے،اور اس نے ان کے لہجے میں مولانا روم سے زیادہ مستی اور رنگینی پیدا کردی ہے۔'' ۸۹؎

اقبال کی اردو شاعری ہی کی طرح ان کی فارسی شاعری کا بھی مولانا نے اقبال کامل میں اصناف وار مطالعہ کیا ہے،ان کی شاعری کے بارے میں انہوں نے یہ انوکھا خیال پیش کیا ہے کہ اقبال کی شاعری جس قدر مختصر ہوتی ہے اسی قدر پراثر ہوجاتی ہے اور طویل شعر پاروں میں یہ تاثر کم ہوجاتا ہے۔مولانا نے اقبال کی

فارسی شاعری پر محاکمہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ ان کی غزلوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے۔

مولانا کے نزدیک اقبال کی فارسی غزلیں ''تغزل کا بے مثل نمونہ ہیں۔ان کا خیال ہے کہ:

''الفاظ کی شیرینی اور نرمی کے ساتھ مضامین میں نہایت سوز و گداز پایا جاتا ہے ،اور ان غزلوں میں انھوں نے خار اشگافی کے بجائے شیشہ سازی کی ہے'' ۹۰

اقبال کی فارسی غزلوں کی دوسری خاص خصوصیت مولانا کے نزدیک یہ ہے۔

''عاشقانہ اور رندانہ مضامین کے علاوہ ان کا پورا فلسفہ خودی اپنے تمام اجزاء ولوازم کے ساتھ ان کی فارسی غزلوں میں موجود ہے۔'' ۹۱

اقبال کی فارسی نظم نگاری پر نظر ڈالتے ہوئے مولانا نے ان کی ان نظموں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جن کا تعلق صرف شاعری سے ہے۔انہوں نے ان کی چند نظموں کے اشعار نموتاً درج کئے۔مولانا لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے فارسی زبان میں کوئی قومی و وطنی نظم نہیں لکھی ،ان کی نظمیں فلسفہ،شعر اور سیاست پر مبنی ہیں۔ انھوں نے چند بہاریہ نظمیں کہی ہیں ،بالخصوص کشمیر کے دل فریب مناظر اور خوش گوار آب و ہوا نے ان کی شاعرانہ قوت کو اور بھی ابھارا ہے۔چند ایرانی طرز کی نظمیں بھی لکھیں ہیں جن میں فلسفہ خودی اور پیام زندگی کو نہایت دل آویز موثر شاعرانہ انداز پیش کیا ہے۔ان نظموں کے ذریعے اقبال نے شاعری کے قالب میں جو انقلاب برپا کیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:

''اردو شاعری میں ہزاروں تغیرات وانقلابات ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں،لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے،دور جدید کے اردو شعراً میں کسی نے اس جدید ایرانی طرز کا تتبع نہیں کیا،صرف ڈاکٹر صاحب ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نیفارسی کے ساتھ اس طرز میں بعض نظمیں اردو میں بھی لکھیں۔'' ۹۲

اقبال کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا نے ان کی مثنوی نگاری پر خاص طور سے نظر ڈالی ہے۔ان کی مثنویوں کے بارے میں مولانا کی عمومی رائے یہ ہے کی:

''ان مثنویوں میں وہ شاعرانہ زور ،وہ شاعرانہ جوش اور وہ شاعرانہ لطافت موجود نہیں ہے جو پیام مشرق اور زبور عجم کی نظموں اور غزلوں میں قدم قدم پر ملتی ہے۔'' ۹۳

لیکن اس کے باوجود وہ اقبال کی مثنویوں کو دو وجوہ سے اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اسرار خودی اور رموز بے خودی کے ذریعے ہم ان کے فلسفیانہ افکار و عقائد سے آگاہی حاصل کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان مثنویوں سے ان کی مجددانہ اور مصلحانہ شخصیت ہمارے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اقبال کی مثنویوں میں مولانا کو اپنے مخصوص ذوق نظر کی وجہ سے وہ جوش و لطافت کم محسوس ہوتی ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے کلام اقبال کی ادبی خوبیاں کے عنوان سے اقبال کی شاعری کے محاسن پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔

مولانا کے نزدیک اقبال کی اصلی حیثیت شاعر کی ہے فلسفی کی نہیں اور ان کو اس بات پر افسوس ہی نہیں تعجب بھی ہے کہ ناقدین نے ان کی اس اصل حیثیت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ مولانا نے اپنے اس باب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر سے کلام اقبال کے ادبی محاسن کو اجاگر کریں، ان کے نزدیک کلام اقبال پر تنقید کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک قدیم طریقہ اور دوسرا جدید۔ مولانا کا بیان ہیں کہ:

''اس بنا پر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تنقید میں قدیم ادبی طریقہ تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اس حیثیت سے ان کے کلام کی تنقید بہت کم کی گئی ہے اور دو ایک مضمون جو لکھے گئے ہیں وہ نہایت مختصر اور غیر تشفی بخش ہیں، البتہ جدید طرز تنقید کے موافق ڈاکٹر یوسف حسین خان پروفیسر تاریخ وسیاسیات جامعہ عثمانیہ نے ایک نہایت مفصل و مدلل مضمون رسالہ اردو اقبال نمبر بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں لکھا ہے، اور بعد کو اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ اپنی مشہور و مقبول کتاب، روح اقبال میں شامل کر لیا گیا ہے، اگر چہ اس میں خلط مبحث ہو گیا ہے، اور بعض عنوانات قدیم ادبی طریقہ تنقید کے بھی شامل ہو گئے ہیں، تاہم اردو میں جدید طریقہ تنقید کے موافق اس سے بہتر کوئی تنقید موجود نہیں۔'' ۹۴

اس کے بعد انہوں نے یوسف حسین خان صاحب کے پیش کردہ نکات کی اتنی خوبی سے تلخیص کی ہے شاید اتنی جامع تلخیص خود مصنف کے قلم سے نہ نکلتی۔ اس سلسلے میں انہوں نے اقبال کے کلام کی رمزیت، رومانیت اور کلاسکیت کے اجزا سے یوسف حسین خان کے بیان کردہ نکات کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے اپنی بات ختم کردی ہے۔

اس کے بعد اقبال کامل کا وہ اہم ترین باب ہمارے سامنے آتا ہے جو مولانا نے اقبال کے فلسفہ خودی پر تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کے نزدیک خودی کا اصل مفہوم یہ ہے۔

''خودی سے فخر وغرور مراد نہیں، بلکہ اس سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے، جو ہر مخلوق کے علم وعمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے، اس کی ذات وصفات کی بود ونمود کے مظاہر متعین کرتا ہے، اور اس کی نشونما اور بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے، اس لئے وہ جو ہر ہے، عرض نہیں، آفتاب ہے آفتاب کا سایہ نہیں، متحرک ہے، ساکن نہیں، غرض وہ حقیقی زندگی ہے، اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے استحکام، اسکی توسیع اور اس کے اثبات سے وابستہ ہیں۔'' ۹۵

مولانا نے خودی کی یہ تعریف کرنے کے بعد اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ صوفیوں کے ہاتھوں یہ خودی مختلف طریقوں سے مٹائی جاتی رہی ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو مسلمان جذبہ خودی سے محروم بلکہ تہی دامن ہوتا گیا دوسری طرف اسی نفی خودی کی وجہ سے جو اخلاق وضع کیا گیا وہ انسانی زندگی کی خودداری اور آزادی کو ملیامیٹ کر دینے والا تھا۔ ایسے نظام اخلاق کو اختیار کرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی حریت آزادی، فکر اور خودداری کا وہ درس بھلا دیا جو ان کے خمیر میں پڑا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ایک خانقاہانہ زندگی کے راستے پر چل نکلا، جو فطری، علمی اور اخلاقی حیثیت سے تمدنی پیش رفت کے منافی تھا، اس وجہ سے اقبال نے نفی خودی کا نہیں بلکہ اثبات خودی کا نغمہ سنایا اور اس

''دقیق فلسفہ کو فلسفیانہ دلائل کے پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔'' ۹۶

مولانا نے اثبات خودی کے جو مقدمات تحریر فرمائے ہیں وہ مختصر ترین الفاظ میں یوں تحریر کئے جا سکتے

ہیں۔خودی کیا ہے یعنی خودی بذات خود کوئی چیز ہے یا نہیں، اثبات خودی کا دوسرا مقدمہ ''شرف انسانی'' ہے، تسخیر فطرت، اثبات خودی کا تیسرا مقدمہ ہے جو پہلے دونوں مقدموں کا تتمہ ہے۔اثبات خودی کا چوتھا مقدمہ مسئلہ خیر وشر ہے۔اتحاد جسم وروح اثبات خودی کا پانچواں مقدمہ ہے۔اثبات خودی کا چھٹواں مقدمہ مسئلہ جبر و اختصار ہے۔تخلیق مقاصد، اثبات خودی کا ساتواں مقدمہ ہے۔اثبات خودی آٹھواں مقدمہ صحرا ہیت وبدویت ہے۔عقل وعشق اثبات خودی کا نواں مقدمہ ہے۔مسئلہ ارتقاء، اثبات خودی کا دسواں مقدمہ ہے۔ مولانا کے نزدیک اقبال کی فلسفہ خودی انھیں دس مقدمات پر مشتمل ہے۔

اقبال کامل کا ایک اور باب نظام اخلاق ہمارے خصوصی مطالعہ کا مستحق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس باب میں مولانا نے جو تحریر فرمایا ہے اس میں ان کی مجتہدانہ شان بدرجہ اتم نمایاں ہے اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی مجتہدانہ روش کی آب وتاب ماند نہیں پڑی ہے۔اس موضوع پر مولانا نے ساڑھے آٹھ صفحات تحریر کئے ہیں۔ابتدائی چند سطور میں اقبال کے نظام اخلاق کی تعلیم پر اجمالی تبصرہ کیا ہے۔

مولانا اس باب کی ابتداء میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کا نظام اخلاق کیا ہے؟ اور وہ کس فلسفہ اخلاق کے متبع ہیں۔ان کی شاعری کا یہ جس قدر اہم موضوع ہے، اسی قدر مبہم اور غیر نمایاں بھی ہے کیونکہ انھوں نے صرف جستہ جستہ اشعار میں ضمنی طور پر اس کی طرف اشارے کئے ہیں، اس لئے اس موضوع پر کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے، اور اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ نہایت سخت قسم کے وحشیانہ اخلاق اور جنگویانہ جبر واقتدار کی تعلیم دیتے ہیں۔'' ۹۷

اسی سلسلہ سخن میں مولانا نے اخلاقیات کے ایجابی، سلبی، انفرادی اور اجتماعی پہلو پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے نیز صوفیہ کے نظام اخلاق کے ساتھ مسیحی اخلاق اور نطشے کے اصول اخلاق سے بحث کی ہے۔اس کے بعد انہوں نے صحابہ کرامؓ کے زمانہ جہاد کے بہت سے واقعات نقل کر کے صحیح اسلامی نظام اخلاق کو واضح کیا ہے اور پھر اقبال کے اشعار کے ذریعے اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں اسلامی نظام اخلاق کی تعلیم دی ہے، کسی ایسے نظام اخلاق کی نہیں جو انسان کو بہائم کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے۔مولانا کے

اس مطالعے کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

> ''وہ اخلاقی حیثیت سے نہ نٹشے کے مقلد ہیں نہ صوفیوں کا اتباع کرتے ہیں، بلکہ وہ خالص اسلامی اور قرآنی اخلاق کی تعلیم اور دعوت دیتے ہیں جو صلح و جنگ، رزم و بزم سب پر حاوی ہے۔'' ۹۸

بقول مولانا ''اقبال کامل'' کو ''یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس کا خاتمہ حمد و نعت پر ہوتا ہے'' اس اجمال کی تفیل یوں ہے:

> ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری محبت وطن اور محبت قوم سے شروع ہوئی اور محبت الٰہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا خاتمہ ہوا۔ اس لئے ہم بھی اس کتاب کا خاتمہ ان ہی دونوں پر کرتے ہیں۔ عام رسم و رواج کے مطابق ہر کتاب کی ابتداء حمد و نعت سے کی جاتی ہے، لیکن ہماری اس کتاب کو مزید یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا خاتمہ بھی حمد و نعت پر ہوتا ہے۔'' ۹۹

اس کے بعد مولانا نے اقبال کی شاعری پر ایک اعتراض کا ذکر کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ اقبال نے اپنے اشعار میں انسان اور خدا کے جس تعلق کی عکاسی کی ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ انسان خدا کے مقابل ایک حریفانہ اور مساویانہ حیثیت کا حامل ہے، نہ تو اس کو خدا سے کوئی محبت و عقیدت ہے اور نہ ہی وہ خدا کو اپنا مالک اور معبود سمجھتا ہے۔ مولانا نے اس اعتراض کے سلسلے میں یہ تو تسلیم کیا ہے کہ اقبال نے فلسفہ خودی کے اثبات کے لئے جو پرزور انداز بیان اختیار کیا ہے وہ ''حسن ادب'' کے خلاف ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس بات کی بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ اس خیال میں اقبال منفرد نہیں ہیں بلکہ معتزلیون کا بھی یہی نظریہ ہے کہ انسان میں تخلیق، قدرت اور اختیار کا مادہ موجود ہے۔ مولانا کے نزدیک اقبال کا آخری عمر کا کلام اس سوادب کی تلافی کرتا ہے اور وہ اپنے ان اشعار میں خدا کے ایک عاجز و ناتواں بندے کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا نے ارمغان حجاز سے اقبال کے وہ اشعار پیش کئے ہیں جو انہوں نے حضور حق کے عنوان سے سپرد قلم کئے ہیں اس اعتراض کے باوجود کہ اقبال کے اس دور کلام میں محبت الٰہی کے جذبات امڈے پڑتے ہیں ان کا ارشاد یہ ہے کہ پھر بھی اقبال کے یہاں محبت الٰہی پر محبت رسول صلی اللہ علیہ

وسلم پر غالب ہے۔اور اقبال کے اس کلام میں جو جوش ، بے قراری ،تڑپ ، والہانہ پن سوز وگداز ملتا ہے اس کی نظیر فارسی اور اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔

اقبال کے نعتیہ کلام اور دوسرے نعت گوشعرا کے کلام میں مولانا کے نزدیک یہ فرق ہے کہ عام نعت گو شعرا اپنے آپ کو عاشق فرض کرتے ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب اور یہ شعرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی اوصاف نظم کرنے کے بجائے ''حسن و جمال اور خط وخال'' کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں۔ مولانا کو اس کا اعتراف ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جملہ مردانہ حسن و جمال کے حامل تھے،لیکن قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن جمال کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کا تذکرہ کیا ہے۔اس لئے صحیح اور درست نعت گوئی وہ ہے جس میں قرآن کا اتباع کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اس انداز میں کی جائے جو قرآن میں ملتی ہے۔اقبال نے اپنی نعت گوئی کا انداز وہی رکھا ہے جو قرآن کا انداز تھا،یہیں وہ فرق ہے جو اقبال کو دوسرے نعت گوشعراء سے ممتاز کرتا ہے اسی سلسلہ سخن میں مولانا نے یہ بھی تحریر کیا ہے۔

> ''لوگ کہتے ہیں کہ خودی کا فلسفہ ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے فلسفیوں سے سیکھا ہے،لیکن ڈاکٹر صاحب کے نعتیہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلسفہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے۔'' [۱۰۰]

مولانا کے نزدیک:

> ''اثبات خودی کا سب سے پر جوش مقدمہ عشق ہے لیکن اس عشق کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ہے۔'' [۱۰۱]

مولانا نے اقبال کی نعتیہ شاعری پر اقبال کامل میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ انتہائی مجمل ہے،مگر اس مجمل تحریر میں انہوں نے ایسے ایسے نکات تحریر فرمائے ہیں جو کسی اور ناقد کے یہاں نظر نہیں آتے۔

## مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح نگاری:

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنے وقت کے جید عالم تھے۔انہوں نے سوانحی نگارشات کے لئے موضوعات مذہبی اکابرین سے منتخب کئے ہیں۔ان کی مندرجہ ذیل سوانح عمریوں کے نشان ملتے ہیں۔

(۱) النبی الخاتم (۲) تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ (۳) حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی (۴) سوانح قاسمی (۵) سوانح ابوذر غفاریؓ (۶) سوانح حضرت اویس قرنیؓ

اب مذکورہ بالا کتابوں کا اجمالی جائزہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

زیر بحث کتاب النبی الخاتم مولانا مناظر احسن گیلانی کا شاہ کار ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا متاع عزیز ہے۔ النبی الخاتم کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے وہ عظیم بک ڈپو دیوبند سے شائع ہوا ہے۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے آخر میں کتاب کے ختم کرنے کی تاریخ مولانا محترم نے ۱۶ اپریل ۱۹۳۶ء رقم فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ سیرت کے موضوع پر مختلف زبانوں میں ابھی تک بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ضخیم بھی ہیں مختصر بھی۔ سیرت کی مختصر کتابوں النبی الخاتم بہت اہمیت رکھتی ہیں اس میں تین سو عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں مولانا محمد منظور احمد نعمانیؒ مدیر الفرقان لکھنو کا تحریر کردہ تعارف ہے۔ مولانا محترم نے اپنے چند سطور میں واقعی کتاب کی اصلیت وحقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''لیکن اس شیوع اور اس بے انتہا کثرت کے باوجود ایسی کتابیں اس بے پایاں ذخیرہ میں گنتی کی چند ہی نکلیں گی جن میں سیرت نبوی کو ایسی جامعیت اور اکملیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہو جو اس کا طغرائے امتیاز ہے۔ بالخصوص اس سلسلہ کی چھوٹی اور متوسط کتابیں تو اس چیز سے اکثر خالی ہیں۔'' ۱۰۲

مولانا موصوف کا مذکورہ بالا بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ چونکہ سیرت پر اردو میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں تقریباً ان میں یہ کتاب انداز بیان کے اعتبار سے جداگانہ ہے۔ چونکہ کتاب کے ابتدائی چند اوراق میں مصنف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خاتم النبین اور سرور دو عالم ہونے کا ثبوت قرآن وحدیث کے علاوہ دیگر مذاہب کی کتابوں سے ثابت کیا ہے۔ ویدک دھرم اور اس کی حیثیت بدھ دھرم اور مہاتما گوتم بدھ کی حقیقت، کپل وستو کا وجود قرآن کی روشنی میں، دین یہودی، نبی اسرائیل کی بردباری، تورات کا نسخہ، اس کی آسمانی حقیقت اور اس میں تحریف، مذہب مسیحی، حضرت موسی علیہ السلام کا مذہب پھر ان تمام انبیاء کرام اور

بزرگوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں بشارت دینا وغیرہ کا بیان ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا تمام ادیان کا منسوخ ہونا اور دین اسلام کا زندہ جاوید ہونا ان ہی لوگوں کے اقوال سے ثابت کیا ہے اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال نسب اور ابتدائی ایام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس پر بھی چند ایسے واضح دلائل پیش کیے گئے ہیں کہ دوسری جگہ نہیں ملتے۔

''النبی الخاتم'' کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ مکی زندگی، دوسرا حصہ مدنی زندگی۔مکی زندگی کو انھوں نے دل کی زندگی اور مدنی زندگی کو دماغ کی زندگی قرار دیا ہے۔یہ ایک دلچسپ نقطہ نظر ہے کہ مکی زندگی، دعوت وتبلیغ کی زندگی تھی جس کا تعلق وارداتِ قلبیہ سے تھا اور مدنی زندگی، سیاسی اور عمرانی زندگی تھی جس کی گتھیاں سلجھانے کے لیے دماغی صلاحیتوں اور گہرے سوچ بچار کی ضرورت تھی۔

اس کتاب کی ابتدا میں سید مناظر احسن گیلانی ''زندہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> '''یوں تو آنے کو سب ہی آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے لیکن کیا کیجئے کہ ان میں جو بھی آیا، جانے کے لیے ہی آیا۔پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لیے آیا۔وہی جو اُبھرنے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا۔چمکا اور پھر چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔'' ۱۰۳

اس مختصر سی کتاب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگی دونوں ہی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔البتہ اس کتاب میں تاریخی واقعات کو تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے بلکہ مصنف کا مطمحِ نظر دعوت وتبلیغ اسلام ہے۔جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حیات مبارکہ کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جس سے عام قارئین پر ان کی سیرت کا اثر اس طرح پڑے کہ وہ دین اسلام کو قبول کریں یا اگر پہلے سے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں تو اسلامی اصول وقوانین کی اتباع اپنا شعار زندگی بنالیں۔مکی زندگی کے تیرہ سالہ مدت میں کفار مکہ نے جو آلام ومصائب کے پہاڑ توڑے ان کا خاکہ بھی بڑے ہی مؤثر اور دردانگیز طور پر کھینچا ہے۔اس میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں بلکہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل کرلیا ہے۔پھر مدنی

زندگی میں اخوت ومساوات کا جو عملی نمونہ پیش کیا اور ساری دنیا کو اس راستہ پر چلنے کا جو درس دیا اس کو بھی ہو بہو پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی اصل خوبی ایجاز واختصار ہے۔ مولانا مناظر احسن نے ایسی طرز تحریر اختیار کی کہ سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی یا دیگر مصنفین کی سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے اختصار میں اکملیت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔ البتہ بعض اشارے ایسے ہیں جن کو سمجھنے کے لئے وسیع النظر اور وسیع المطالعہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ وہ اشارے اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا منظور احمد نعمانی رقم طراز ہیں:

''لیکن الحمد للہ پیش نظر کتاب اس حیثیت سے انہی چند مستثنیات میں سے ہے۔ وہ اختصار کے باوجود سیرت نبویہ کے تمام قابل غور پہلوؤں پر حاوی ہے بلکہ جن پہلوؤں کو سطح بین دنیا نے قابل غور نہیں سمجھا اور اس لئے ہمیشہ ان پر سرسری گزر گیا ان کو بھی اس کتاب میں قابل غور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔'' [۱۰۴]

پھر آگے چل کر مولانا مذکور جدید تحریک سیرت کے بانی جناب عبدالحمید قریشی ایڈیٹر اخبار ''ایمان'' (جنھوں نے مصر وشام وہند کے مشاہیر سے درجنوں مقالے اور مضامین اس موضوع پر لکھوائے ہیں) کا قول نقل فرماتے ہیں:

''سیرت کی لائبریری میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔'' [۱۰۵]

آخر میں اس کتاب کی وجہ تصنیف جو مولانا منظور احمد نعمانی نے اپنے تعارف میں پیش کیا ہے نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''یہاں تک پہنچ کر جی چاہتا ہے کہ اس کتاب اور اس کے صاحب نعمت مصنف کے متعلق ایک خاص بشارت جو اب تک میرے سینے میں سر مکنون کی طرح محفوظ رہی اس کو بھی ظاہر کر دوں۔ صاحب کتاب کو میری یہ جسارت اور یہ افشاء راز ناگوار ہو تو وہ مجھے معاف فرمادیں۔ مجھ سے ایک نہایت ثقہ بزرگ نے بیان کیا تھا کہ جن دنوں یہ کتاب النبی الخاتم

تصنیف ہورہی تھی ایک صاحب دل بزرگ نے ایک رات عالم واقعہ میں دیکھا کہ خاتم النبین رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جمال کی پوری تابشوں کے ساتھ رونق افروز ہیں اور، مولانا گیلانی قدموں میں تڑپ رہے ہیں اوران سے نظر بچاتی جارہی ہے۔ صاحب واقعہ بزرگ نے یہ دیکھ کے حضرت بلالؓ سے جو وہیں موجود تھے عرض کی کہ اس بے چارے کوایک نظر کیوں نہیں دیکھ لیا جاتا؟ حضرت بلالؓ نے فرمایا اس کو اگر دیکھ لیا گیا تو مرجائے گا۔ میرے نزدیک یہ مقدس صحبت اور یہ تڑپ اس مبارک تالیف کی صورت مثالیہ اور اس کے مصنف کے پر سوز جذبات کی تصویر تھی۔''[۱۰۶]

اس کتاب کی عبارت سادہ، متین اور رواں ہے۔ بعض مقامات پر صنعت تکرار کا استعمال کیا گیا ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی عام فہم اور روز مرہ کے استعمال کے الفاظ اس کتاب میں بکثرت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انداز بیان میں جدت وندرت پائی جاتی ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب بہت ہی قابل قدر ہے اور رہے گی۔ جہاں تک فن کے میزان پر پرکھنے کا سوال ہے تو اس باب میں خیال یہ ہے کہ سیرت کے باب میں یہ کتاب اپنے انداز بیان کی وجہ سے یقیناً منفرد اور ممتاز درجہ کہ حامل ہے۔

کتاب کے آخر میں یعنی صفحہ ۱۳۴ پر عرض احسن ، بہ آستانہ کبری علی صاحبھا الف سلام و تحیہ کے تحت فارسی اور عربی دونوں زبان میں ۹ بند پر مشتمل ایک نعت ہے۔ پھر صفحہ ۱۳۸ پر فارسی زبان میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک نعتیہ غزل ہے اس سے مولانا مناظر احسن گیلانی کی عربی اور فارسی دانی کا پتہ ملتا ہے۔ پھر صفحہ ۱۳۹ پر فکر اور پریشانی کے وقت کی دعاء درج ہے۔

## تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ:

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی دوسری سوانحی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۴۶ء میں رزاقی مشین پریس حیدرآباد سے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں کل ۳۲۰ صفحات ہیں اس کتاب کے شروع میں فہرست مضامین کے بعد ''کل یوم ھو فی شان'' کے عنوان کے

تحت صفحہ ۸ سے ۲۲ تک عیسائی مذہب کے ''عقیدۂ ولدیت'' انگریزوں کے افکار وخیالات ،عقائد، ان کا مذہبی جذبہ پھر مذہب عیسوی کی تبلیغ واشاعت سے اسلام پر اس کا اثر وغیرہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد رہنمایان اسلام نے اس کے سد باب کی غرض سے جو مستحسن کوشش کی ان کا بھی اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اصل کتاب کا آغاز صفحہ ۲۳ سے ہوتا ہے۔اس کتاب میں ضمنی عنوانات کی تعداد ۱۱۱ ہے۔کتاب کے چند ابتدائی اوراق میں اس زمانے کے ہندوستانی معاشرہ کی حالت بیان کی گئی ہے۔خاص طور سے مختلف مغل سلاطین کے طرز حکومت اور ان کی مذہبی رواداری اور مذہب سے تعلق ولاتعلقی دونوں ہی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارنامے، ابوالمظفر محی الدین حضرت اورنگ زیب عالم گیر کے کارنامے۔عالم گیر کے بعد فتنوں کا اٹھنا، سکھ تحریک مرہٹہ تحریک اور ہندوؤں کی سیاسی بیداری احمد شاہ ابدالی، نادر شاہی حملے وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔انگریزوں کے چند نامور حکمراں جنھوں نے انگریزی حکومت کی تاسیس ڈالنے اور اس کو استحکام بخشنے میں بہت ہی اہم کردار ادا کئے ہیں۔تذکرہ بھی اس کتاب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس طرح سے مختلف تحریکیں اور ارباب اقتدار کی ناپاک سازشیں باہم متحد ہوکر اسلام کے مقدس اصولوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔اس کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں پر عرصۂ حیات کو ہر جانب سے تنگ کیا جا رہا تھا لیکن اس کشمکش اور عبوری دور میں بھی جبکہ جان کے لالے پڑ رہے تھے۔حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی۔جس دلی میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔قتل وغارت گری کا بازار ہمہ دم گرم تھا۔اسی دلی میں آپ اسلام کے ٹمٹماتے چراغ میں تیل اور بتی کا کام کر رہے تھے۔اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسلام کی تبلیغ واحیا میں صرف کر دیا۔حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے علاوہ ان کے شاگردوں کا ایک حلقہ ہمیشہ اس امر مہتم بالشان کی انجام دہی کے لئے جوایثار اور بیش بہا قربانیاں پیش کی ہیں۔ان کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ان ہی کارنامے کو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی ترتیب دوسری سوانحی کتابوں کی مانند نہیں ہے بلکہ حضرت شاہ صاحب کی ولادت اور ابتدائی زندگی کا حال کتاب کے وسطی حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔حضرت شاہ صاحب کی زندگی کے تمام تر واقعات خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی علمی ہوں یا سماجی تمام کے تمام اس کتاب کے مندرجات ہیں۔اس کے

علاوہ خاندان ولی اللہی کی خدمات بھی ضمنی طور پر اس میں درج کئے گئے۔ اس طرح سے وہ تمام جزئیات جو حضرت شاہ صاحب کی زندگی میں رونما ہوئے، اس کتاب میں مجتمع ہیں۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا عام اور منفرد انداز ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ سادگی، سلاست و روانی اور عام فہم زبان اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ملاحظ فرمائیں:

> ''میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حضرت اورنگ زیب عالم گیرؒ کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں ہوش سنبھالا تو ان تک یورپ کے اس مخفی ذہنی تسلط اور آئندہ پیدا ہونے والے خطرات کا علم کس راہ سے پہنچا لیکن اپنی پوری زندگی جس جدوجہد میں حضرت شاہ صاحب نے صرف کی اس کے ایک بڑے حصے کا تعلق یہ عجیب بات ہے کہ ان ہی پیدا ہونے والے خطرات کے انسداد سے معلوم ہوتا ہے۔'' ۱۰۷

مذکورہ بالا اقتباس میں جو عبارت ہے وہی انداز پوری کتاب کا ہے۔ تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ فن سوانح کی کتابوں میں نمایاں مقام حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔

## حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی:

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے زمانے کی روش کو پہچان کر اسلاف کے کارناموں کو حیات جاوید عطا کرنے کی بڑی حسین اور سود مند کوشش کی۔ اسی کوشش کا ایک ثمرہ ''حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' کی صورت میں ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان سے یہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی اور قبولیت عوام و دوام کی دولت سے بہرہ ور ہوئی۔ اسی قبولیت کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک چار بار شائع ہو چکی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

طبع اول اپریل ۱۹۴۹ء طبع دوم جون ۱۹۵۷ء طبع سوم مئی ۱۹۶۰ء طبع چہارم جون ۱۹۶۶ء

کتاب کی ابتدا میں چودھری محمد اقبال سلیم گابندری کے تاثرات ''حرف آغاز'' کے عنوان سے ہے جو

صفحہ ا سے صفحہ ۱۱ تک ہے۔ اپنی اس مختصر تحریر میں اقبال صاحب نے ہندو پاک کی تقسیم، اس وقت کے ملکی و معاشرتی مسائل کے علاوہ طباعت و اشاعت سے متعلق اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس معرکۃ الارا تصنیف کو تمام قارئین کے لئے مفید قرار دیا ہے۔ اس کے بعد جناب محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی یہ تحریر بہ عنوان ''امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی'' کچھ اس تالیف اور اس کے مؤلف کے متعلق ہے جو صفحہ ۲۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مؤلف کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ حیدرآباد کی طویل زندگی میں ڈاکٹر صاحب مولانا کے بہت قریب رہے ہیں۔ اسی قربت کے پیش نظر اور حق شاگردی ادا کرنے کے لئے بھی مولانا کی مختصر سوانح عمری بھی تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے بڑی مفید کارآمد مشورے بھی تحریر کئے ہیں۔ آگے اقتباسات کے ذریعہ اس دعویٰ کی وضاحت ہوگی۔ اس کے بعد خود مولانا موصوف نے تمہید میں سبب تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

> ''جامعہ عثمانیہ کے سابق نائب امیر (پرو وائس چانسلر) محترمی قاضی محمد حسین صاحب مرحوم نے ایک علمی مجلس جامعہ عثمانیہ میں اساتذہ کی قائم کر رکھی تھی۔ جس میں اپنے اپنے تدریسی فن کے مختلف موضوع پر اساتذہ مقالے سنایا کرتے تھے خاکسار کی جب باری آئی تو اپنی کتاب تدوین فقہ کے ایک حصہ کا انتخاب کر کے مقالے کی شکل میں متعدد مجلسوں میں اس کو پڑھتا رہا۔ یہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کی روداد تھی۔ مضمون چونکہ کافی طویل تھا اس لئے چند قسطوں میں بھی مکمل نہ ہو سکا۔ ہر خطبہ جو اس مجلس میں پڑھا جاتا تھا۔ الفرقان بریلی میں اشاعت کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ الفرقان کے بعض دوسرے مجلّات میں یہ مضمون نقل ہوا۔ خصوصاً ہمارے فاضل دوست مولانا ابوالاعلی مودودی امیر جماعت اسلامی نے اپنے طویل پیش لفظ کے ساتھ رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۶ عدد ۳،۴ میں بھی اس کو شائع فرما دیا تھا لیکن مضمون بہرحال نامکمل تھا۔ بعض لوگوں کے اصرار سے پچھلے دنوں اس مضمون کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ کتاب کی موجودہ ضخامت کا اندازہ پہلے سے نہ تھا لیکن قلم اٹھا لیا گیا اس کا روکنا

میرے بس میں نہ تھا بس جہاں پر پہنچ کر وہ خود ہی رک گیا میں نے بھی

اپنے تالیفی سفر کو ختم کر دیا۔'' ۱۰۸

مندرجہ بالا اقتباس سے اس کتاب کے تالیف کی وجہ تو بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کس قدر مصروف تھی۔ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کے صرف ایک پہلو یعنی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی واضح ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ صرف ایک ہی رخ پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ امام اعظم کی سیاسی زندگی سے الگ ہٹ کر اس زمانے کی روش اور اس دور کے حالات وغیرہ وغیرہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ صرف اس کتاب کی فہرست مضامین کی کثرت سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں اصل مسئلہ واضح کرنے کے لئے کس قدر ضمنی مسائل کا سہارا لیا گیا ہے۔ خلافت بنی امیہ اور خلافت عباسی دونوں ہی زمانے میں اسلامی آئین میں ردو بدل کو دیکھ کر امام اعظم بہت ہی کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ ان بگڑے ہوئے حالات میں اصلاح کی غرض سے امام اعظمؒ نے ملکی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کیا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی اصلاح اور جدو جہد میں صرف کیا اپنے شاگردوں کو اس بگڑے ہوئے ماحول اور بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی اور عملی طور پر آمادہ کیا۔ اصلاحی کارنامے کے دوران شہنشاہ وقت کی طرف سے پیش کئے گئے جاہ و منصب کو ٹھکرا دیا۔ نتیجہ کے طور پر عدول حکمی کا الزام صادر کیا گیا اور سخت سے سخت سزائیں دی گئیں۔ اس کے باوجود بھی پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں ہوئی اور اپنے ارادے پر کاربند رہے آگے چل کر اس جرم کی سزا میں جان سے بھی ہاتھ دھونی پڑی۔

اسلام کے اس عظیم سانحہ اور نامور سپوت کے ان ہی کارناموں کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی اس معرکتہ الآرا کتاب میں بڑے ہی سلیقہ مندی اور حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اسلامی تاریخ کی عظیم المرتبت حلیم الطبع اور قناعت پسند و مذہب پسند شخصیتوں کی روداد محفوظ کر دی گئی ہے۔ اس کتاب کا انداز بیان بھی ان کی دوسری تصنیفات سے زیادہ جداگانہ نہیں چونکہ دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی ایک خاص مقصد اور عقیدت کے جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔ لیکن مقصد اور عقیدت کے باوجود بھی ایک سوانح نگار کے فرض کو مد نظر رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ پر چلتے رہے اور اس وقت کے تمام جزئیات پر بخوبی نگاہ

ڈالتے ہوئے اس تحقیقی فریضہ کو پایہ ٔ تکمیل تک پہنچایا۔ضمناً عنوان کی کثرت اور کتاب کی ضخامت کے پیش نظر ایسی بات ممکن تھی کہ قارئین پر اس کی خشکی اور بے کیفی گراں گذرے لیکن حکایات و واقعات کے ذریعہ اپنے انداز بیان کو مولانا موصوف نے اس قدر دلچسپ بنا دیا ہے کہ اس کتاب کا ورق مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ کتاب کے حرف اول سے حرف آخر تک عبارت کی رنگینی اور ربط وتسلسل ، جملے کی بندش اور اس کی معنویت واقعات کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔طریقۂ استدلال بھی نہایت مؤثر اور واضح ترین ہے۔بطور مثال ذیل میں ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ’’اگر اس روایت کو سامنے رکھ لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ پہلی روایت میں لوگوں نے بغداد کی جگہ غلطی سے کوفہ کا لفظ استعمال کیا ہو یعنی وہاں بھی یہی سمجھا جائے۔ کہ ابوجعفر منصور نے کوفہ سے بغداد کے زمانے میں امام کو بلایا ورنہ حجاز سے کوفہ امام عباسیوں کی حکومت کے قائم ہونے کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ کچھ بھی ہوا امام کی واپسی کوفہ کسی زمانہ میں ہوئی۔لیکن یہ واقعہ ہے کہ عباسی حکومت سے امام کے تعلقات کی ابتدا ابو جعفر منصور ہی کے زمانہ سے ہوئی ہے۔السفاک کی حکومت جس کی مدت کل چار سال نو مہینے اس میں بجز مکالمہ کے اس واقعہ کے جس کا ذکر ابھی گذرا مؤرخین نے امام کے متعلق اس سلسلہ میں اور کسی چیز کا ذکر نہیں کیا ہے۔‘‘ ۱۰۹

بعض مقامات پر مولانا نے بہت ہی اندوہ ناک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں بھی جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر بہت ہی سیدھے سادے انداز میں واقعہ کو پیش کیا ہے جس سے ان کی فنکارانہ عظمت واضح ہوتی ہے مثلاً حضرت امام یوسفؒ کا انتقال ملت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔مولانا بھی اس سانحہ سے دلی طور پر بہت متاثر ہوئے لیکن اس کا اثر تحریر میں نہیں ملتا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ’’قاضی ابو یوسف کا جب انتقال ہوگیا تو سوال پیدا ہوا کہ قاضی القضاۃ کا جو عہدہ حکومت میں قائم ہوگیا ہے۔اس پر کس طبقہ کے عالم کا تقرر کیا جائے قاضی ابو یوسف نے قدرتی طور پر سارے ممالک عباسیہ کی

عدالتوں کو اپنے ہم مشرب علماء یعنی حنفی فقہا کے قاضیوں سے بھر دیا۔ گوخود
ہارون فقہ حنفی اور حنفی فقہا سے متاثر ہو چکا تھا اور اس سے زیادہ اس کے
تاثر کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے شاہزادے مامون کی
معلومات پر برتری حاصل کئے ہوئے تھے لیکن پھر بھی بظاہر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ایک طبقہ اور جماعت کا حکومت میں اتنا غیر معمولی اقتدار
ہارون کو سیاسی مصالح کے خلاف معلوم ہوا۔ قاضی ابو یوسف کی زندگی
تک تو خاموش رہا۔ لیکن ان کی وفات کو ایک مغتنم موقع خیال کر کے ایک
ایسے عالم کا اس عہدے کے لئے اس نے انتخاب کیا جس کا نسلی طور سے
خاندان قریش سے تعلق تھا۔'' ۱۱۰

مذکورہ بالا سطور سے انداز تحریر، عبارت آرائی دونوں کا ہی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

''راقم اپنی نااہلی کی وجہ سے ان کی کسی کتاب پر علمی تبصرہ کرنے کی جرأت
نہیں کرسکتا۔ ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہی ارباب علم ونظر کر سکتے
ہیں جو خود بھی مولانا کی طرح علوم وفنون کے بحر بیکراں کے شناور ہوں
لیکن ان کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ
ان کے قلم سے علم کا دریا بہہ رہا ہے اور دریا کی موجوں کی طرح ان کی تحریر
میں اضطراب وتلاطم ہے۔ جن چیزوں کو وہ خرافات سمجھتے تھے وہ اب بیش
بہا معلومات کا خزانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین اور تصانیف میں
موضوع سے غیر متعلق باتیں بکثرت ہوتی ہیں جن سے ان کی تحریر میں
بڑی طوالت پیدا ہوجاتی ہے لیکن ان غیر متعلق باتوں میں بھی اتنے کار
آمد معلومات ہوتے ہیں جو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر
دیتے ہیں۔'' ۱۱۱

مذکورہ بالا اقتباسات سے مولانا کی علمی بصیرت اور انداز تحریر دونوں پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح سے کتاب کی اہمیت وافادیت بالکل مسلم ہے۔ جہاں تک سوانح نگاری کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اس باب

میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ کتاب امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کا پورے طور پر احاطہ کرتی ہے اور بعض مسائل ضمنی طور پر جا بجا پیش کر دئے گئے ہیں۔ مآخذ سے متعلق مولانا نے حسب روایت مستند کتابوں اور مستند راویوں کے اقوال پر اکتفا کیا ہے۔ جا بجا ان کے اقوال ہو بہو نقل بھی کئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب معلومات کا ایک بحر بیکراں ہے۔

## سوانح قاسمی:

سوانح قاسمی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی اہم سوانحی تصنیف ہے۔ یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم ۵۱۲ صفحات پر اور حصہ سوم ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب علی الترتیب ۱۳۷۳ھ ۱۳۷۵ھ ۱۳۷۶ھ میں شائع ہوئی۔ اس طرح اس کتاب میں کل ۱۳۱۶ صفحات ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں جن مآخذات سے کام لیا گیا ہے۔ اس کو حکیم الامت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکا مہتم نے مقدمہ میں تحریر فرما دیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

> ''مختصر سوانحی قاسمی ( مؤلفہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، یہ مولانا قاسم نانوتویؒ کے شریک درس اور بعض موقع سے شریک سفر بھی رہے ہیں ) مختصر حالات زندگی جمع کردہ منصور علی خاں صاحب مرادابادی ( تلمیذ رشید حضرت نانوتویؒ ) الکلم الطیب ( متفرق واقعات جو مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا )۔ امیر الروایات ( مختلف واقعات جمع کردہ ،مولانا حبیب احمد صاحب کیرانویؒ ) اشرف التنبیہ ( مختصر احوال از حکیم الامت حضرت تھانویؒ ) سوانح مخطوط ( مؤلف کا پتہ معلوم نہیں ) منتشر احوال و وقائع ( از حضرت تھانویؒ ) استطرادی واقعات ( جو مختلف کتابوں میں درج ہیں ) یادداشت واقعات ( مرتبہ مولانا قاری محمد طیب صاحب مخطوطہ ) ذیلی مضامین ( جو اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے )۔'' ۱۲ا

پھر اپنے اسی مقدمہ میں قاری طیب صاحب سبب تصنیف کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے

ہیں کہ:

''میں نے خود ارادہ کیا کہ اس کے لئے وقت دوں لیکن اول تو تاریخ نگاری کی واقعی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی۔ سلیقہ تو بجائے خود ہے۔'' ۱۱۳

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ اس غیر معمولی کارنامہ کو انجام دینے کے لئے مولانا عماد الدین صاحب شیر کوٹی کا انتخاب کیا۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کرنے کے بعد بھی چند ناگریز اسباب کی بنا پر اس مہم کو انجام دینے سے معذوری ظاہر کی۔ اس کے بعد یہ کام کچھ عرصہ تک زیرِ التواء رہا۔ تو مولانا مناظر احسن گیلانی نے سمت توجہ کی منتشر اوراق کو یکجا کر کے سوانح حیات مرتب کر دیا تو مسودہ دارالعلوم بھیج دیا۔ تاکہ زیور طبع سے آراستہ ہو سکے۔

کتاب کے تین حصے ہیں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ پہلے حصے میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے خاندانی حالات، ابتدائی ایام کے واقعات اور حصول علوم وفنون مختلفہ کے علاوہ کچھ علمی وقومی کارنامے قلم بند کئے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مولانا موصوف کی زندگی کے اہم ترین علمی، سیاسی، سماجی، اصلاحی اور قومی کارناموں پر تفصیلی بحث کی گئی ہیں۔ تیسرے اور آخری حصے میں مولانا کے نظریات وافکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلے حصے میں بیس ضمنی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تحریر کردہ مقدمہ صفحہ ۲۲ تک ہے۔ پھر اس کے بعد صفحہ ۴۸ تک حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح حیات من وعن نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب کے اندر چند تصاویر بھی منسلک ہیں جن سے مولانا کی خانگی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی تفصیل ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

صفحہ ٦٦ کے بعد نانوتہ کی جامع مسجد کی تصویر ہے جس میں حضرت مولانا نماز پنجگانہ ادا فرماتے تھے۔ صفحہ ۱۴٦ کے بعد نانوتہ میں حضرت مولانا کے جدی مکاں کے کھنڈرات کا نقشہ ہے جس کو دیکھنے کے بعد خاندانی جاہ وحشم اور فارغ البالی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۳٦۰ کے بعد حضرت کی سند حدیث جو حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی نے اپنے قلم سے لکھ کر عطا فرمائی تھی، کا تحریر عکس منسلک ہے۔

صفحہ ۴۲۰ کے بعد سہ دری جامع مسجد جہاں حضرت والا کا حجرہ تھا۔جس میں مذاکرات علمی وتدریسی انجام پاتے تھے۔اس کا نقشہ لگا ہوا ہے۔

صفحہ ۴۹۶ کے بعد حضرت مولانا کی ایک تحریر کا عکس ہے۔جس میں آپ نے فرائض کی رو سے اپنے جدی جائیداد کی تقسیم تمام اہل حقوق پر کی تھی۔صفحہ ۵۴۰ کے بعد جدّی مکان کے گنبد نما دروازہ اور اس کے بالائی حصہ کی تصویر ہے جہاں آپ کا زیادہ تر وقت عبادت وریاضت اور مجاہدہ میں گذرتا تھا۔

جہاں تک دوسری جلد کا سوال ہے تو دوسری جلد سے مولانا ممدوح کی زندگی کے اہم ترین کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتے ہیں۔ساتھ ہی اس عہد کے ملکی،سماجی اور سیاسی ماحول کی بھی خوب خوب عکاسی ہوتی ہے۔اس جلد میں ۸۶ ضمنی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔سبھوں کا یہاں نقل کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ اس کی گنجائش۔اس جلد کی خاص چند باتیں یہ ہے کہ اس میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تحریک جہاد، مولانا کا ملکی سیاست میں حصہ لینا،اہل بدعات کے خلاف اصلاحی اقدام،شیعہ حضرات کے عقائد فاسدہ کی اصلاح میں مولانا کی دلچسپی ،اسلام کے خلاف برادارانِ وطن کی ناپاک سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ان کا ہر ہر قدم پر جواب دینا۔مدرسہ دارالعلوم دیوبند کا قیام۔۱۸۵۷ء کے ملکی حالات،ملکہ وکٹوریہ کا جشن تاج پوشی اور اس عہد کے چند اکابرین اسلام کو تختہ دار پر چڑھایا جانا،اور اس کے ردعمل میں جہاد بالعمل کی تحریک چلانا وغیرہ وغیرہ معاملے بیان کئے گئے ہیں۔ان میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ ردعمل کے طور پر ہر حساس دل مشتعل ہوسکتا ہے اور یقیناً مولانا مناظر احسن گیلانی کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہوگا۔لیکن اپنے عرض ہنر سے اپنی تحریر میں کہیں اس طرح کا رنگ پیدا نہیں ہونے دیا۔اس حصے کے اقتباس پیش خدمت ہیں۔تا کہ اس جلد کی عبارت کا بھی اندازہ ہوجائے:

> ’’اسی زمانہ میں لوگوں نے ’’سماع موتی‘‘ کے پرانے مسئلہ کو پھر سے نئے سرے سے زندہ کرنا چاہا تھا۔عام مسلمانوں کے قبری کاروبار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کا یہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ’’ یہ کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں۔بعضوں نے چاہا کہ موتی کے سماع ہی کا انکار کردیا جائے۔مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ

بنیادی اڈے ہی کو اڑا دیا جائے نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے
گی۔" [۱۱۴]

جلد سوم ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلدوں کے مقابلہ میں صفحات یقیناً کم ہیں لیکن مرتبہ کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہیں چونکہ مولانا کی زندگی کے اس حصہ کو اس میں بیان کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں تپ کر بالکل کھری زندگی بن چکی تھی۔ اس حصہ میں ۶۰ ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں جن میں سے پہلا ہی عنوان بہت ہی دلچسپ اور چونکا دینے والا ہے وہ عنوان ہے "آخری سفر" یعنی اللہ کے گھر سے اللہ کی طرف سفر، مختصر یہ کہ یہ حصہ مولانا موصوف کی زندگی کے آخری ایام پر پورے طور پر محیط ہے۔ اس میں مولانا کے متعدد سفر حج اور سفر کے دوران دینی و علمی کارنامے، وطن واپسی، علالت اور وفات وغیرہ کو تفصیلی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے کے مطالعہ سے بھی مولانا کی مصروفیات اور قوم وملت کا درد جوان کے سینہ میں ہمیشہ پوشیدہ رہا اس کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانحی کاوشوں میں سے ایک عظیم کاوش کی حیثیت رکھتا ہے۔ انداز بیان، پیرایہ بیان، واقعات سے واقعات پیدا کر لیتے ہیں یعنی اصول کے تحت اخذ استنباط سے کام لینے کی وجہ سے اس کتاب کی عظمت و وقعت دوبالا ہوگئی ہے۔ لیکن بعضے مقامات پر بجائے طوالت کے اختصار سے کام لیا جاتا تو اور بھی زیادہ اس کی حیثیت بڑھ جاتی۔ لیکن اس کے باوجود بھی سوانحی کتابوں کی فہرست میں دانایاں فکر وفن اسے ممتاز مقام عطا کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

## سوانح ابوذر غفاری:

سوانح ابوذر غفاریؓ کا جو نسخہ پیش نظر ہے وہ ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ادارہ تاج المعارف دیوبند سے ۱۹۵۶ء زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی کامیاب ترین سوانح تصنیف ہے۔ اس کتاب کے شروع میں فہرست مضامین کے ادارہ کے ناظم مولانا سالم صاحب قاسمی نے اس کے اشاعت کے اسباب اور ادارے کی خدمات کا مختصراً خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے چند جملے بطور تمہید کے ہیں۔ جس سے کتاب کی نوعیت اور افادیت پر روشنی پڑتی ہے۔

اصل کتاب صفحہ ۹ سے شروع ہوتی ہے۔حضرت ابوذر غفاریؓ کے زندگی کے حالات و واقعات عربی زبان میں تو موجود تھےلیکن اہل اردو کے لئے ان پر پردہ دبیز پڑا ہوا تھااس پردہ کو اٹھانے کے لئے مصنف نے اس کتاب میں ۶۵ ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں۔جن میں چند اہم عنوانات ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔قبیلہ غفار کی جائے سکونت،غفاریوں کے اخلاق و عادات،آپ کی ولادت نام اور لقب ایام جاہلیت کے ابتدائی حالات،راہزنی سے توبہ اسلام سے پہلے عبادت خدا کا خیال مکہ کی طرف رخ کرنا دربار نبوی تک باریابی کے اسباب،مکہ مکرمہ کے تیس دن،قریش کا ظالمانہ برتاؤ،حضرت ابوذر کا اسلام لانا،حضرت ابوبکرؓ کے یہاں قیام کا زمانہ،اسلام کی دعوت پر سرفرازی،مکہ معظّمہ سے روانگی اور دعوت کی ابتدا مدینہ منورہ کا سفر، امارت،خدمت النبی صلی اللہ علیہ وسلم،دردمحبت،طریقہ تعلیم نبوی،جذب وسرمستی اور اس کی حقیقت،آپ کی مجذوبانہ وضع،اولاد سے بےخبری خودفراموش اور مجذوبانہ لباس،آپ کا اپنی بیوی کے ساتھ برتاؤ،آپ کا گھر اور روپیہ سے متعلق آپ کی تدبیر،ظرافت،سفر دمشق وشام،مسئلہ کنز،آپ کے سحر علمی پر ایک نظر،آپ کی تبلیغی اولوالعزمیاں،دمشق سے روانگی،حضرت ابوذرؓ پر حضرت عثمانؓ کی بدگمانی اور اس کی صفائی،اطاعت عثمانی کی نظر میں،آپ کا سن وفات وغیرہ۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے مضامین ہیں جن کو پیش کرنے کی یہاں گنجائش بھی نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔ان ہی مضامین سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ واقعی اس کتاب میں مولانا موصوف نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی کے اولین مراحل سے لے کر دم آخر تک کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ خلوت وجلوت اور خانگی زندگی سے بھی پردہ ہٹانے کی بڑی حسین کوشش کی ہے۔اور ایک سوانح نگار کا یہ فریضہ بھی ہے کہ اپنے منتخب ہیرو کی زندگی کے تمام تر پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرے۔

علاوہ ازیں ان تمام واقعات کے بیان کرنے میں استیعاب،طبقات ابن سعد،صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث کی روایتوں سے مدد لی ہے۔اس کے علاوہ اسلامی تاریخ میں ''فقر بوذر'' کی اہمیت ایک بلند و بالا کوہ کی سی ہے اس کی جانب علامہ اقبال نے بار بار اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔چونکہ ملت اسلامیہ میں اخلاقی درس کو عام کرنا مقصود تھا۔حضرت مولانا نے بھی حیات ابوذر غفاری کے ذریعہ ملت کے اندر اخلاق عالیہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔جہاں کہیں ماخذوں سے اخلاقی پہلوعیاں نہیں ہوسکتے تھے،وہاں ان کے

مروجہ اصولوں کے پیش نظر اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا ہے جبکہ خود ہی تمہید میں بیان کیا ہے۔اس کتاب کی عبارت اور طرز تحریر دونوں ہی مصنف کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ آسان مگر دلکش ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا کی علمی دنیا میں خوب خوب پزیرائی ہوئی جیسا کہ خود مولانا نے اس کتاب کے طبع سوم جو تیس سال بعد عمل میں آیا کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

''خلاصہ یہ ہے کہ ان صوری و معنوی نقائص اور کوتاہیوں کے باوجود جو اب تک اس کتاب میں باقی رہ گئیں تھیں۔یہ عجیب بات ہے کہ کہنے والوں نے من صنف استہدف (جس نے بھی تصنیف کیا وہ نشانہ بنایا گیا) کے فقرے کو ضرب المثل کی حیثیت سے مشہور کر دیا ہے۔ لیکن خدا کے فضل و احسان کے سوا اسے اور کیا سمجھوں کہ فقرہ کو بالکل اس کے برعکس اپنی اس کتاب کے متعلق من صنف عرف (جس نے تصنیف کی اس کی تعریف کی گئی) کا مسلسل تجربہ ہوتا رہا۔'' 15ؔ

اس کتاب پر مسلسل تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالواسع صاحب فرماتے ہیں:

''یہ سوانح حیات مولانا مناظر احسن کے عنفوان شباب کی ایک کوشش ہے۔لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا کی تمام سوانحی کتابوں سے زیادہ کامیاب ہے اس میں واقعات کی ترتیب میں ردوانتخاب سے کام لیا گیا ہے۔طوالت سے بچا گیا ہے۔اور مواد کے حصول میں اصابہ استیعاب اور ابن سعد وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے مندرجات اپنے وقت کی اہم شخصیتوں سے خراج تحسین وصول کرنے میں کامیاب ہوئے۔'' 16ؔ

بہر کیف مذکورہ بالا اقتباسات اور بیانات سے اس کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے ساتھ ہی اس سے مولانا مناظر احسن گیلانی کے علمی ذوق اور مذہبی رجحان کا بھی واضح ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

## سوانح حضرت اویس قرنیؒ:

سوانح حضرت اویس قرنیؓ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانحی تصنیف میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں کل ۶۴ صفحات ہیں۔ کتاب کے ابتدائی تقریباً گیارہ اوراق سوانح سے الگ ہے۔ چونکہ بعض اصحاب نے حضرت اویس قرنی کے وجود کا سرے سے انکار ہی کیا تھا۔اس لئے مولانا نے ان چند اوراق میں سب سے پہلے ان کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ منکرین کے صف میں کوئی معمولی اور ہمہ شما شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ امام مالک اور عمرو بن مرہ جیسے عظیم لامرتبت صحابہ ہیں۔ ابواسحاق جیسے مشہور زاہد ومتقی ہیں۔حتی کہ امام بخاری نے بھی شک کا اظہار کیا ہے۔اس کے علاوہ شیخ ابن عربی جنھوں نے حضرت آدم سے لے کر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک کے تمام قطبوں کا تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے بھی ان کے چچا کا ذکر نہیں کیا لیکن علاء الدولہ سمنانی اور عبدالوہاب شعرانی نے حجرت اویس قرنیؓ کے چچا عصام کی قطبیت کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ان مقتدر اور جلیل القدر ہستیوں کے اقوال سے مرعوب نہیں ہوئے۔اس کے برعکس انہوں نے سوانح حضرت اویس قرنیؓ کے وجود کو ثابت کیا ہے۔اور اصول حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے مفکرین کی روایتوں کو بہت حسین انداز میں مستند قرار دیا ہے۔ساتھ ہی ان کے وجود پر مستند کتابوں سے حوالے بھی دئے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

> ''صحیح مسلم شریف، مصنف بن ابی شیبہ، مستدرک حاکم، صحیح ابی عوانہ، مسند امام احمد حنبل، مسند ابی یعلیٰ، طبقات کبریٰ، خلیفۃ الاولیاء ابی نعیم، تاریخ دمشق لاہل عساکر، مسند رویانی، دلائل بیہقی، تاریخ بغداد و خطیب۔'' [۱۱۷]

صفحہ ۲۲ سے اصل مقصد کو بیان کرنا شروع کیا ہے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ آغاز حالات سے شروع ہوتا ہے۔خاندان اور نسب پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے اور ایک قطعی اور حتمی فیصلے تک بحث کو پہنچایا ہے اس کے بعد ان کے وطن عزیز سے متعلق تفصیلی اور نتیجہ خیز بحث کی گئی ہے پھر صفحہ ۳۵ پر محاصر رواج کے مطابق جسمانی ساخت اور حلیہ سے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> میں عرض کر چکا ہوں سبا کی شاہی خانوادہ سے سبائی عموماً حسین و خوبصورت گورے چٹے بلند قامت ہوتے تھے۔حضرت اویس کی پیشانی پر بھی یہ آثار ہویدا تھے۔حضرت اویسؓ کی پیشانی پر بھی یہ آثار دیکھنے

والے کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ گندمی تھا لیکن نہایت تیز سرخی وسپیدی میں
ملا ہوا تھا گویا ایک قسم کا بھورا رنگ تھا۔ کان ادم شدید الادمۃ۔
آپ گندمی رنگ تیز گندمی رنگ کے تھے۔ آپ کا قد حد درجہ موزوں واقع
ہوا تھا نہ زیادہ لانبے تھے اور نہ زیادہ پست۔ اس میں ایک دلکش اعتدال
تھا جو کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ آپ کی آنکھیں نرگسی اور شہلا تھیں۔
ایک خاص قسم کی ہیبت اس سے پھوٹی پڑتی تھی۔ روضہ میں ہے کہ آپ
مہیب النظر تھے آپ کا سینہ کشادہ اور چھوڑا تھا۔ مونڈھے ایک دوسرے
سے دور تھے جسم چھریرا اور لاغر تھا۔ آپ کی داڑھی کے بال الجھے اور
پریشان رہتے تھے سر ہمیشہ منڈا ہوا رہتا تھا۔ آپ کے بائیں پہلو پر ایک
سفید داغ تھا۔'' ۱۱۸؎

دوسرا حصہ صفحہ ۳۷ پر آپ کے قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے۔ پھر صفحہ ۳۸ پر آپ کا صحابی یا تابعی ہونا جیسے نزاعی مسئلہ کو چھیڑا ہے، اور اس باب میں علامہ حافظ ابن حجران عبداللہ اور ابن حزم وغیرہ کے اقوال کی روشنی میں پھر نجاشی بادشاہ کے اسلام قبول کرنے اور صحابہ کی جماعت کی فہرست میں شامل ہونے کے واقعہ کو درج کرتے ہوئے اقوال معترضہ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر ایک صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر اکتفا کرتے ہوئے تابعی قرار دیا ہے۔

اس کے بعد صفحہ ۴۹ پر آپ کے قبول اسلام، کے اسباب کی نشاندہی کی ہے اور اس باب میں ان کے مومن ہونے کا ذکر چھیڑا ہے ساتھ ہی اس عہد کے لوگوں کے مزاج وفطرت اور دینداری کے ماحول کا بھی مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی دربار رسالت میں حاضری سے محروم رہنے کی وجہ بھی حدیث کی روشنی میں پیش کی ہے۔

اس کتاب میں حضرت اویس قرنی کی نجی اور خانگی زندگی کے حالات وواقعات نہیں ملتے ہیں۔ محض ان کے وجود، ان کے خاندانی حالات اور ان کے قبول اسلام کے اسباب وعلل پر بحث کی گئی ہے اور ان کی ساری زندگی کے کارنامے کو فقط ماں کی خدمات پر محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ ذرائع کی قلت نے حالات وواقعات زندگی کے بیان کرنے سے قاصر رکھا ہے۔ جہاں تک زبان وبیان کا سوال ہے تو اس کی

عبارت آسان اور رواں ہے۔اس کے علاوہ مستند مآخذ سے حوالہ جات پیش کئے گئے ہیں اس وجہ سے اس
کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔دوسری بات یہ کہ اردو زبان میں حضرت اویس قرنی سے متعلق کوئی دوسری
کتاب دیکھنے کو نہیں ملتی اس لئے اس کتاب کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ممتاز فاخرہ،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص۲۶۶

۲۔مرزا حیرت دہلوی،سیرت محمدیہ،ص۱۴۱

۳۔الطاف فاطمہ،بحوالہ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا،ص۱۶۱

۴۔مرزا حیرت دہلوی،حیات طیبہ،ص۲۸۴

۵۔ممتاز فاخرہ،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ،ص ۲۶۸

۶۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا،ص۱۶۲

۷۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا،ص۱۶۳

۸۔مرزا حیرت دہلوی،حیات طیبہ،ص۴۰۱۔۵۰۱

۹۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۶۵

۱۰۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء،ص ۱۶۵

۱۱۔مرزا حیرت دہلوی،سیرت محمدیہ،ص۸

۱۲۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص۱۷۰

۱۳۔مرزا حیرت دہلوی،دیباچہ سیرت محمدیہ

۱۴۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص۲۶۹

۱۵۔عبدالرزاق کانپوری،البرامکہ ص۲۰

۱۶۔عبدالرزاق کانپوری، البرامکہ،ص۳۸

۱۷۔عبدالرزاق کانپوری،البرامکہ ص۱

۱۸۔ڈاکٹر نیر جہاں،مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص۲۷۰

۱۹۔عبدالرزاق کانپوری،البرامکہ ص۱۶

۲۰۔عبدالرزاق کانپوری،البرامکہ ص۲۴۶

۲۱۔عبدالرزاق کانپوری،البرامکہ ص۵۷۵

۲۲۔الطاف فاطمہ،اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص۲۰۱

۲۳۔سید افتخار عالم،مقدمہ حیات النذیر

۲۴۔سید افتخار عالم، حیات النذیر ص ۷

۲۵۔سید افتخار عالم، حیات النذیر، ص ۴۳۷

۲۶۔الطاف فاطمہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۲۶۵

۲۷۔الطاف حسین حالی، مقالات حالی ۲۰۵

۲۸۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین مقدمہ

۲۹۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین ص ۷

۳۰۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ عالمین ص ۷

۳۱۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین ص ۹

۳۲۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین ص ۱۹۹

۳۳۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین ص ۳۲۷

۳۴۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین، ص ۸۔۹

۳۵۔قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمتہ للعالمین، ص ۳۹

۳۶۔ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۹۹

۳۷۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص: ۱۰

۳۸۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص: ۱۱

۳۹۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص: ۱۰

۴۰۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص: ۱۱

۴۱۔عبدالسلام ندوی ، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص: ۲۰-۲۱

۴۲۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۲۱

۴۳۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۲۱-۲۲

۴۴۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۷۹

۴۵۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۷۴

۴۶۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۷۹

۴۷۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۷۷

۴۸۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۷۹

۴۹۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۸۰

۵۰۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۸۱

۵۱۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۱۳۲۔ ۱۳۳

۵۲۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص۱۳۸

۵۳۔عبدالسلام ندوی، سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ص۲۳۹

۵۴۔شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام، جلد دوم، ص۵۸۲

۵۵۔ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، ص۱۳۱۔۱۳۰

۵۶۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۲۔۱

۵۷۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۔۴

۵۸۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳

۵۹۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۳

۶۰۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص ۵۳۔۵۴

۶۱۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۴

۶۲۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۴

۶۳۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۵

۶۴۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص ۵۶

۶۵۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۷

۶۶۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۸

۶۷۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۶۰

۶۸۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص اقبال کامل ص۶۱

۶۹۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص اقبال کامل ص۶۷

۷۰۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۷۸

۷۱۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۸۴

۷۲۔عبدالسلام ندوی ، اقبال کامل ص۸۵۔۸۴

۷۳۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۸۷۔۸۶

۷۴۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۹۷۔۹۶

۷۵۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ۱۰۰

۷۶۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۰۱

۷۷۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل۱۰۳

۷۸۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ۱۰۴

۷۹۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل۱۰۴

۸۰۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل۱۰۴

۸۱۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل۱۰۵

۸۲۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل۱۰۵

۸۳۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۰۹۔۱۰۶

۸۴۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۳۸

۸۵۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۴۳

۸۶۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۴۳۔۱۴۴

۸۷۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۴۴

۸۸۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۶۲

۸۹۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۶۵

۹۰۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۶۶

۹۱۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۶۹

۹۲۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۷۸

۹۳۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۷۹

۹۴۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۱۸۷

۹۵۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۵۴

۹۶۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۲۵۵۔۲۵۶

۹۷۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۸۳

۹۸۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۹۱

۹۹۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۹۲
۱۰۰۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۹۹
۱۰۱۔عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص۳۹۹
۱۰۲۔مولانا مناظر احسن گیلانی، دیباچہ النبی الخاتم
۱۰۳۔مولانا مناظر احسن گیلانی، النبی الخاتم ص ۷
۱۰۴۔مولانا مناظر احسن گیلانی، النبی الخاتم ص ۱
۱۰۵۔مولانا مناظر احسن گیلانی، النبی الخاتم ص۲
۱۰۶۔مولانا مناظر احسن گیلانی، النبی الخاتم ص۳۔۴
۱۰۷۔مولانا مناظر احسن گیلانی، تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص۱۹
۱۰۸۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۲۸
۱۰۹۔مولانا مناظر احسن گیلانی، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص۲۱۲
۱۱۰۔مولانا مناظر احسن گیلانی، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص۵۱۴
۱۱۱۔ بزم رفتگاں حصہ اول ص۲۹۱
۱۱۲۔مولانا مناظر احسن گیلانی، مقدمہ سوانح قاسمی
۱۱۳۔مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ص۱۵
۱۱۴۔مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی جلد دوم ص۳۰
۱۱۵۔مولانا مناظر احسن گیلانی، دیباچہ سوانح ابوذر
۱۱۶۔ڈاکٹر عبدالواسع، بہار میں اردو سوانح نگاری کا ارتقاء، ص۱۶۳
۱۱۷۔مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح عمری حضرت اویس قرنی، ص۱۵
۱۱۸۔مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح عمری اویس قرنی، ص۳۶۔۳۵

ماحصل

ادبی بنیادوں پر انسانی زندگی کا جائزہ تاریخ اور عہد کی روشنی میں پیش کرنا خصوصی اہمیت کا حامل ہے عام طور پر جب کسی انسان کی زندگی کو بحث کا موضوع بناتے ہوئے اس کے دوران حیات وقوع پذیر واقعات کو بیانیہ شکل دی جائے تو یہ اظہار ادب میں ''سوانح نگاری'' کہلاتا ہے۔سوانح نگاری کا سلسلہ تذکرے سے جا ملتا ہے۔سوانح نگاری کسی فرد کی داستان حیات کو قلمبند کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں اس عہد کے تناظر میں پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات کو ارتقائی شکل میں پیش کیا جائے تا کہ شخصیت کی وجہ سے زمانے میں رونما ہونے والے تغیرات اور زمانے کے شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات نمایاں ہوں۔سوانح عمری کی اہمیت اس اعتبار سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ تاریخ،شخصیت،کردار،سیرت اور فطرت کی بھرپور نمائندگی ہوسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دورِ جدید میں سوانح نگاری کے فن کو انسانی حیات کی پیش کش کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کی زندگی کے پیچ وخم کو سبق آموز،عبرت آمیز اور قابل استفادہ بنانا ہر زندہ قوم کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ہمارے اسلاف نے قوم،ملک،سیاست،سماج،معاشرہ اور تہذیبی رویے کی بنیادوں کو استوار کرنے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ نا قابل فراموش ہیں۔اپنے اسلاف کے کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین ذریعہ سوانح نگاری ہے کیونکہ سوانح میں صاحب سوانح کی پوری زندگی کے پیچ وخم کو بغیر کسی مبالغے کے غیر جانبداری اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔جن

سوانحی تصانیف میں ان چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے وہی قابل اعتبار اور دانشوروں کی نظر میں قابل اعتنا ہو جاتی ہیں۔اس لئے ایک کامیاب سوانح نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ چند خصوصیت کا حامل ہو۔سب سے پہلے سوانح نگار جس شخصیت کی سوانح عمری لکھے اس سے پوری طرح واقف ہو،اس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر اس کی نظر ہو اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہو۔سوانح نگار کو صاحب سوانح سے ایسا تعلق ہو جو اس کے اندر اسکے حالات جاننے کا شوق،اس کی خصوصیات سے واقف ہونے کا داعیہ،اور اسکی زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کا جذبہ پیدا کرتا ہو۔سوانح نگار واقعات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔سوانح نگار واقعات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ایک اچھے اسلوب کا مالک ہو اور اپنی تحریر میں دلکشی کو باقی رکھے ورنہ سوانح عمری واقعات کی کھتونی نہ ہو جائے۔اس فن کے تقاضوں کا احساس ہو،صاحب سوانح کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو پیش کرتے ہوئے نہ بے جا مدح سرائی سے کام لے اور نہ نکتہ چینی سے جہاں تک ممکن ہو اسے چاہیے کہ صاحب سوانح کے حقیقی خدوخال روشن ہو۔

سوانح نگاری میں موضوع کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔سوانح نگار کو موضوع کے انتخاب کے وقت بہت ہی باریک بینی،دیانت داری اور غیر جانب داری سے کام لینا چاہیے۔سوانح نگار غیر جانب داری کے ساتھ اپنے ہیرو کی خوبیوں اور خامیوں کو قلم بند کرتا ہے۔اسے ایسے ہی واقعات کو پیش کرنا چاہیے جن سے ہیرو کی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آسکے۔موضوع کے انتخاب کے بعد سوانح نگار کے لیے سب سے اہم اور مشکل کام مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے۔اس حصول کے لیے مختلف ماخذ کا سہارا لینا ہوتا ہے۔مثلاً خود نوشت، روز نامچے،یادداشتیں،خطوط،سفرنامے وغیرہ ہیرو کے افعال واکرام،اقوال واعمال کی بنیاد پر سوانح نگار بہت سی چیزیں اخذ کرسکتا ہے۔سوانح نگاری میں اسلوب کی بھی بڑی اہمیت ہے۔سوانح نگار کے قلم میں تازگی،دل کشی اور شگفتگی ہونی چاہیے۔سپاٹ،بے رنگ اور بے رس اسلوب سے سوانح عمری کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔

تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری میں جو خاص فرق ہے اس میں سب سے اول تو یہ ہے کہ دونوں کا میدان عمل جدا جدا ہے۔یعنی تذکرہ کا میدان عمل کرداروں کی کثرت کی وجہ بڑا وسیع ہے کیونکہ تذکرہ نگار کے سامنے بے شمار شخصیتیں ہوتی ہیں جن کی زندگیوں کے حالات کو وہ مختصراً قلم بند کر دیتا ہے مگر اس کے برعکس سوانح نگاری کا میدان عمل محدود ہوتا ہے کیوں کہ سوانح عمری کا موضوع منفرد زندگی کی ہوتا ہے حالاں کہ بعض

اوقات صاحب سوانح کی فطرت وسیرت کے کسی پہلو کو اجاگر کرنے لیے بعض دوسرے کردار بھی پیش کیے جاتے ہیں لیکن ان کرداروں کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔تاہم سوانح عمری کا اصل موضوع منفرد زندگی ہے جو سوانح نگار کے خیال میں دلچسپ مکمل اور سبق آموز ہوتی ہے۔تذکرہ نگاری میں اس بات کی گنجائش ممکن ہی نہیں کہ ہر شخص کے حالات زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور اس کی فطرت وسیرت کے گوشوں کو بے نقاب کیا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے تذکرہ میں بے شمار افراد کی زندگی ،ان کے کلام کا انتخاب اور پھر ان پر تنقید ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سوانح نگاری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ صاحب سوانح کے رگ وپے میں سما کر اس کی مکمل شخصیت کو سامنے لاتا ہے۔سوانح اور خودنوشت میں واضح فرق یہ بھی ہے کہ سوانح مکمل ہوتی ہے۔اس میں کسی شخص کی پیدائش سے لیکر انتقال اور اس کے بعد تک کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے لیکن خودنوشت میں مصنف کے انتقال کا ذکر نہیں ہوسکتا اور جس دور میں مصنف اسے لکھتا ہے،اسی دور تک وہ محیط بھی ہوتی ہے۔اسی لئے خودنوشت کبھی مکمل نہیں ہوسکتی ۔سوانح اور خاکہ میں کچھ بنیادی فرق کہ بھی ہے، کہ سوانح میں کسی بھی انسان کی پوری زندگی یعنی پیدائش سے لیکر موت تک کے حالات قلم بند کیے جاتے ہیں ۔جب کہ خاکہ اختصار کا فن ہے۔ یہاں شخصیت کے چند پہلوؤں کو اس فنکاری سے برتا جاتا ہے کہ انسان پورا خاکہ قاری کے ذہن پر چسپاں ہو جائے ۔اپنی اصل کے لحاظ سے سوانح نگاری چوں کہ تاریخ کا ایک شعبہ ہے،اس لیے اس میں اور تاریخ میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔تاریخ میں حقائق کا بیان خشک انداز سے ہوتا ہے اور اس میں اجتماعی زندگیوں کو موضوع بنایا جاتا ہے جب کہ سوانح نگاری میں شخصی زندگی کا بیان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

جہاں تک اردو سوانح نگاری کے آغاز وارتقاء کا تعلق ہے،تو اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ عربی اور فارسی سے اس کا گہرا رشتہ ہے ۔عہد اسلام میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں تھیں اور ان تصانیف میں مذہبی ضرورت کے پیش نظر رویوں کے کردار کی جانچ پرکھ ہوتی تھی ۔اس کے علاوہ مسلم خلفا اور فاتحین کی سیرتوں میں سوانح عمری کے عناصر پائے جاتے تھے ۔اس لحاظ سے عربی میں سوانح عمریوں کے آثار نظر آتے تھے۔ دراصل مصنفین حالات پر نقد وتبصرہ کرتے وقت حقائق اور سچائی کا خاص خیال رکھتے تھے ۔وہ نجی جذئیات کو بھی بیان کر دیتے تھے ۔خاص طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرنے کا انداز ہ لائقِ تحسین ہے۔لیکن حالات کی کروٹ نے سوانح نگاری کے اس بہترین اور مبنی بر حقیقت انداز کو بدل ڈالا۔بے جا مدح

اور ستائش نے اس کی جگہ لے لی۔ سوانح کے علاوہ تذکرے بھی لکھے گئے جن میں سوانح کے اجزا منتشر تھے۔ شعراء کے فارسی تذکروں میں بھی ان کے حالات زندگی ملتے ہیں۔ تذکرہ کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس کی مدد سے فارسی میں مشاہیر شعراء کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں اردو میں شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف بکھرے عناصر مثنوی اور دیگر منظوم صورتوں میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں نصرتی کی ''علی نامہ'' اور وجہی کی ''قطب مشتری'' قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان میں مکمل سوانحی خصوصیات ناپید تھیں۔ شمالی ہند میں بھی اس دور میں مرثیہ نگاری کا رواج تھا۔ جس میں غیر شعوری طور پر سوانح کے خدوخال جھلکتے تھے۔ اس کے بعد تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ فارسی طرز پر اردو شعراء کے تذکرے لکھے گئے۔ ان تذکروں میں تو قیمتی سوانحی مواد ضرور ملتا تھا لیکن انھیں سوانح کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ ان میں حالات و واقعات کی تفصیل کے بجائے مدح اور ہجو کا پہلو زیادہ غالب ہوتا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ اس کے ذریعے تذکروں نگاروں کو اپنی فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی کا جوہر دکھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت بہت ہے، کیوں کہ ان کے ذریعے اس عہد کی تہذیب وتمدن، معاشرت، سیاسی اور معاشی حالات کا پتا چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو سوانح نگاری کے ارتقاء کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر ان تذکروں پر پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں سوانحی مواد موجود ہے۔ اردو سوانح نگاری سے قبل تذکروں کے علاوہ اور بھی بہت سے تحریریں موجود تھیں جن میں بالواسطہ سوانح کے نقوش ملتے ہیں۔ اور یہ کتابیں زیادہ تر مذہبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ فن سوانح نگاری کے اس ارتقائی دور میں سرسید احمد خان کی خدمات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ سرسید نے بہت زیادہ لکھا اور بہت کچھ لکھا، ان میں تہذیب الاخلاق کے مضامین اور خطوط بھی ہیں مگر ہمیں تین ایسی تصانیف بھی ملتی ہیں جن میں سوانح نگاری کے عناصر بڑی آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

بہر کیف اس کے بعد اردو سوانح نگاری کا باقاعدآغاز ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد مغربی طرز پر رکھی جاتی ہے اور یہی دور عہد سرسید بھی کہلاتا ہے جس میں حالی اور شبلی سے اردو میں باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ حالی نے فن سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو اپنی سوانح عمریوں میں برتنے کی بھرکوشش کی ہے۔ شبلی کی کتابوں میں تاریخ

اور سوانح دونوں کی آمیزش ہے۔ حالی نہ صرف اردو سوانح نگاری کے بانی ہیں بلکہ معمار بھی ہیں۔ حالی کے عہد تک سیرت اور حیاتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت سا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سوانح نگاری کو بطور ایک خاص صنف کے حاؔلی نے اپنایا اور اس کے واضح اور جدید نقوش تیار کئے۔ انھوں نے اس صنفِ ادب کی تنگ دامنی کو پوری طرح محسوس کیا اور سب سے پہلے ''حیات سعدی'' لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی سوانح عمریاں لکھ کر اردو سوانح نگاری کے فن کو درجہ کمال تک پہنچایا اسی لیے سوانح نگاری کی تاریخ میں حالی کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حالی نے اپنی پہلی سوانح عمری حیات سعدی میں فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی کے حالات قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب میں ان کے مرتبہ کو بھی اجاگر کیا۔ دوسری سوانح عمری یادگار غالب جس میں اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے حالات پیش کرنے، نیز ان کی شاعری کی افہام و تفہیم کا بھی حق ادا کیا ہے، اور تیسری سوانحی تصنیف حیات جاوید جس میں حالی نے ادیب، مورخ اور سب سے بڑھکر مصلح قوم سر سید احمد خان کے حالات پیش کئے ہیں۔

مولانا شبلی ایک سوانح نگار کی حیثیت بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے سوانح کے لیے ایسی عظیم شخصیات کو منتخب کیا جن کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے انسان کے سر ادب سے جھک جاتے ہیں۔ شبلی نے نامورانہ اسلام کو موضوع بنا کر سوانح لکھنے کا آغاز کیا۔ بادشاہوں میں ماموں رشید کی سوانح 'المامون' کے نام سے لکھی۔ علماء اسلام میں انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی سوانح 'سیرت النعمان' کے نام سے تصنیف کی۔ شبلی نے فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح 'الفاروق' کے عنوان سے لکھی۔ جس میں ان کے تفصیلی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے دور خلافت کے عروج و زوال اور پیچ و خم کو بخوبی واضح کیا ہے۔ الفاروق کے بعد امام غزالیؒ کی سوانح 'الغزالی' کے عنوان سے لکھی، اور شاعروں میں فارسی زبان کے اہم ترین شاعر مولانا رومؒ کے نام تصنیف۔ شبلی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح جدید طرز پر لکھنے کی داغ بیل ڈالی اور 'سیرت النبی' صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے کچھ حصے تصنیف بھی کیں۔ حالی اور شبلی کی سوانح نگاری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوانح کو اردو میں بطور ایک صنف کے متعارف کرانے کا کارنامہ انہیں حضرات نے انجام دیا۔

حالی اور شبلی کے بعد میں جو سوانح نگار منظر عام پر آئے ان میں مرزا حیرت دہلوی ،عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار عالم ،قاضی محمد سلیمان منصور پوری ،سید سلیمان ندوی ،اسلم جیراج پوری ،فوق بلگرامی ،عبدالسلام ندوی، مولوی اکرام اللہ ندوی ،رئیس احمد جعفری ،غلام رسول مہر ،شیخ محمد اکرام، قاضی عبدالغفار ، مولانا عبدالماجد دریابادی اور صالحہ عابد حسین وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

حالی کی کتاب حیات سعدی (۱۸۸٦ء) کو اردو کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری خیال کیا جاتا ہے۔حیات سعدی مولانا حالی کا وہ کارنامہ ہے جن کے بارے میں مختلف نقاد کہتے ہیں کہ حالی اور سعدی شیرازی کی ذات میں بہت مماثلت نظر آتی ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ''یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا حالی اپنی شخصیت ،ادبی مذاق اور علمی رجحان کے لحاظ سے سعدی کے ساتھ کئی باتوں میں مماثلت رکھتے ہیں۔گویا اس انتخاب سے خود مولانا کی نفسیات آشکار ہورہی ہے۔حالی اور سعدی دونوں جامع نظم ونثر تھے۔دونوں شاعری اور نثر نگاری میں ایک طرز نو کے موجد تھے۔دونوں صنعت ،تلف ،مبالغہ اور اغراق سے متنفر تھے۔'' (سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقاء ص۱۰۰)

حالی نے اپنی پہلی سوانح عمری حیات سعدی میں فارسی کے مشہور شاعر سعدی شیرازی کے حالات قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ فارسی ادب میں ان کے مرتبہ کو بھی اجاگر کیا۔حیاتِ سعدی دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔پہلا باب جو شخصیت اور سیرت سے متعلق ہے، نہایت مختصر ہے۔دوسرا باب سعدی کی تصانیف کی تفصیل وتبصرہ کے لیے ہے۔خاتمہ پر عام حالات اور شاعری پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔''حیات سعدی'' اسلوب کے اعتبار سے صاف اور سادگی کا مرقع ہے۔بحیثیت مجموعی یہ تصنیف سعدی کی شخصیت اور کلام کا بہتر جائزہ ہے۔

یادگارِ غالب عظیم شاعر اور پر کشش شخصیت کے مالک ،غالب پر لکھی گئی پہلی مفصل کتاب ہے۔ غالب کی عظمت اور شاعرانہ انفرادیت کے بارے میں حالی نے سب سے پہلے لکھا اور اس طرح موثر اور دلکش انداز میں لکھا کہ ایک زمانہ غالب کی عظمت اور پر کشش شخصیت کا قائل ہوگیا۔اس کے بعد غالب پر لکھی گئی ہر

کتاب پر حالی کی کتاب کا اثر قائم رہا۔اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود غالبیات کے سرمائے کی یہی سب سے نمایاں کتاب ہے۔اس سوانح میں غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، اوراس سے حالی کی غالب فہمی کا ثبوت ملتا ہے اورہمیں غالب کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔حالی غالب کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے، اور غالب کے کلام کی صحیح مقام ومحاسن کی خوبیاں، زبان کی جدتیں ونزاکتیں لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتے تھے۔ناقدین نے یادگار غالب میں اظہار کردہ باتوں سے کہیں کہیں اختلاف تو کیا لیکن بالکلیہ طور پراس کورد نہیں کیا، اوراس کے حوالے سے بحث آج بھی جاری ہے۔حالی نے غالب کی زندگی کے حالات نجی باتوں اور غالب کے لطائف وظرائف کی طرف کم توجہ کی اوران کی تصانیف کے مطالعے کی طرف زیادہ۔حالی نے غالب کی مروّت ،مزاج ،حوصلگی ،حسن بیان ،ظرافت ،خودداری ،محققانہ نظر ،راست گفتاری اور دادسخن وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں ۔یادگارِغالب سے مرزاغالب کے رہن سہن ،کھانے پینے کے طریقے ،ان کے عادات واطوار سبھی پر روشنی پڑتی ہے۔ان کی شراب نوشی کی عادت شطرنج وچوسر وجوا کھیلنے کی عادت کا بھی ذکر ملتا ہے۔مرزا غالب کی لا مذہبیت پر بھی حالی نے روشنی ڈالی ہے۔اس لیے یہ قطعی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں صرف غالب کی شاعری پر تنقید کی گئی ہے۔حالی لکھتے ہیں کہ غالب شگفتہ مزاج تھے شوخی و ظرافت ان کی طبیعت میں داخل تھی۔حالی نے غالب کی خوش مزاجی ظاہر کرنے کے لیےاس کتاب میں بہت سے لطیفے جمع کیے ہیں۔غالب کی ابتدائی شاعری سے لیکر آخری عمر کی شاعری کو حالی نے یادگارِ غالب میں جمع کیا ہے۔غالب کی شاعری کے مختلف موضوعات بھی بیان کیے ہیں جن میں عاشقانہ،صوفیانہ، رندانہ اور فخریہ شاعری شامل ہے اور تشبیہات واستعارات کا بھی بیان کیا ہے۔یادگارِغالب میں حالی نے غالب کی نثر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔غالب کے خطوط ان کا القاب وآداب ختم کرنے کا طریقہ اور مراسلے کو مکالمہ بنادینے کا آرٹ سبھی چیزوں پر تبصرہ ملتا ہے۔

''حیات جاوید'' حالی کا تیسرا بڑا کارنامہ ہے۔حالی نے اس تصنیف میں سرسید احمد خان پر قلم اٹھایا ہے حالی نے سرسید جیسی مصروف ومقبول شخصیت کی سرگزشت لکھنے کا پروگرام اس وقت ترتیب دیا جب سرسید علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔۱۸۹۴ء میں حالی کچھ ماہ کے لیے علی گڑھ میں مقیم ہوئے تا کہ اس وسیع معلومات کے ذخیرے سے فائدہ اٹھائیں جو وہاں موجود تھا۔اس کے ساتھ ساتھ انہیں سرسید کو قریب سے

جاننے کا موقع ملا۔

حالی نے علی گڑھ میں قیام کے دوران میں تمام ماخذ اور مصادر سے فائدہ اُٹھایا اور سرسید کی سوانح بڑی ذمہ داری سے مرتب کی کیوں کہ کوئی شخص اس وقت تک حقیقی سوانح نگار نہیں بن سکتا جب تک اس کے مزاج اور طبیعت میں بشریت کے بنیادی خصائص اور انسانیت کے تمام پہلوؤں سے ہمدردی کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ سوانح نگاری ایک ایسا علمی کام ہے جس کی تکمیل کے لیے صرف علم اور محنت کافی نہیں۔ حالی میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں:

> ''مولانا حالی ایک حقیقی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے اور قدرت کی طرف سے ایک ایسا دل ودماغ لے کر آئے تھے جس میں شریفانہ جذبات، جوہر شناسی، سلاست باشی اور اُنس ومحبت کے احساسات بدرجہ اتم موجود تھے انہی اوصاف کی بنا پر اہل بصیرت کی بارگاہ سے انہیں خوش صفات حالی کا خطاب عطا ہوا ہے۔'' (حیات جاوید پر ایک نظر، ص۲۰)

سرسید کی سوانح حیات مرتب کرتے ہوئے حالی کو تمام مشکلات کا احساس تھا وہ جانتے تھے کہ جہاں سرسید کی تعریف وتوصیف کرنے والے موجود ہیں وہاں ان پر نکتہ چینی کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ حالی نے سرسید کو ایک انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی خوبیاں اور خامیاں دونوں پیش نظر رکھی ہیں البتہ سرسید کے کارناموں کو زیادہ روشن کر کے دکھایا ہے اور خامیوں کی طرف اشاروں سے کام چلایا ہے۔

اسی لیے بہت سے لوگوں نے اعتراض کیا کہ حالی نے حمایت سرسید میں لمبی تمہیدیں لکھیں ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے سرسید جیسے عظیم مرتبہ انسان کو حالی نے اس عظیم مقام حیات جاوید کی حیثیت سے دلایا۔

حیات جاوید میں حالی نے مختلف ذرائع سے استفادہ کیا انہوں نے کرنل گراہم کی مختصر سوانح عمری کا مطالعہ کیا اور منشی سراج الدین کے مسودہ سے بھی فائدہ اٹھایا۔ علاوہ ازیں مکتوبات سرسید کو بھی پیش نظر رکھا الغرض حالی نے حیات جاوید کی ترقی وتدوین میں ہر ممکن طریقے سے جامع مواد حاصل کیا اور ہمارے سامنے

سرسید کی حیات کولفظوں کا عمامہ پہنا کر کھڑا کیا۔

حیات جاوید کو حالی نے دوحصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ سرسید کے خاندان سے متعلق ہے ان کے ننھیال کے حالات سرسید کی تحریر کردہ سوانح عمری سیرت فریدیہ سے حاصل کئے۔حالی یہ بھی بتاتے ہیں کہ سیرسید بہت بے باک نڈر انسان تھے۔حیات جاوید کے دوسرے حصے میں حالی نے سرسید کی تصانیف اوران کے کارناموں کا ناقدانہ تجزیہ پیش کیا۔اسی حصے میں حالی سرسید کی ترقی کے اسباب کوبھی زیر بحث لائے اوران کی خدمات کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا ہے حالی نے سرسید کی علمی خدمات اسلوب بیان اور طرز تحریر پر بھی تبصرہ کیا۔ حیات جاوید پورے عہد کی کہانی قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ حالی نے اس میں اس زمانے کے معاشرتی ،سماجی عوامل کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ ہندوستان کی امت مسلمہ کی ذہنی اورفکری سوانح عمری ہے یہ اس وقت کے مسلمانوں کا آئینہ ہے ۱۸۵۷ء کا دور مسلمانوں میں اجتماعی جمود کا دور تھا اس میں سرسید پر تنقید بھی ہے اور ایک کشمکش بھی ۔ یہ تاریخی اہمیت کی حامل سوانح عمری ہے ۔ چنانچہ اس حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

''ایک اعتبار سے یہ مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔''(یادحالی،ص ۲۳۸)

بہرکیف حیات جاوید کواردو کی بہترین سوانح عمری قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ سوانح عمری بے شک بہت طویل ہے لیکن اس کی طوالت گراں نہیں گزرتی۔

شبلی عہد سرسید کے دوسرے بڑے سوانح نگار ہیں۔انھوں نے تاریخ اسلام کی مقدس ہستیوں کو اپنی سوانح عمریوں کا موضوع بنایا۔المامون (۱۸۸۹ء)،سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء)،الفاروق (۱۸۹۸ء)،الغزالی (۱۹۰۲ء)،سوانح مولانا روم (۱۹۰۲ء)،سیرۃ النبی جلداول (۱۹۱۸ء)،سیرۃ النبی جلددوم (۱۹۲۰ء) وغیرہ ان کی قابل قدر سوانح عمریاں ہیں۔

''المامون''،شبلی کی پہلی سوانحی تصنیف ہے۔سرسید نے اس کتاب پر جومختصر دیباچہ لکھا ہے،اس میں کتاب کی جس خصوصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے،اس کا اطلاق صرف 'المامون' پر نہیں ،شبلی کی تمام سوانحی کتب پر ہوتا ہے۔شبلی کا ارادہ پہلے عباسی خاندان کی تاریخ رقم کرنے کا تھا،بعد میں انہوں نے فرمانروایانِ اسلام کے

لکھنے کا منصوبہ بنایا ،لیکن مصروفیت کی وجہ سے یہ بھی عملی جامہ نہیں پہن سکا ،لہذا شبلی نے 'ہیروز آف اسلام' سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر عباسی خلیفہ مامون الرشید پر قلم اٹھایا۔شبلی خود بھی علم کے پیکر تھے ،انہیں فلسفہ وکلام سے گہری رغبت تھی ۔مسلمانوں میں فلسفہ وکلام کی اصل اشاعت مامون کے دور میں ہوئی ،اس عہد میں آزادیٔ فکر کا جو ماحول تھا ،بالخصوص مذہبی آزادی ،علم وفضل اور تہذیب وتمدن کی جو فضا چھائی ہوئی تھی ، اسے شبلی مغربی نقادوں کے الزامات کا جواب تصور کرتے تھے اسی لیے انہوں نے خلقِ قرآن کے فتنہ کو بھی نظرانداز کرکے مامون کو اسلامی ہیرو کے طور پر پیش کیا۔'المامون' بظاہر ایک سوانح عمری ہے لیکن اس میں بھی شبلی کا سوانحی انداز ،تاریخی انداز سے بہت متاثر ہے ۔یہ حقیقت ہے کہ مامون پر قلم اٹھانے شبلی کا مدعا ،اسلامی تاریخ کے اس عہد زریں کو پیش کرنا تھا ،جو خوشحالی مادّی ترقی اور آزاد خیالی کے لحاظ سے دورِ حاضر کا ہمسر نظر آتا ہے ،اپنے اس مقصد میں وہ نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس کے نتیجہ میں اردو ادب کو ایک شاہکار سوانحی تصنیف بھی میسر آ گئی ۔

''سیرۃ النعمان'' جو علامہ شبلی کی دوسری اہم سوانح ہے ۔شبلی کو امام اعظم ابوحنیفہؒ سے جو تعلق خاطر تھا ، اسی موانست کی بنا پر ان کا لقب نعمان ہوا ،یہ ان کے والد کے نام کا بھی جز و تھا۔سید صاحب کے خیال میں یہی تعلق اور جذبہ 'سیرۃ النعمان' لکھنے کا باعث بنا لیکن ایک بڑا محرک یہ بھی تھا کہ حالات زمانہ کے لحاظ سے جو حقیقت پسندی ،میانہ روی ،اسلامی نظامِ قانون کو برسرِ کار لانے کے لیے شبلی ضروری سمجھتے تھے ،اس میں امام ابوحنیفہ کا طریقہ کار معاون ثابت ہوتا تھا۔اسی لئے 'سیرۃ النعمان' کا کلامی اور اصلاحی پہلو کافی اہم ہے ۔اس سوانح عمری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کو مواد کی کمی نے کافی پریشان رکھا۔سوانح کے اول حصے میں ذاتی حالات اور شخصیت کا بیان ہے ۔دوسرے حصے میں امام صاحب کے طرز اجتہاد اور اصول استنباط پر بحث کی گئی ہے ،جو بقول شبلی ان کی محنتوں کی ''تماشہ گاہ'' ہے ۔یہی کتاب کی جان اور مصنف کی علمیت ،غور وفکر، سلیقہ استدلال اور مشکل مسائل کو حل کرنے کی قابلیت کا شاہکار ہے ۔سوانح میں امام ابوحنیفہ کی بشری کمزوریوں اور مناظرات میں اِدعا نیز جوش مقابلہ کے اثرات کا ذکر کرکے انہیں امام صاحب کی تواضع اور بے نفسی کے خلاف قرار دیا ہے ۔

سیرۃ النعمان کی یہی خوبیاں اور خصوصیات ہیں جس کی بنا پر وہ خوش اعتقادی کم اور حقیقت بیانی زیادہ

نظر آتی ہے اور شبلی کے شعور فن کا اعلیٰ مظاہرہ قرار پاتی ہے۔

''الفاروق'' کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوتا ہے، جس میں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار، ان کی خصوصیات اور مؤرخین کے فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ یورپین مورخوں کی بے اعتدالی اور اسلام کے بارے میں ان کے گمراہ کن نظریات کا ذکر بھی ہے۔ حالانکہ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح پر عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن علامہ شبلی کی 'الفاروق' بے مثال ہے۔ اس سوانح کو مرتب کرنے میں شبلی نے نہ صرف ہندوستان کے جملہ ذخیرہ معلومات کا استعمال کیا بلکہ روم، شام اور مصر کے کتب خانوں کو بھی چھان مارا ہے، جس کا نتیجہ اس حد تک کامیابی کی صورت میں نکلا کہ یہ اردو زبان کے لئے سرمایہ افتخار بن گئی۔ خود شبلی کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا۔ شبلی کی دوسری سوانح حیات کی طرح 'الفاروق' بھی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ حصہ اول میں حضرت عمر فاروقؓ کے حسب ونسب، ولادت، سنِ رُشد، قبول اسلام اور ہجرت خلافت اسلامیہ کے لئے ان کے انتخاب اور ان کے عہد کی فتوحات کا بیان ہے جبکہ دوسرے حصے میں عہدِ فاروقی کی فتوحات کا جائزہ لیتے ہوئے اسباب فتوحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی نوعیت، ملک کی تقسیم، عہدیدارانِ سلطنت کے فرائض، رشوت سے متعلق دلچسپ معلومات، صیغہ محاصل اور محکمہ عدالت کی کاروائیاں، پولس اور فوجداری محکمہ کی کارکردگی نیز محکمہ مالیات اور دفاع سے متعلق تفصیلات مذکور ہیں۔

''الغزالی'' بھی شبلی کی ایک اہم تصنیف ہے۔ مصنف نے اس تصنیف کو بھی دو حصوں میں بانٹا ہے۔ پہلے حصے میں صاحب سوانح کی حالات، ولادت، تسمیہ، تعلیم، دربار سے تعلق، نظامیہ کی تدریس، ترک تعلق، تصوف کے علمی تجربات، عروج اور حاسدوں کی دشمنی، وفات اور شاگردوں کے حالات وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں امام صاحب کے علمی کمالات اور ان کے علمی خدمات کی تفصیل ہے۔

اس میں ان کی تصانیف کا ذکر اور ان پر مختلف حیثیتوں سے بحث اور اہم تصانیف پر تبصرہ ہے۔ احیاء العلوم پر نہایت مفصل ریویو ہے۔ اس میں امام صاحب کے فلسفہ اخلاق اور اس کی خصوصیات کا خلاصہ آ گیا ہے، جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک علم اخلاق کا سرمایہ کیا تھا۔ احیاء العلوم نے اس میں کیا اضافہ کیا اور فلسفہ اخلاق پر امام صاحب کی نظر کتنی گہری تھی۔

''سوانح مولانا روم'' اور ''الغزالی'' کی اشاعت کا سال ایک ہی ہے۔ لیکن الغزالی کے بعد سوانح

مولانا روم شائع ہوئی۔سوانح مولانا روم کی تصنیف سے مصنف کا مقصد مولانا روم کی مثنوی کو ایک شاہکار درجہ دینا تھا۔اس کتاب کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہیرو کے نام ونسب،تعلیم وتربیت ،شادی ،اولاد اور وفات وغیرہ کا تذکرہ ہے۔دوسرے حصے میں مولانا کی تصنیفات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

شبلی کی آخری اور شاہکار تصنیف ''سیرۃ النبی'' ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ جاوید تصنیف ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔علامہ شبلی نے صرف اس کی دو جلدیں ہی لکھی تھیں کہ ان کی وفات ہوگئی۔ باقی پانچ جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ترتیب دیں۔ یہ کتاب کل سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ سیرۃ النبی کو اردو کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔انہوں نے اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات کو جدید اصولوں کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے جن پہلوؤں پر مسیحی اور دیگر مصنفین نے اعتراضات کرکے شکوک وشبہات پیدا کر دیئے تھے۔شبلی نے اس کتاب میں ان اعتراضات کا مسکت جواب دیا ہے اور انہیں منطقی دلائل اور تاریخی شواہد کے ساتھ رد کیا تھا۔مختصر یہ کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم شبلی کا آخری اور زندہ جاوید تصنیفی کارنامہ ہے۔

سید سلیمان ندوی نے متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔مثلاً سیرت عائشہ،حیات امام مالک،رحمت عالم، عمر خیام،حیات شبلی اور سیرت النبی کی آخری پانچ جلدیں۔ یہ ان کی مشہور اور قابل قدر تصانیف ہیں۔

''سیرت عائشہ'' (۱۹۱۷ء) سید سلیمان ندوی کی پہلی سوانحی تصنیف ہے۔اس کتاب کی تصنیف سے مصنف کا مقصد مسلم معاشرے اور خاص طور سے مسلم خواتین کی اصلاح ہے۔عورتوں کی اصلاح کے لیے حضرت عائشہ کی زندگی ایک عمدہ نمونہ ہے۔اس لیے مصنف نے حضرت عائشہ کی پاکیزہ سیرت کے ذریعے عام عورتوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ یہ سوانح عمری نہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ امت مسلمہ کی قابل صد احترام ماں کی سوانحی تصنیف ہے جس میں ایک عورت کی زندگی اور فطرت کے گوناگوں پہلو پیش کیے گئے ہیں بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ عورت ایک قابل احترام عالمہ، فاضلہ وغیرہ مختلف روپ میں نظر آتے ہے۔ مصنف نے سوانح عمری میں غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔اس لیے سیرت عائشہ اردو کی قابل قدر سوانح عمریوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

''حیات امام مالک'' سید سلیمان ندوی کی دوسری سوانحی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۷ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے لکھے جانے کا مقصد مصنف کا یہ تھا کہ امام مالک کے پردے میں علوم اسلامیہ کی تاریخ اور مسائل کی تشریح کی جائے۔ اس لیے انھوں نے امام مالک کے کارناموں پر زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ ولادت، بچپن، تعلیم و تربیت اور ماحول پر زیادہ روشنی ڈالنے کے بجائے وہ علم فقہ کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ فقہائے مدینہ اور شیوخ تابعین کی فہرست اور ذکر کے بعد ان کی علمی حیثیت کا بیان بھی بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اس طرح اخلاق و عادات اور ذاتی حالات جن کی تفصیل سوانح عمری کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ انھیں بیان کے بغیر مصنف نے امام صاحب کے اجتہادات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر کیف اردو میں امام مالک کی یہ پہلی مستند سوانح عمری ہے۔ لیکن اسے خالص سوانح عمری نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہیرو کے شخصی اور نجی حالات و واقعات کو مصنف نے مطلقاً پیش نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک خالص سوانح عمری کا درجہ نہیں دے سکتے۔

سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۳ء میں ''عمر خیام'' کے نام سے ایک سوانح عمری مرتب کی جو مفصل سوانح عمری ہے۔ سید صاحب نے خیام کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور خیام سے متعلق بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً خیام کی سالانہ امداد، گوشہ نشینی، سلطان سنجر اور خیام کے تعلقات وغیرہ پر مصنف نے ناقدانہ بحث کی ہے جس سے سوانح میں کافی حد تک ایک علمی مقالے کا طرز پیدا ہو گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی مشہور سوانح تصنیف ''حیات شبلی'' ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو حالی کی حیات جاوید کے بعد اردو کی دوسری مفصل سوانح عمری تسلیم کیا جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کو اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی سے بڑی عقیدت تھی اور حیات شبلی لکھ کر انہوں نے اپنے استاد کا حق ادا کیا۔ اور پوری کتاب میں وہی طریقہ اختیار کیا جو شبلی کا تھا۔ سید سلیمان ندوی بھی سیاسی اور تاریخی پس منظر میں ہیرو کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے شبلی سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ مختصر یہ کہ سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے ذریعے علامہ شبلی کی ایک خوب صورت تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔

عہد سر سید میں حالی اور شبلی کے علاوہ جن لوگوں نے سوانح عمریاں لکھیں ان میں مرزا حیرت دہلوی

ہیں اور باقی دوسرے عبدالرزاق کانپوری، سید افتخار عالم، قاضی محمد سلیمان منصور پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔مرزا حیرت دہلوی نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔اوران کی سوانحی تصانیف کی تعداد بھی بہت ہے لیکن ان میں سے حیات طیبہ، حیات فردوسی اور سیرت محمدیہ زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

''حیات طیبہ'' مولانا اسماعیل شہید کی سوانح عمری ہے۔اس میں مصنف کا فن زیادہ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔اس تصنیف سے مصنف کا خاص مقصد ہیرو کی ذاتی خوبیوں کی وضاحت اور یوروپین مورخین کے غلط الزامات کا ازالہ ہے۔مصنف ایک اچھے سوانح نگار کی طرح اپنے ہیرو کو مافوق الفطرت بنا کر پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک مجاہد اور سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے اس کی بشری خصوصیات پر نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے واقعات کا انتخاب کرتے ہیں کہ جن سے ہیرو کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف سید احمد بریلوی کی سوانح حیات بھی پیش کرتے ہیں۔

''حیات فردوسی'' مرزا حیرت دہلوی کی دوسری تصنیف ہے۔یہ کتاب فردوسی کی حیات پر ہے۔اس کے ابتدائی حالات بہت مختصر ہیں۔صرف اسی واقعہ پر مصنف نے زور دیا ہے جس کے آس پاس فردوسی کی تمام زندگی کی گھومتی رہی ہے اور اگر وہ مفصل طور پر فردوسی کے عادات واطوار پر روشنی ڈالتے تو شاید اس خوبی اور بے تعلقی سے نہ ڈال سکتے، جس طرح اس واقعہ کے ضمن میں اس کی شخصیت خود بخود ہمارے سامنے آ گئی ہے۔اس طرح مرزا حیرت بعض اہم اور ضروری معاملات پر روشنی ڈالے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔محض اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ ان کا پسندیدہ ہیرو ایک گروہ کے لیے ہیرو اور دوسرے گروہ کے لیے ویلن ہو جائے۔

''سیرت محمدیہ'' بھی مرزا حیرت کی دہلوی کی ایک سوانحی تصنیف ہے۔اس تصنیف سے مصنف کا مقصد مستشرقین کی طرف سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کا جواب دینا ہے۔ اس کے علاوہ امیر علی کی کتاب ''اسپرٹ آف اسلام'' سے بھی بعض مسائل میں اختلاف کیا ہے۔خلافت عثمانؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کے متعلق پیدا کردہ غلط فہمیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور ان کا ازالہ بڑے مدلل انداز میں کیا ہے۔بہر کیف اس کتاب کو مکمل سوانح عمری نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات اور تاریخی شواہد سے اعتراضات کا جواب دینے کے علاوہ عالم اسلام کے تاریخی حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

ان سوانح سوانح نگاروں میں ایک اہم نام عبدالرزاق کانپوری کا بھی ہے۔جن کی مشہور اور گراں قدر تصنیف ''البرامکہ'' ہے۔عبدالرزاق کانپوری نے سلسلہ ناموران اسلام کی شروعات البرامکہ سے کی اور اس کے مفصل حالات بطور تذکرے کے ترتیب وار لکھے۔

اس کے ذریعے خاندان برامکہ کا نام اوران کے فضل وکمال سے قوم میں ایک عمدہ تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی۔اس کتاب کے لیے مصنف نے خاندان برامکہ کے تین ہیروز کو منتخب کیا۔یحیٰ، فضل اور جعفر برمکی۔لیکن یہ صرف ان تینوں کی سوانح حیات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ ایران کی قدیم عظمت کی کہانی، عہد عباسی کے تمدن وتہذیب کی تاریخ اور سلامی تاریخ کے خوب صورت دور کی جیتی جاگتی تصویر کشی بھی ہے۔مصنف نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا حصہ یحیٰ برمکی کی سوانح عمری پر مشتمل ہے۔ اس میں یحیٰ برمکی کے حالات، سیرت وکردار، سلطنت عباسیہ کی شان وشوکت کے نقوش جھلکتے ہیں۔ہیرو کی سیرت، ان کے علمی بصیرت، سخاوت اور فہم پر دلچسپ انداز میں روشنی دالی گئی ہے۔دوسرا حصہ فضل برمکی کے حالات اور کارنامے پر ہے۔تیسرے حصے میں مصنف نے جعفر برمکی کی سوانح حیات قلم بند کیا ہے۔اس حصے میں مصنف نے ہیرو کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ہیرو کی شان وشوکت بیان کرنے کے بعد اس کے زوال اور تباہی کے جو واقعات مصنف نے بیان کیے ہیں وہ قابل عبرت ہیں۔انھیں بیان کرتے وقت مصنف کو بھی افسوس ہوتا ہے لیکن وہ اس افسوس اور ہمدردی کی آڑ میں حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالتے ہیں۔بہرکیف مصنف نے اس کتاب میں ایک سنجیدہ اور دیانت دار سوانح نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

سید افتخار عالم بھی اس دور کے سوانح نگاروں میں شامل ہیں۔اس سلسلے میں ان کی اہم تصنیف ''حیات النذیر'' ہے۔اس کتاب میں مصنف نے بڑے دعوے کے ساتھ اپنے ہیرو کے درست حالات وواقعات کا انتخاب کرنے کی بات کہی ہے۔وہ ہیرو کو خطا ونسیان سے آزاد نہیں سمجھتے ہیں۔اس لیے ان کا دعویٰ ہے کہ وہ صاحب سوانح کی تصویر کے دونوں رخ پیش کریں گے۔انھوں نے اس کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جس میں ہیرو کی ولادت، بچپن، تعلیم، تربیت، شادی، ملازمت، اخلاق وعادات، مذہب، علمی وعملی کارنامے اور تصانیف وغیرہ پر تبصرے ہیں۔مجموعی طور پر اس کتاب میں مولوی نذیر احمد کی شخصیت اور

کارناموں کا خوب صورت انداز میں ذکر ملتا ہے۔

اس دور کے ایک اور اہم سوانح نگار قاضی محمد سلیمان منصور پوری ہیں۔''رحمتہ للعالمین'' ان کی قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں قاضی صاحب نے اسلامی کتابوں کے علاوہ زبور، توراۃ، انجیل اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے استفادہ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام تمام مذاہب سے برتر و بالا ہے۔اور بانی اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت تمام انسانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔لیکن اس سلسلے میں مصنف نے اپنی تحریروں سے کسی مذہب یا کسی کتاب کی بے حرمتی نہیں کی ہے۔مصنف نے منتخب واقعات کو ٹھوس حقائق کی روشنی میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہیرو کی شخصیت واضح ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی بھی ایک اہم مصنف ہیں۔ان کا نظریہ سوانح نگاری بھی مقصدی اور افادی ہے۔سیرت عمر بن عبدالعزیز اور اقبال کامل ان کی یہ دونوں تصانیف سوانحی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔''سیرت عمر بن عبدالعزیز'' ۱۹۲۲ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب سے پہلے اردو میں عمر بن عبدالعزیز کی کوئی مستند سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی۔عبدالسلام ندوی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اصل خط و خال نمایاں کرنے میں کامیاب ہیں۔انھوں نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جس میں ابتدائی حالات، ازواج، ولادت، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور سیاست اور حکومت کا بیان ہے۔اور آخر باب میں ماثر بنوامیہ کا ذکر ہے۔واقعات کے انتخاب کے سلسلے میں مصنف نے تحقیقی و تنقیدی ذرائع سے کام لیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی دوسری سوانحی تصنیف اقبال کامل ہے چنانچہ اس میں اقبال کے سوانح، ان کی مذہبیت، اخلاق و سیرت اور تصانیف پر تبصرہ ہے۔اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف ان کے پیش نظر تھی مگر ان کے لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگزشت اور اس کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے۔اسی طریقے سے فارسی شاعری پر ریویو ہے۔اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے گئے ہیں اور اس کی شہرت و مقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس اس کے تراجم کا ذکر ہے۔اس سلسلے میں ان کی ادبی لسانی فروگذاشتیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ان کے فلسفہ خودی پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے اجزا و عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پھر نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات پیش کئے گئے ہیں اور نعتیہ کلام کے

تبصرے پر کتاب ختم ہوتی ہیں۔

عہد سرسید کے سوانح نگاروں میں مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ایک اہم سوانح نگار ہیں وہ اپنے زمانے کے ممتاز اور مایہ ناز عالم دین تھے، ان کے مزاج و مذاق میں مذہب کی اہمیت و وقعت راسخ تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جن شخصیات کے سوانحی حالات کو سپرد قرطاس کیا وہ شخصیات بھی مذہبی تھیں جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر النبی الخاتم، امام ابوحنیفہؒ کی سیرت کے حوالے سے حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی پر تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ۔ مولانا قاسم نانوتوی کی سیرت، سوانح قاسمی۔ حضرت ابوذر غفاری پر سوانح ابوذر غفاری اور حضرت اویس قرنی پر، سوانح حضرت اویس قرنی وغیرہ ایسی تصانیف ہیں جو ساری کی ساری مذہبی شخصیات پر لکھی گئی ہیں، مولانا کی تمام سوانحی تصانیف کا مختصر خلاصہ پیش ہے۔

النبی الخاتم مولانا مناظر احسن گیلانی کا شاہ کار ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا متاع عزیز ہے۔ یہ کتاب ۱۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں مولانا محمد منظور احمد نعمانیؒ مدیر الفرقان لکھنو کا تحریر کردہ تعارف ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے ایسے انداز میں بحث کی ہے کہ گویا تمام ادیان کا منسوخ ہونا اور دین اسلام کا زندہ جاوید ہونا ان ہی لوگوں کے اقوال سے ثابت کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال نسب اور ابتدائی ایام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ مکی زندگی، دوسرا حصہ مدنی زندگی۔ اس کتاب میں سید مناظر احسن گیلانی کا انداز بیان منبر پر بیٹھے ہوئے ایک جوشیلے خطیب کا سا ہے۔ اس کتاب کی اصل خوبی ایجاز و اختصار ہے۔ اس کتاب کی عبارت سادہ، متین اور رواں ہے، کتاب کے آخر میں یعنی صفحہ ۱۳۴ پر، فارسی اور عربی دونوں زبان میں ۹ بند پر مشتمل ایک نعت ہے، صفحہ ۱۳۸ پر فارسی زبان میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک نعتیہ غزل ہے، پھر صفحہ ۱۳۹ پر فکر اور پریشانی کے وقت کی دعاء درج ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ: یہ کتاب دسمبر ۱۹۴۶ء میں رزاقی مشین پریس حیدرآباد سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں کل ۳۲۰ صفحات ہیں اس کتاب میں ضمنی عنوانات کی تعداد ۱۱۱ ہے۔ کتاب کے چند ابتدائی اوراق میں اس زمانے کے ہندوستانی معاشرہ کی حالت بیان کی گئی ہے۔ خاص طور سے مختلف مغل سلاطین کے طرز حکومت اور ان کی مذہبی رواداری اور مذہب سے تعلق ولاتعلقی دونوں ہی پہلو پر بحث کی گئی ہے

بلکہ حضرت شاہ صاحب کی ولادت اور ابتدائی زندگی کا حال کتاب کے وسطی حصہ میں بیان کیا گیا ہے خاندان ولی اللہی کی خدمات بھی ضمنی طور پر اس میں درج کئے گئے اس کتاب کی تیاری میں مصنف نے مستند مآخذوں سے استفادہ کیا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی:۔اس کتاب میں ان کی زندگی کے صرف ایک پہلو یعنی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے بعض مقامات پر مولانا نے بہت ہی اندوہ ناک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہاں بھی جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر بہت ہی سیدھے سادے انداز میں واقعہ کو پیش کیا ہے جس سے ان کی فنکارانہ عظمت واضح ہوتی ہے یہ کتاب امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی کا پورے طور پر احاطہ کرتی ہے اور بعض مسائل ضمنی طور پر جا بجا پیش کر دئے گئے ہیں۔ مآخذ سے متعلق مولانا نے حسب روایت مستند کتابوں اور مستند راویوں کے اقوال پر اکتفا کیا ہے۔

سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی کو دارالعلوم دیوبند سے قلبی لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی کی سوانحی حالات کو سپرد قلم کیا اور سوانح قاسمی لکھی اس کتاب کو مولانا نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ حصہ اول ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ حصہ دوم ۵۱۲ اور حصہ سوم ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کتاب میں کل ۱۳۱۶ صفحات ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ کے خاندانی حالات، ابتدائی ایام کے واقعات اور حصول علوم وفنون مختلفہ کے علاوہ کچھ علمی و قومی کارنامے قلم بند کئے گئے ہیں دوسری جلد سے مولانا ممدوح کی زندگی کے اہم ترین کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اس عہد کے ملکی، سماجی اور سیاسی ماحول کی بھی خوب خوب عکاسی ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں مولانا کی زندگی کے ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے جو ہر اعتبار سے تجربات ومشاہدات کی بھٹی میں تپ کر بالکل کھری زندگی بن چکی تھی۔ اس حصہ میں ۶۰ ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں یہ حصہ مولانا موصوف کی زندگی کے آخری ایام پر پورے طور پر محیط ہے۔

سوانح ابوذر غفاری: یہ کتاب حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی کامیاب ترین سوانح تصنیف ہے مصنف نے اس کتاب میں ۶۵ ضمنی عنوانات قائم کئے ہیں س کتاب میں مولانا موصوف نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی کے اولین مراحل سے لے کر دم آخر تک کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ خلوت وجلوت

اور خانگی زندگی سے بھی پردہ ہٹانے کی بڑی حسین کوشش کی ہے۔ واقعات کے بیان کرنے میں استیعاب، طبقات ابن سعد، صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث کی روایتوں سے مدد لیا ہے۔ حضرت مولانا نے بھی حیات ابو ذر غفاری کے ذریعہ ملت کے اندر اخلاقی عالیہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اس کتاب کی عبارت اور طرز تحریر دونوں ہی مصنف کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ آسان مگر دلکش ہے۔ اس کی عبارت اور زبان عین سوانح نگاری کے مطابق ہے۔

سوانح اویس قرنی: اس کتاب میں کل ۶۴ صفحات ہیں چونکہ بعض اصحاب نے حضرت اویس قرنی کے وجود کا سرے سے انکار ہی کیا تھا انہوں نے سوانح حضرت اویس قرنیؓ کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ اور اصول حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے مفکرین کی روایتوں کو بہت حسین انداز میں مستند قرار دیا ہے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ آغاز حالات سے شروع ہوتا ہے۔ خاندان اور نسب پر بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے آپ کے قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا ہے، آپ کے قبول اسلام، کے اسباب کی نشاندہی کی ہے اس عہد کے لوگوں کے مزاج وفطرت اور دینداری کے ماحول کا بھی مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ساتھ دربار رسالت میں حاضری سے محروم رہنے کی وجہ بھی حدیث کی روشنی میں پیش کی ہے اس کے علاوہ مستند مآخذ سے حوالہ جات پیش کئے گئے ہیں اس وجہ سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو زبان میں حضرت اویس قرنی سے متعلق کوئی دوسری کتاب دیکھنے کو نہیں ملتی اس لئے اس کتاب کی اہمیت سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

کتابیات

| مصنف | کتاب | ناشر | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|
| ۱۔آزاد،محمد حسین | آب حیات | عثمانیہ بک ڈپو،کلکتہ | ۱۹۶۷ء |
| ۲۔آفاقی،آفتاب احمد | کلاسیکی نثر کے اسالیب | جعفرآباد،دہلی | ۲۰۰۲ء |
| ۳۔اثری،ابوعلی | علامہ سید سلیمان ندوی | ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ پاکستان | درج نہیں |
| ۴۔احمد،مختارالدین | احوالِ غالب | مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،نئی دہلی | ۱۹۵۳ء |
| ۵۔احمد،مفتون | مولانا شبلی ایک مطالعہ | مکتبہ اسلوب،کراچی | ۱۹۸۶ء |
| ۶۔احمد،نذیر ڈپٹی | امہات الامتہ | ادریس المطابع،دہلی | ۱۹۳۵ء |
| ۷۔اسماعیل،شیخ محمد | تذکرہ حالی | حالی بک ڈپو،پانی پت | ۱۹۳۵ء |
| ۸۔اعظمی،خلیل الرحمٰن | اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک | ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ | ۲۰۰۷ء |
| ۹۔اعظمی،خلیل الرحمٰن | مضامین نو (شبلی کا تنقیدی مسلک) | ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ | ۱۹۷۷ء |
| ۱۰۔اعظمی،عبداللطیف | شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں | نسیم بک ڈپو لکھنؤ | ۱۹۸۵ء |
| ۱۱۔افادی،مہدی | افادات مہدی | شیخ مبارک علی،لاہور | ۱۹۴۹ء |
| ۱۲۔اکرام،شیخ محمد | غالب نامہ | دانش گاہ،یوپی | ۱۹۳۹ء |
| ۱۳۔اکرام،شیخ محمد | شبلی نامہ | تاج آفس بمبئی | درج نہیں |
| ۱۴۔انور،صبیحہ | اردو میں خودنوشت سوانح حیات | نامی پریس لکھنؤ | ۱۹۸۲ء |
| ۱۵۔انجم،خلیق | مولوی عبدالحق (ادبی ولسانی خدمات) | انجمن ترقی اردو،نئی دلی | ۱۹۹۲ء |
| ۱۶۔بیدار،مجید | دکنی تذکرے | مکتبہ شاداب،حیدرآباد | ۱۹۸۵ء |
| ۱۷۔بی،صفیہ | علامہ شبلی نعمانی بحیثیت سوانح نگار | جی۔ایم۔پراسس۔چینائی | درج نہیں |
| ۱۸۔جاوید،سلیمان اطہر | غالب کے چند نقاد | غالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی | ۱۹۹۵ء |
| ۱۹۔جعفری،رئیس احمد | حیات محمد علی جناح | تاج آفس،بمبئی | ۱۹۴۶ء |
| ۲۰۔جعفری،رئیس احمد | رند پارسا | انجمن ترقی ہند،دہلی | ۱۹۴۵ء |
| ۲۱۔جہاں،سلطان | اردو سوانح نگاری (ایک جائزہ | الحمرا پبلشرز | ۱۹۷۴ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۲۲۔ جہاں، عصمت | حالی اور ان کی ادبی خدمات | پٹنہ | ۱۹۸۷ء |
| ۲۳۔ جہاں، مسرت | الطاف حسین حالی حمایت سے انحراف تک | ایجوکیشنل بک ہاوس، دہلی | ۲۰۰۴ء |
| ۲۴۔ جہاں، نیر | مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ | لکشمی نگر، دہلی | ۲۰۰۶ء |
| ۲۵۔ جیراج پوری، محمد اسلم | حیات حافظ | مطبع فیض عام، علی گڑھ | ۱۳۳۷ھ |
| ۲۶۔ حالی، الطاف حسین | حیات سعدی | اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ | ۱۹۸۲ء |
| ۲۷۔ حالی، الطاف حسین | یادگارِ غالب | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی | ۱۹۷۷ء |
| ۲۸۔ حالی، الطاف حسین | حیات جاوید | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی | ۱۹۹۰ء |
| ۲۹۔ حالی، الطاف حسین | مقدمہ شعر و شاعری | لبرٹی آرٹ پریس، دہلی | ۱۹۶۹ء |
| ۳۰۔ حسین، مشتاق | باقیات شبلی | آزاد کتاب گھر، دہلی | ۱۹۶۴ء |
| ۳۱۔ حسین، احتشام | تنقیدی جائزے | احباب پبلشرز، لکھنو | ۱۹۷۸ء |
| ۳۲۔ حسین، احتشام | عکس اور آئینے | فروغ اردو لکھنؤ | ۱۹۶۲ء |
| ۳۳۔ حسین، صالحہ عابد | یادگار حالی | کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلی | ۱۹۷۵ء |
| ۳۴۔ خان، سر سید احمد | سیرت فریدیہ | مطبع مفید عام آگرہ | ۱۸۹۲ء |
| ۳۵۔ خان، سر سید احمد | خطبات احمدیہ | نولکشور اسٹیم پریس، لاہور | ۱۸۷۰ء |
| ۳۶۔ دلوی، عبدالستار | مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار | انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئ | درج نہیں |
| ۳۷۔ دہلوی، مرزا حیرت | حیات طیبہ | سراج پریس، دہلی | ۱۹۳۲ء |
| ۳۸۔ دہلوی، مرزا حیرت | سیرت محمدیہ | مطبع جیون پرکاش، دہلی | ۱۸۹۳ء |
| ۳۹۔ دہلوی، مرزا حیرت | حیات فردوسی | مطبع خادم التعلیم پنجاب، لاہور | ۱۸۹۶ء |
| ۴۰۔ رام، مالک | ذکر غالب | جمال پریس دہلی، پانچواں ایڈیشن | ۱۹۷۶ء |
| ۴۱۔ رضا، محمد عمر | اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت | آفسیٹ پرنٹرس، دہلی | ۲۰۱۱ء |
| ۴۲۔ رفیع، اشرف | نظم طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی مطالعہ | زانیڈ بک سیلر، حیدرآباد | ۱۹۷۳ء |
| ۴۳۔ زیدی، مہ جبین | سید سلیمان ندوی حیات و تصانیف | کراچی | ۱۹۸۴ء |

| مصنف | کتاب | ناشر | سنہ |
|---|---|---|---|
| ۴۴۔سبزواری،شوکت | فلسفہ کلام غالب | قومی کتب خانہ، بریلی | درج نہیں |
| ۴۵۔سرور،آل احمد | تنقیدی اشارے | سرفراز قومی پریس لکھنؤ | ۱۹۶۴ء |
| ۴۶۔سرور،آل احمد | تنقید کیا ہے | مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،نئی دہلی | ۱۹۸۰ء |
| ۴۷۔سرور،آل احمد | کچھ خطبے کچھ مقالے | ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ | ۱۹۹۴ء |
| ۴۸۔سرور،آل احمد | مسّرت سے بصیرت تک | مکتبہ جامعہ لمٹیڈ،نئی دہلی | ۱۹۷۴ء |
| ۴۹۔سعید،صابرہ | اردوادب میں خاکہ نگاری | ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ | ۲۰۱۳ء |
| ۵۰۔سلیم،وحیدالدین | افادات سلیم | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی | ۱۹۷۲ء |
| ۵۱۔سندیلوی،سلام | تجربہ وتجزیہ | عزیزاحمد نظامی،لکھنؤ | ۱۹۷۶ء |
| ۵۲۔سندیلوی،شجاعت علی | مطالعہ شبلی | ادارہ فروغ اردولکھنؤ | درج نہیں |
| ۵۳۔شاہد،ایوب محمد | شارحین غالب کا تنقیدی | اردواکادمی،لاہور | ۱۹۸۸ء |
| ۵۴۔شاہجہاں پوری | مولاناسید مناظراحسن گیلانی | | |
| ابوسلمان | شخصیت اور سوانح | خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ | ۲۰۰۲ء |
| ۵۵۔شاہین،امیراللہ | فن سوانح نگاری اوردیگر مضامین | طاہر بک ایجنسی،دہلی | ۱۹۷۳ء |
| ۵۶۔شاہین۔امیراللہ | اردو کے اسالیب بیان | جمال پرنٹنگ پریس،دہلی | ۱۹۷۷ء |
| ۵۷۔صدیقی،ظفراحمد | شبلی معاصرین کی نظرمیں | اترپردیش اردواکادمی | ۲۰۰۵ء |
| ۵۸۔صدیقی،ظفراحمد | شبلی کی علمی وادبی خدمات | علی گڑھ | ۲۰۱۲ء |
| ۵۹۔صدیقی،عتیق احمد | مقالات سید سلیمان ندوی | علی گڑھ | ۱۹۸۶ء |
| ۶۰۔صدیقی،محمدیٰسین مظہر | الفاروق ایک مطالعہ | مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ | ۲۰۰۲ء |
| عالم،سیدافتخار | حیات النذیر | شمس پریس دہلی | ۱۹۱۲ء |
| ۶۱۔عبدالرحمٰن،سید | مولاناسیدسلیمان ندوی | | |
| صباح الدین | کی تصانیف ایک مطالعہ | دارالمصنفین،اعظم گڑھ | ۱۹۸۸ء |
| ۶۲۔عبدالرحمٰن،سید | مولاناشبلی پرایک نظر | دارالمصنفین،اعظم گڑھ | ۱۹۸۵ء |
| صباح الدین | | | |
| ۶۳۔عبدالقیوم | حالی کی اردونثرنگاری | ریڈنگ پرنٹنگ پریس،لاہور | ۱۹۶۴ء |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۶۴۔عبدالحق، مولوی | چند ہم عصر | انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی | ۲۰۰۴ء |
| ۶۵۔عبدالواسع | فن سوانح نگاری | فرحت پبلی کیشن، پٹنہ | دسمبر ۱۹۷۹ء |
| ۶۶۔عظیم، اختر وقار | شبلی بحیثیت مورخ | مطبع عالیہ لاہور | دسمبر ۱۹۶۸ء |
| ۶۷۔عبداللہ، سید | میر امن سے عبدالحق تک | چمن بک ڈپو، دہلی | ۱۹۶۵ء |
| ۶۸۔عبداللہ، سید | سرسید احمد خان اوران کے نامور رفقاء | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۱۹۹۴ء |
| ۶۹۔عبداللہ، سید | شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن | مکتبہ جدید، لاہور | ستمبر ۱۹۵۲ء |
| ۷۰۔عبدالہادی، قاضی | فن سوانح نگاری | مژگاں پبلی کیشنز، کلکتہ | درج نہیں |
| ۷۱۔علی، بی شیخ | افکار شبلی | سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ، بنگلور | ۲۰۱۳ء |
| ۷۲۔علی، بی شیخ | اعجاز حالی | سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ بنگلور | ۲۰۱۴ء |
| ۷۳۔علی، بی شیخ | انوار اقبال | سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ بنگلور | ۲۰۱۱ء |
| ۷۴۔علی، شاہ سید | اردو میں سوانح نگاری | انجمن پریس، لارنس روڈ کراچی | ۱۹۶۱ء |
| ۷۵۔فاروقی، شمیم | حالی فن اور شخصیت | ہریانہ ساہتیہ اکادمی | ۱۹۸۶ء |
| ۷۶۔فاروقی، شمس الرحمٰن | تفہیم غالب | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۲۰۱۰ء |
| ۷۷۔فاخرہ، ممتاز | اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء | رونق پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۱۹۸۴ء |
| ۷۸۔فتح پوری، فرمان | اردو نثر کا فنی ارتقاء | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۱۹۹۷ء |
| ۷۹۔فتح پوری، فرمان | اردو شاعری کا فنی ارتقاء | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۲۰۰۴ء |
| ۸۰۔فیصل، ملک راشد | حالی کی سوانح نگاری (حیات جاوید کی روشنی میں) | ایجوکیشنل بک ہاوس، نئی دہلی | ۲۰۰۷ء |
| ۸۱۔کانپوری، عبدالرزاق | البرامکہ | بار ششم، نفیس اکیڈمی کراچی | ۱۹۶۱ء |
| ۸۲۔گل، حسن وقار | اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد | شعبۂ اردو جامعہ، کراچی | ۱۹۹۷ء |
| ۸۳۔گیلانی، مناظر احسن | النبی الخاتم | عظیم بک ڈپو، دیوبند | ۱۹۳۶ء |
| ۸۴۔گیلانی، مناظر احسن | سوانح ابوذر غفاری | رزاقی مشین پریس حیدرآباد | ۱۹۴۵ء |
| ۸۵۔گیلانی، مناظر احسن | سوانح قاسمی جلد اول | دلی پرنٹنگ پریس کراچی | ۱۳۴۵ھ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۸۶۔لدھیانوی،محمد یوسف | سیرۃ عمر بن عبدالعزیز | مکتبہ لدھیانوی | ۱۹۹۶ء |
| ۸۷۔منصور پوری، قاضی محمد سلیمان | رحمتہ للعالمین | اعتقاد پبلشنگ ہاوس، دہلی | ۱۹۸۰ء |
| ۸۸۔مہر،غلام رسول | غالب | مسلم پرنٹنگ ورکس، لاہور | ۱۹۳۶ء |
| ۸۹۔ندوی، اکرام اللہ | وقار حیات | مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ | ۱۹۲۵ء |
| ۹۰۔ندوی، سلیمان سید | سیرت عائشہ | دارالمصنفین، اعظم گڑھ | ۱۹۷۶ء |
| ۹۱۔ندوی، سلیمان سید | رحمت عالم | رفیق مشین پریس، حیدر آباد | ۱۹۴۳ء |
| ۹۲۔ندوی، سلیمان سید | حیات مالک | مطبع معارف اعظم گڑھ | ۱۳۴۰ء |
| ۹۳۔ندوی، سلیمان سید | خیام | مطبع معارف اعظم گڑھ | ۱۹۲۳ء |
| ۹۴۔ندوی، سلیمان سید | حیات شبلی | معارف پریس اعظم گڑھ | ۱۹۴۳ء |
| ۹۵۔ندوی، سلیمان سید | سیرت النبی جلد پنجم | مطبع معارف، اعظم گڑھ | ۱۹۶۴ء |
| ۹۶۔ندوی، سلیمان سید | سیرت النبی جلد ششم | مطبع معارف، اعظم گڑھ | ۱۹۶۹ء |
| ۹۷۔ندوی، سلیمان سید | سیرت النبی جلد ہفتم | ادارہ اسلامیات، پاکستان | ۲۰۰۲ء |
| ۹۸۔ندوی، سلیمان سید | مکاتیب شبلی (مرتبہ) | مطبع معارف اعظم گڑھ طبع دوم | ۱۹۲۸ء |
| ۹۹۔ندوی، سلیمان سید | نقوشِ سلیمانی | مطبع معارف اعظم گڑھ | ۱۹۳۹ء |
| ۱۰۰۔ندوی، عبدالسلام | اقبال کامل | مطبع معارف، اعظم گڑھ | ۱۹۶۴ء |
| ۱۰۱۔ندوی، عبدالسلام | سیرت عمر بن عبدالعزیز | مطبع معارف، اعظم گڑھ | ۱۹۱۹ء |
| ۱۰۲۔نظامی، خلیق احمد | سرسید اور علی گڑھ | ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ | ۱۹۸۲ء |
| ۱۰۳۔نعمانی، شبلی | المامون | مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ | ۱۹۵۷ء |
| ۱۰۴۔نعمانی، شبلی | سیرۃ النعمان | مکتبہ برہان اردو بازار دہلی | ۱۹۶۳ء |
| ۱۰۵۔نعمانی، شبلی | الفاروق | معارف پریس اعظم گڑھ | ۱۹۵۶ء |
| ۱۰۶۔نعمانی، شبلی | الغزالی | معارف پریس اعظم گڑھ | ۱۹۵۶ء |
| ۱۰۷۔نعمانی، شبلی | سوانح مولانا روم | نامی پریس کانپور | ۱۹۰۶ء |
| ۱۰۸۔نعمانی، شبلی | سیرت النبی (حصہ اول) | دارالمصنفین اعظم گڑھ | ۱۹۷۴ء |
| ۱۰۹۔نعمانی، شبلی | سیرت النبی (حصہ دوم) | دارالمصنفین اعظم گڑھ | ۱۹۷۵ء |

| ۱۱۰۔ ہاشم، سید محمد | سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی خدمات | مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ | ۱۹۹۵ء |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱۱۱۔ ہاشمی، قاضی عبیدالرّحمٰن | تنقید و تفہیم | ایس ایچ آفیسٹ پرنٹس، دہلی | ۲۰۱۲ء |

# رسائل

۱۔ آج کل ( نئی دہلی ) ۱۹۵۵ء

۲۔ آج کل ( نئی دہلی ) جموں و کشمیر نمبر ۱۹۸۳ء

۳۔ اردو ادب (سہہ ماہی ) نئی دہلی جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۹ء

۴۔ بازیافت ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۲ء ، ۲۰۰۶ ، ۲۰۱۰ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف کشمیر

۵۔ بیسویں صدی ( نئی دہلی ) جولائی ۱۹۶۵ء، فروری ۲۰۰۰ء

۶۔ تحریک ادب ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۶ء شمارہ نمبر ۶۲

۷۔ تحریرِ نو، ماہنامہ، اکتوبر ۲۰۱۴ء

۸۔ تسلسل ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۶ء شعبۂ اردو یونیورسٹی آف جموں

۹۔ خبر نامہ ( ماہنامہ ) اتر پردیس اردو اکادمی، لکھنؤ جنوری ۲۰۱۳ء

۱۰۔ دبستان علم و ادب، نمبر ۳، اکتوبر ۲۰۱۴ء

۱۱۔ زرین شعائیں، بنگلور، شمارہ ستمبر ۲۰۱۰ء

۱۲۔ سبق اردو، نومبر ۲۰۱۷، جلد ۱۵، شمارہ ۴۳

۱۳۔ شاعر، ممبئی، شمارہ مئی ۲۰۰۹ء

۱۴۔ شب خون، الہ آباد، جون ۲۰۰۶ء

۱۵۔ شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو نثر، شمارہ ۴، ۱۱ جلد ۵۱

۱۶۔ شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، شمارہ ۶۔۸، جلد ۳۷

۱۷۔علی گڑھ میگزین (سالنامہ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۶۔۲۰۰۵

۱۸۔فروغ اردو (اول) حالی نمبر، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۹ء

۱۹۔فروغ اردو (دوم) حالی نمبر، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۹ء

۲۰۔فکر و تحقیق (سہہ ماہی) نئی دہلی، اپریل، مئی، جون، ۲۰۰۴ء

۲۱۔کاروان ادب اسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۶ء

۲۲۔کاروان ادب اسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ جنوری، مارچ ۱۹۹۷ء

۲۳۔کتاب نما (دہلی)، اگست ۱۹۹۸ء، ستمبر تا دسمبر، ۲۰۰۲ء

۲۴۔نگینہ، اکتوبر نومبر ۲۰۴۱ء

۲۵۔ہمارا ادب ۱۹۶۵ء۱۹۸۷ء